۱۴ گرما/خزاں ۱۹۹۳

آج

ترتیب: اجمل کمال

وسیلی شُوکشِن   محمد خالد اختر   افضال احمد سید

افتخار جالب   محمد انور خالد   نیر مسعود

اسد محمد خاں   مصطفیٰ ارباب

سیمون دُ بووار   ابار ربی

انتخاب

ریشارد کاپوشنسکی کی کتاب "شہنشاہ" کا مکمل ترجمہ

آج کی کتابیں

آج
جولائی - دسمبر ۱۹۹۳

مینیجنگ ایڈیٹر
زینت حسام

اہتمام
آج کی کتابیں
بی ۱۴۰ سیکٹر ۱۱ بی نارتھ کراچی ٹاؤن شپ کراچی ۷۵۸۵۰

کتابت بذریعہ کمپیوٹر
نستعلیقِ نظامی، خطِ نفیس
پبلشرز یونائیٹڈ
۸۷ دارالامان کوآپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی کراچی

طباعت
ایجوکیشنل پریس
پاکستان چوک کراچی

ترتیب

وِسیلی شُوکشِن

۷

گاؤں والے

۱۹

سوچ بچار

محمّد خالد اختر

۲۶

جوڈی اور میں

افضال احمد سیّد

۴۰

کون کیا دیکھنا چاہتا ہے

افتخار جالب

۴۲

محبت کے شاداب پھول — لفظوں کے جہانوں میں
اب چوگرد فریم میں — محرابوں کے اندر
کون ہو، آؤ — لغو لفظیات — خالص معجزہ
دُھند دماغ — ثقافتی متن — باطن کی وحشت

محمد انور خالد

۵۱
یہ اچھے لوگ ہیں
ایک اتفاقی موت کی روداد   جو یوں ہوتا تو کیا ہوتا
بے ارادہ زیست کیجیے   ہجوم   سفر ایسا بھی ہوتا ہے
ابنِ زیاد کا فرمان   زباں پر ذائقہ دو پانیوں کا ہے   نیلی لڑکی
مسلسل چلتے رہنے کی خوشی   اگر تم دو قدم اوپر گئے
یہ گھر جل کر گرے گا
دریائے چارلس کے کنارے ایک نظم   خرابی ہے محبّت میں
ہندوستان میں تین نظمیں :
مرے پاؤں کے نیچے خاک نہیں
اس چھالیہ کے پیڑ کے نیچے   خانہ بدوشوں کا گیت

نیّر مسعود

۶۹
بُن بست

۷۵
تحویل

اسد محمّد خاں

۱۱۲
رُکے ہوئے ساون

مصطفیٰ ارباب

۱۲۰

حادثہ دوراندیشی سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی
رانگ نمبر اعزاز اضافہ کوشش وزٹنگ کارڈ
تمہارے جانے کے بعد تُو کون ہے؟ نظم
احتجاج نظم نظم مزدور
آرامشین کا کاریگر نظم باف ڈے

سیمون دُ بووار

۱۳۲

ایک محبت کی کہانی (۲)

اِبار ربّی

۱۹۶

آیئے کوی کی پتنی ارہر کی دال جیتنا
پہاڑ بارش میں بھیگ کر تم میری بیٹی
بھاگو دس جُوتے لدّر پدّر
یاترا آٹھ سال کا وہ
فوٹو سرکس لڑائی سے لوٹا سپاہی

انتخاب

ریشارد کاپُوشنسکی

۲۱۵

شہنشاہ

اس شمارے کا آغاز فیض صاحب کے کیے ہوے دو نثری ترجموں سے کیا جارہا ہے۔ یہ دونوں روس کے ایک نمایاں ادیب وسیلی شوکشن کی کہانیوں کے ترجمے ہیں اور شوکشن سے فیض صاحب کی گہری آشنائی کے غماز ہیں۔ "گاؤں والے" نامی کہانی کا ترجمہ شیما مجید صاحبہ کی عنایت سے دستیاب ہوا اور ان کی اطلاع کے مطابق اس سے پہلے کہیں شائع نہیں ہوا۔ دوسری کہانی "سوچ بچار" ۱۹۷۰ کی دہائی میں کراچی سے نکلنے والے ماہانہ رسالے "پاکستانی ادب" میں شائع ہو چکی ہے۔

وسیلی شوکشن (۱۹۲۹ - ۱۹۷۴) کی قصہ گوئی کی صلاحیت نے فلم سازی، اداکاری اور افسانہ نگاری کے میدانوں میں یکساں کامیابی اور مقبولیت کے ساتھ اظہار پایا۔ خود ان کے خیال میں وہ سب سے بڑھ کر ادیب تھے۔ اردو میں ان کی کہانیوں کا ایک انتخاب "میں جینا چاہتا ہوں" کے عنوان سے دارالاشاعت ترقی، تاشقند، نے ۱۹۷۷ میں شائع کیا تھا۔

وَسیلی شُوکشِن

ترجمہ: فیض احمد فیض

گاؤں والے

"تو ایسی بھی کیا بات ہے اماں، اپنی جوانی یاد کرو اور آ کر ہمیں مل جاؤ۔ آپ کو ماسکو کے نظارے دکھائیں گے۔ کرائے کی فکر نہ کرو، میں بھیج دوں گا۔ ہاں، ہوائی جہاز سے آؤ تو اچھا ہے، سستا رہے گا۔ یہ خط دیکھتے ہی مجھے دو حرف لکھ دو کہ کب آؤ گی، تاکہ میں لینے آ سکوں۔ اور یقین مانو گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔"

بڑی بی مالانیا نے پڑھا، اپنے مرجھائے ہوئے ہونٹ بھینچے اور گہری سوچ میں ڈوب گئیں۔ پھر اپنے چشمے کے اوپر سے شُورکا کو دیکھا۔ "اپنے پاویل نے آنے کو لکھا ہے۔" بڑی بی کی بیٹی کچھ اپنے گھر میں خوش نہیں تھی اور بڑی بی نے بیٹی سے منوا لیا تھا کہ کچھ عرصے کے لیے اپنا بیٹا شُورکا اس کے ہاں رہنے دے۔ بڑی بی نواسے کو چاہتی بہت تھیں لیکن اُسے رکھتیں ٹھینگے کے نیچے۔

شُورکا میز پر اپنا ہوم ورک کر رہا تھا۔ اس نے نانی کی بات سنی اور چپکے سے کندھے اُچکا دیے، جیسے کہہ رہا ہو کہ بلایا ہے تو جاؤ، مجھے کیا!

"تمہاری چھٹیاں کب شروع ہوتی ہیں؟" بڑی بی نے ذرا کڑک کر پوچھا۔ اب شُورکا کے کان کھڑے ہوئے۔

"کون سی چھٹیاں؟ سردیوں کی؟"

"اور کیا گرمیوں کا پوچھ رہی ہوں؟"

"پہلی جنوری کو۔ کیوں؟"

بڑی بی نے پھر اپنے ہونٹ بھینچے اور سوچنے لگیں۔
اب کچھ خوش آئند توقع سے شُورکا کا دل کھُد بُد ہونے لگا۔
"کیوں پوچھ رہی ہیں؟"
"بس ایسے ہی۔ تم کیے جاؤ اپنا کام۔"
بڑی بی نے خط کُرتے کی جیب میں رکھا، کوٹ پہنا، شال اوڑھی اور گھر سے نکل کھڑی ہوئیں۔ شُورکا بھاگ کر کھڑکی میں دیکھنے جا کھڑا ہوا کہ کہاں جاتی ہیں۔ دروازے کے باہر ایک ہمسائی مل گئیں اور بڑی بی نے بلند آواز میں اعلان کیا:
"پاویل نے ماسکو آنے کے لیے لکھا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا بی بی، کیا کروں کیا نہ کروں۔ سچ بہت اُلجھن ہو رہی ہے۔ لکھا ہے کہ کچھ دن کے لیے آ کے ہمیں دیکھ جاؤ۔ آپ کے بغیر بہت اُداس ہو رہے ہیں، بہت جی چاہ رہا ہے ملنے کو۔"
ہمسائی نے دبی آواز میں کچھ کہا جو سننے میں نہیں آیا، لیکن بڑی بی کی آواز شُورکا کو صاف سنائی دے رہی تھی۔
"ویسے ہو تو سکتا ہے۔ ایسی بھی کیا مشکل ہے! ابھی تک اپنے پوتوں کا منھ بھی تو نہیں دیکھا، صرف فوٹو ہی دیکھا ہے۔ لیکن اتنے دور کے سفر سے بہت گھبراہٹ ہو رہی ہے۔ بہت جی اُچٹ رہا ہے۔"
دو عورتیں جاتے جاتے سننے کو ٹھہر گئیں۔ پھر ایک اَور آئی، ایک اَور آئی اور بڑی بی مالانیا نے ہر نئی آنے والی کو نئے سرے سے سنانا شروع کیا۔
"پاویل کی بات ہو رہی تھی۔ اپنے پاس بلایا ہے ماسکو۔ کیا کرنا چاہیے، سمجھ میں نہیں آ رہا۔"

معلوم یہی ہوتا تھا کہ سب عورتیں جانے ہی کا مشورہ دے رہی ہیں۔
شُورکا نے دونوں ہاتھ جیبوں میں ٹھونسے اور کمرے میں چکر کاٹنے لگا۔ اپنی نانی اماں کی طرح وہ بھی کچھ سوچ میں اور کھویا کھویا سا نظر آ رہا تھا۔ یوں بھی دیکھنے میں وہ اپنی نانی سے بہت ملتا تھا: ویسا ہی دُبلا پتلا، بہت اُبھری ہوئی گال کی ہڈی اور چھوٹی چھوٹی تیز طرّار آنکھیں۔ لیکن اُن کا مزاج بالکل ایک دوسرے سے نہیں ملتا تھا: بڑی بی بہت تیز طرّار، چاق چوبند اور چرب زبان چیز تھیں جو ہر بات کی ٹوہ میں رہتی تھیں۔ پوچھ گچھ کا شوق تو شُورکا کو بھی تھا لیکن وہ شرمیلا اتنا تھا کہ بالکل بدّھو معلوم ہوتا تھا، کچھ دبّو سا لڑکا جس کا دل بہت جلد دُکھ جاتا

تھا۔

اُس شام دونوں ماسکو کے لیے تار لکھنے بیٹھے۔ نانی اماں لکھوانے لگیں اور شُور کا لکھنے لگا۔

''میرے پیارے بیٹے پاشا، جیتے رہو۔ اگر تم سچ مچ چاہتے ہو کہ میں ماسکو آؤں تو بھئی میں آ تو سکتی ہوں، لیکن دیکھو نہ اب میری عمر میں۔۔۔''

''ٹھہر جائیے نانی،'' شُور کا نے ٹوکا۔ ''تار ایسے تھوڑے ہی لکھتے ہیں۔''

''تو اَور کیسے لکھتے ہیں؟''

''میں آ رہی ہوں، یا میں نیا سال شروع ہونے پر آؤں گی، اماں۔ بس ختم۔''

نانی اماں بالکل خفا ہو گئیں۔

''ارے، چھ سال سے اسکول میں جھک مار رہے ہو اور تمھیں خاک بھی عقل نہیں آئی۔ آخر وہاں تمھیں سِکھاتے کیا ہیں؟''

اب شُور کا روٹھنے لگا۔

''اچھا تو لکھوائیے جیسے آپ کا جی چاہے۔ لیکن کچھ پتا بھی ہے کہ ایسے لکھا تو تار پر کتنے پیسے اُٹھیں گے؟ کم سے کم بیس روبل لگیں گے۔''

بڑی بی نے پھر اپنے ہونٹ بھینچے اور کچھ سوچنے لگیں۔

''اچھا تو پھر ایسے لکھو: میرے پیارے بیٹے، یہاں آس پاس کے لوگوں سے کچھ صلاح لی ہے۔۔۔''

''میں ایسی باتیں بالکل نہیں لکھ سکتا۔ آپ کے صلاح لینے نہ لینے سے کسی کو کیا مطلب؟ خواہ مخواہ تار گھر والے مذاق اڑائیں گے۔''

''بس جیسے میں کہتی ہوں ویسے لکھو،'' بڑی بی نے حکم دیا۔ ''تم کیا سمجھتے ہو، اپنے بیٹے کے لیے بیس روبل خرچ کرنا مجھے کھلتا ہے کیا؟''

شُور کا نے اپنا قلم اٹھایا اور کچھ تیوری چڑھا کر جھک کر لکھنے لگا۔

''میرے پیارے بیٹے پاویل، میں نے یہاں ہمسایوں سے بات کی ہے اور سب نے یہی کہا ہے کہ مجھے جانا ہی چاہیے۔ اس عمر میں مجھے کچھ ڈر لگتا ہے لیکن۔۔۔''

''تار گھر میں وہ یہ سب کاٹ دیں گے اور نئے سرے سے لکھیں گے۔''

"واہ، مجال ہے ان کی!"

"آپ کو پتا بھی نہیں چلے گا۔"

"تم لکھے جاؤ۔ مجھے کچھ ڈر تو لگتا ہے لیکن خیر، ایسی کوئی بات نہیں۔ ہم نئے سال کے بعد آئیں گے۔ شُور کا بھی میرے ساتھ آئے گا۔ اب وہ کافی بڑا ہو گیا اور بہت برخوردار بچہ ہے۔"

شُور کا نے آخری دو فقرے گول کر دیے۔

"اُس کا ساتھ ہو گا تو مجھے ایسا ڈر نہیں لگے گا۔ اچھا خدا حافظ بیٹے۔ میرا دل بھی تم لوگوں کے لیے بُری طرح اداس ہے۔"

شُور کا نے بُری طرح کے بجائے لکھا بہت اداس ہے۔

"کم سے کم تمہارے بچّوں کی صورت تو دیکھ سکوں گی۔ اماں۔"

"اچھا تو اب ذرا حساب جوڑیے،" شُور کا نے بہت چھک کر کہا، اور اپنے قلم سے تار کے لفظ گننے لگا۔ "ایک، دو، تین، چار، پانچ۔۔۔"

بڑی بی پیچھے کھڑی دیکھتی رہیں۔

"اٹھاون، اُنسٹھ، ساٹھ۔ ساٹھ کو تیس سے ضرب دی تو کتنے ہوے؟ ایک ہزار آٹھ سو۔ ایک ہزار آٹھ سو کو سو سے تقسیم کیا تو بنے اٹھارہ۔ ہو گئے نہ وہی بیس روبل جو کہہ رہا تھا!" شُور کا نے بہت فتح مندی سے اعلان کیا۔

بڑی بی نے تار کا کاغذ اٹھایا اور اپنی جیب میں رکھ لیا۔

"میں تار گھر خود لے کر جاؤں گی۔ آئے بڑے حسابی! تم تو اَور بھی زیادہ خرچوا دو گے۔"

"جائیے آپ خوشی سے۔ پیسے تو اِتنے ہی بنیں گے، دو چار کوپک کم زیادہ ہوں تو ہوں۔"

کوئی گیارہ بجے ان کا ہمسایہ یگور لیزونوف ملنے آیا۔ یہ گاؤں کے اسکول کا سپلائی مینیجر تھا۔ بڑی بی نے اس کے گھر پیغام بھجوا دیا تھا کہ کام سے لوٹ کر انھیں ملتا جائے۔ یگور نے اپنے زمانے میں جگہ جگہ کا سفر کیا تھا اور سننے میں آیا تھا کہ ہوائی جہاز کی سواری بھی کی تھی۔

یگور نے پہلے اپنا کوٹ اتارا، پھر ٹوپی اتاری، پھر کھُردرے ہاتھوں سے اپنے اُلجھے

ہوے چٹے کالے بال ٹھیک کیے اور بیٹھ گیا۔ اور ساتھ ہی بھُوسے اور چمڑے کی زین کی باس کمرے میں پھیل گئی۔

"اچھا تو آپ ہوائی جہاز پر جانا چاہتی ہیں؟"

بڑی بی جواب دینے سے پہلے اندر گئیں اور مِیڈ (mead) کی ایک بڑی سی بوتل لا کر میز پر رکھ دی۔

"ہاں بھئی، تو ہمیں سب بتاؤ کہ ہوائی جہاز کے سفر میں کیا ہوتا ہے۔"

یگور بھو کی نظروں سے تو نہیں، کچھ افسرانہ انداز سے بڑی بی کو گلاس بھرتے ہوے دیکھتا رہا۔

"خیر بتانے کی کوئی ایسی بات تو نہیں ہے۔ یہاں سے گئے شہر، وہاں سے بیسک تومسک جانے والی گاڑی پکڑی اور اتر گئے نوواسی برسک۔ پھر وہاں سے ہوائی جہاز والوں کے دفتر کا پتا کیا، یا چاہیں تو اسٹیشن سے سیدھے ہوائی اڈے پر بھی جا سکتے ہیں۔"

"ارے دَم لو بھائی، یہ چاہیں وہ چاہیں چھوڑو۔ سیدھی بات کرو کہ کرنا کیا چاہیے۔ اور ذرا سہجے بولو کہ سمجھ میں بھی آئے۔ ایک سانس میں سب الم غلم مت کہے جاؤ۔"

بڑی بی نے مِیڈ کا گلاس یگور کے سامنے رکھا اور ذرا گھور کر دیکھا۔

یگور گلاس تھام کر دونوں ہاتھوں سے سہلانے لگا۔

"اچھا تو سنیے۔ جب آپ نوواسی برسک اتریں تو سب سے پہلے یہ پوچھیے کہ ہوائی اڈے پر کیسے پہنچنا چاہیے۔ شُورکا، یہ ضرور یاد رکھنا۔"

"شُورکا، نوٹ کر لو،" بڑی بی نے کہا۔ شُورکا نے اپنی کاپی سے ایک ورق پھاڑا اور لکھنے لگا۔

"پھر جب تم تولماچووا کے ہوائی اڈے پر پہنچو تو کسی سے پوچھو کہ ماسکو کے ٹکٹ کہاں بکتے ہیں۔ وہاں سے اپنے ٹکٹ خریدو اور ٹی یُو ۱۰۴ پر سوار ہو جاؤ۔ پانچ گھنٹے میں تم ماسکو میں پہنچ جاؤ گے جو ہماری سرزمین کا صدر مقام ہے۔"

بڑی بی اپنی مُنّی سی، سوکھی ہوئی کلائی پر سر ٹکائے ہوے سنتی رہیں۔ جیسے جیسے یگور بولتا گیا ویسے ویسے بڑی بی کی پریشانی بڑھتی گئی۔

"اور پھر سویردلوفسک میں البتہ آپ کو رُکنا پڑے گا۔"

"وہ کیوں؟"

"بس رُکنا پڑے گا، آپ سے کوئی پوچھے گا تھوڑے ہی۔ ہوائی اڈا آئے گا تو آپ کو اتار دیں گے، قصہ ختم۔"

یگور نے دوبارہ اپنا گلاس بھرنے کا طے کیا اور کہا: "اچھا تو سفر بخیر!"

"ارے ٹھہرو تو! سویردلوفسک میں ہمیں اترنے کے لیے کسی سے کہنا پڑے گا کہ سب کو خود ہی اتار دیں گے؟"

یگور نے گلاس حلق میں اُنڈیلا، ہونٹ چٹخارے اور مونچھوں پہ تاؤ دیتے ہوئے کہا:

"سب کو اترنا پڑے گا مالانیا بی! یہ تمھاری مِیڈ تو واقعی بہت مزے کی ہے۔ کیسے بناتی ہو؟ ہماری بُڑھیا کو بھی سِکھادو۔"

بڑی بی نے گلاس میں اَور ڈالی۔

"جب تم لوگ مکھی چُوس بننا چھوڑ دو گے تو تمھارے ہاں بھی اچھی بننے لگے گی۔"

"کیا مطلب؟" یگور کی جیسے سمجھ میں نہیں آیا۔

"مطلب یہ کہ شکر زیادہ ڈالو۔ تم لوگ تو ہمیشہ ہر چیز میں پیسے بچانے کی فکر کرتے ہو۔ اپنی مِیڈ میں شکر کا شِیرا زیادہ ڈالو تو آپ ہی مزے کی بنے گی۔ لیکن تم تو اس میں تمباکو کی چَس دیتے ہو جو بہت ہی گھٹیا بات ہے۔"

"ٹھیک ہے،" یگور نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ پھر اپنا گلاس اٹھایا، دو چار گھونٹ پیے اور باری باری سے پہلے بڑی بی، پھر شُورکا کی طرف دیکھا۔ "ٹھیک ہے،" دوبارہ کہا۔ "باقی تو سب ٹھیک ہے، لیکن جب نوواسی برسک پہنچو تو ذرا ہوش سے کام لینا۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی چُوک ہو جائے۔"

"وہ کیوں؟"

"بس، آپ جانتی ہیں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔"

یگور نے تمباکو کی تھیلی نکالی، تمباکو بھر کر سگریٹ سلگائی اور مونچھوں سے سفید دھوئیں کا بڑا سا گالا ہوا میں چھوڑ دیا۔

"مطلب یہ ہے کہ جب تم تولماچووا پہنچو تو سب سے پہلے یہ دھیان رکھو کہ کہیں ٹکٹ گڑبڑ نہ ہو جائیں، ورنہ ہو سکتا ہے جہاز میں پتا چلے کہ آپ لوگ ماسکو کے بجائے ولادی وستوک اُڑے جا رہے ہیں۔"

بڑی بی سراسیمہ سی ہو کر اٹھیں اور تیسری بار یگور کا گلاس بھرا۔ اب کے یگور ایک

ہی بار پورا گلاس چڑھا گیا۔ پھر ہونٹ چٹخارے اور بات بڑھانی شروع کی۔

"وہ دیکھو نہ، کچھ لوگ کاؤنٹر پر جا کر ٹکٹ تو مانگ لیتے ہیں لیکن یہ نہیں بتاتے کہ کہاں کا ٹکٹ چاہیے۔ اور پھر ہوتا یہ ہے کہ انھیں جانا پورب کو ہے اور پچھم کو اُڑے جا رہے ہیں۔ اِسی لیے میں کہہ رہا ہوں کہ ذرا سوچ سنبھل کے۔"

بڑھی بی نے چوتھی بار گلاس بھرا۔ اب یگور بالکل مزے میں آچکے تھے اور انھیں اپنی باتوں میں لطف آنے لگا تھا۔

"ہوائی جہاز میں سفر کرنے کے لیے لوہے کا جگر چاہیے لوہے کا! جیسے ہی وہ آسمان سے باتیں کرنے لگا، انھوں نے سب سے پہلے تمھیں ایک میٹھی گولی تھما دی۔"

"میٹھی گولی؟"

"ہاں ہاں، اَور کیا! مطلب یہ ہے کہ اب جو ہوگا سو ہوگا، تم میٹھی گولی کھاؤ اور بھول جاؤ سب کچھ۔ اصل میں سب سے خطرناک وقت یہی ہوتا ہے۔ یا فرض کرو پھر وہ کہتے ہیں کہ کرسی سے اپنی پیٹی باندھ لو۔ کیوں باندھ لو بھئی، کوئی پوچھے تو کہیں گے قاعدہ ہے۔ خاک قاعدہ ہے! قاعدہ واعدہ کچھ نہیں، مطلب یہ ہے کہ نہ جانے کس وقت دھم سے نیچے آرہو۔ بات تو اصل میں یہ ہے، اور کہتے ہیں کہ قاعدہ ہے۔"

"ہائے اللہ توبہ! یوں ہے تو ایسی چیز میں جاؤں ہی کیوں!"

"وہ کہاوت نہیں ہے کہ اوکھلی میں سر دیا تو دھمکوں سے کیا ڈر!" یگور نے بوتل پر ذرا گہری نظر ڈالی۔ "وہ جو جیٹ جہاز ہوتا ہے نہ، وہ تو پھر بھی کچھ ٹھیک ہے، لیکن یہ جو پنکھوں سے چلتا ہے اس کا تو کچھ ٹھیک نہیں۔ کسی بھی وقت پنکھا خراب ہو گیا اور بس چھٹی۔ پھر انجن میں اکثر آگ بھی لگ جاتی ہے۔ ایک بار میں ولادی وستوک سے جہاز پر آرہا تھا۔۔۔" یگور کرسی پر زیادہ آرام سے جم کر بیٹھ گیا، ایک اَور سگریٹ سلگائی اور بوتل پر ایک بار پھر نظر ڈالی، لیکن اب کے بڑھی بی جوں کی توں بیٹھی رہیں۔ "ہاں تو جیسے ہم اُڑے جا رہے تھے، میں نے یوں ہی کھڑکی سے باہر جھانکا اور دیکھتا کیا ہوں کہ انجن میں آگ بھڑک رہی ہے۔"

"ہائے اللہ توبہ!" بڑھی بی بڑبڑا کر بولیں۔

"جی جناب! میں نے تو یہ دیکھتے ہی واویلا مچا دی۔ اتنے میں ایک پائلٹ بھاگا ہوا آیا۔ خیر کوئی زیادہ خرابی کی بات تو نہ ہوئی، لیکن اس نے آتے ہی کچھ پوچھا نہ سُنا، بس مجھے

پھٹکارنا شروع کر دیا: کیا شور مچا رکھا ہے؟ کیوں لوگوں میں خوف و ہراس پھیلا رہے ہو خواہ مخواہ؟ ہاں ہاں، آگ بھڑک رہی ہے تو پھر کیا؛ اس میں پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ تم نچلے بیٹھے رہو آرام سے۔ یہ تو ان لوگوں کے چلن ہیں، آئے بڑے ایرلائن چلانے والے!"

شُورکا کو بالکل ان باتوں کا یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ آگ کا سن کر پائلٹ اسپیڈ وغیرہ تیز کر کے بُجھانے کی فکر کرے گا یا جہاز نیچے اتار لے گا، لیکن اس نے تو اُلٹا یگور کو ڈانٹ دیا۔

"ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی،" اب یگور شُورکا سے مخاطب تھا۔ "آخر یہ لوگ مسافروں کو پیراشوٹ کیوں سپلائی نہیں کرتے؟"

شُورکا نے خاموشی سے کندھے اُچکا دیے۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ ہوائی جہاز میں مسافروں کو پیراشوٹ نہیں دیے جاتے۔ ویسے اگر یہ سچ تھا تو واقعی، تھی تو عجیب سی بات۔

یگور نے پھولوں کے گملے میں اپنی سگریٹ بُجھائی اور خود اُٹھ کر بوتل سے گلاس بھر لیا۔

"مالانیا بی، بھئی مِیڈ ہو تو ایسی ہو!"

"بس زیادہ نہ پیو، ورنہ چڑھ جائے گی۔"

"بہت مزے کی چیز ہے!" یگور نے سر ہلا کر گلاس منھ کو لگایا۔

"اور ہاں، یہ جیٹ جہاز جو ہیں نہ، یہ بھی کافی خطرناک چیز ہیں۔ ذرا کوئی خرابی ہو تو پل بھر میں دھڑام، آناً فاناً! اور پھر حرام ہے جو کسی چیز کا نام نشان بھی مل جائے۔ کپڑا لتّا دھیان میں نہ لاؤ تو مٹھی بھر راکھ سمجھ لو ہر نفر کو۔۔۔" یگور نے تیوری پر بل ڈال کر بوتل کی طرف ذرا نظر جما کر دیکھا لیکن بڑی بی اُسے اٹھا کر اندر چھوڑ آئیں۔ یگور کچھ دیر اَور بیٹھا اور پھر جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا، کھڑے کھڑے ذرا جُھومتا ہوا۔

"پھر بھی، اصل میں ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ بس اِتنا ہے کہ پائلٹ کے کیبن سے جتنا بھی دور بیٹھ سکو اچھا ہے۔ بالکل آخر میں، جہاز کی دُم کی طرف بیٹھو تو خیر ہی خیر ہے۔ اچھا بھئی، میں چلا۔۔۔"

یگور بھاری ڈگ بھرتا ہوا دروازے تک گیا، ہیٹ اور کوٹ اوڑھا اور مڑ کر جاتے جاتے کہا: "پاویل کو میرا سلام پہنچا دینا مالانیا بیگم۔ اور کیسی مِیڈ پلائی ہے بھئی واہ!"

بڑی بی کو بہت بُرا لگا کہ یگور اتنی جلد دُھت ہو گیا ہے۔ ابھی تو ٹھیک سے بات بھی

نہ ہو پائی تھی۔

"تمہارے ہوش حواس اب جلدی جواب دینے لگے ہیں یگور!"

"اصل میں آج کچھ تھکن بہت ہو گئی ہے،" یگور نے کوٹ کے کالر سے بھوسے کا ایک تنکا الگ کیا۔ "میں نے افسر لوگوں سے کہا بھی تھا کہ بھوسا گرمیوں کے دنوں میں اٹھا لینا چاہیے۔ لیکن نہیں، ایک نہیں مانے۔ اور اب طوفان کے بعد سب سڑکیں برف سے اَٹ گئی ہیں۔ آج دن بھر کی کھینچا تانی کے بعد ہم سب سے اگلے تودوں تک بھی پہنچ نہیں پائے۔ اور پھر یہ تمہاری مِیڈ بھی کچھ بَلا کی تھی۔" یگور نے کھیسیں نکال دیں۔ "اچھا بھئی، میں چلا۔ آپ لوگ جائیں بھئی ہوائی جہاز میں۔ کچھ ایسی فکر کی بات نہیں ہے۔ بس وہ ذرا پائلٹ کے کیبن سے دور رہنا۔ اللہ حافظ!"

"اللہ حافظ!" شُورکا نے جواب میں کہا۔

پہلے دروازہ بند ہونے کی، پھر ڈیوڑھی سے یگور کے دھیرے سے اترنے اور صحن میں سے گزرنے کی آواز آئی۔ باہر کا گیٹ چرچرایا، سڑک پر سے یگور نے بلند آواز میں سمندر کے اتھاہ پانیوں اور لہراتی موجوں کا کوئی گیت شروع کیا اور فوراً ہی بند بھی کر دیا۔

بڑی بی مالانیا پریشان نظروں سے اندھیرے میں ڈوبی ہوئی کھڑکی کو گھورتی رہیں۔ شُورکا نے یگور کی جو باتیں نوٹ کی تھیں پڑھ کر سنائیں۔

"شُورکا، مجھے تو ہوائی جہاز میں جانے سے ڈر لگ رہا ہے،" بڑی بی نے دبی آواز میں کہا۔

"اور لوگ بھی تو جاتے ہیں،" شُورکا بولا۔

"ریل گاڑی میں جائیں تو اچھا نہیں رہے گا؟"

"اور میری سب چھٹیاں جو سفر میں غارت ہو جائیں گی؟"

"بھئی میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا،" بڑی بی نے ٹھنڈی آہ بھری۔ "اچھا تو ایسا کرتے ہیں، پاویل کو خط لکھتے ہیں۔ وہ تار رہنے دو۔"

"تو پھر ہم جہاز میں نہیں جائیں گے؟"

"جہاز میں؟ اجی توبہ کرو! قہر خدا کا، مٹھی بھر راکھ کے علاوہ ہڈی پسلی کا نشان نہیں ملتا۔ نہ بابا نہ!"

شُورکا سوچ میں ڈوب گیا۔

"اچھا تو لکھو،" بڑی بی بولیں۔ "پیارے بیٹے پاویل، میں نے یہاں کچھ سمجھ بُوجھ والے لوگوں سے بات کی ہے۔۔۔"

شُورکا نے جھک کر لکھنا شروع کیا۔

"انھوں نے ہوائی سفر کا کچھ کچا چٹھا سنایا ہے اور شُورکا نے اور میں نے یہی طے کیا ہے کہ گرمیوں میں ٹرین سے آئیں گے۔ آ تو اب بھی سکتے تھے، لیکن شورکا کی چھٹی تھوڑے دن کی ہے اور۔۔۔"

شُورکا نے پل بھر تامّل کیا اور پھر لکھتا گیا: "دیکھیے انکل، اب میں اپنی طرف سے لکھ رہا ہوں۔ ہُوا یہ ہے کہ نانی اماں کو تمھارے سپلائی مینیجر یگور لیزونوف نے ڈرا دیا ہے۔ آپ اُسے جانتے ہوں گے۔ اس نے ہمیں کچھ اس طرح کی باتیں سنائیں کہ اُسے ایک دفعہ کھڑکی میں سے آگ کے شعلے دکھائی دیے اور جب اس نے پائلٹ کو بتایا تو پائلٹ نے اسے ڈانٹ دیا۔ میرا اپنا خیال یہ ہے کہ اگر انجن میں واقعی آگ لگ رہی تھی تو پائلٹ ضرور اسپیڈ بدل کر اسے بُجھا دیتا جیسا کہ ہمیشہ کرتے ہیں۔ میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ انکل یگور نے ایگزاسٹ میں سے آگ نکلتی دیکھی ہو گی اور فیل مچا دیا ہو گا۔ تو اچھے انکل، آپ مہربانی سے نانی اماں کو لکھیے کہ ہوائی سفر میں تو فکر کی کوئی بات نہیں، اور یہ مت بتائیے گا کہ میں نے آپ کو یہ لکھا ہے ورنہ وہ گرمیوں میں بھی نہیں آئیں گی۔ گرمیوں میں انھیں اپنی ترکاریوں کی فکر ہو گی، اور پھر مرغیاں بھی ہیں، بطخیں بھی ہیں، وہ انھیں چھوڑ کر کبھی نہیں جائیں گی۔ آپ جانتے ہیں ہم تو اب تک ویسے کے ویسے دیہاتی لوگ ہیں۔ لیکن میرا ماسکو دیکھنے کو بہت جی ترستا ہے۔ یوں تاریخ اور جغرافیے کی کتابوں میں پڑھا تو ہے لیکن دیکھنے کی اَور بات ہے۔ ہاں، اور انکل یگور نے یہ بھی کہا تھا کہ جہاز میں مسافروں کو پیراشوٹ نہیں دیے جاتے۔ بالکل دھاندلی کی بات ہے، لیکن نانی اماں نے سچ مان لیا۔ انکل پاویل، آپ کی بہت مہربانی ہو اگر نانی اماں کو اس بات پر ذرا شرمندہ کریں۔ وہ آپ کو بہت چاہتی ہیں۔ آپ انھیں کچھ اس طرح کا خط لکھیں: اماں جان، یہ کیا بات کر رہی ہیں آپ! آپ کا اپنا بیٹا مشہور جنگی پائلٹ ہے، سوویت یونین کے ہیرو کا خطاب اور کئی تمغے جیت چکا ہے، اور آپ ایک مسافر ہوائی جہاز پر آنے سے گھبرا رہی ہیں جس میں سفر کرنا ایسا ہی ہے جیسے آدمی گھر میں بیٹھا ہو۔ اور اب تو ہم ساؤنڈ بیریئر بھی توڑ چکے ہیں۔ اب کیا فکر ہے۔ بس ایسا کچھ لکھ دیجیے تو وہ اگلے ہی جہاز میں سوار ہو جائیں گی۔ اور ہونا بھی یوں ہی چاہیے۔ اور مجھے بھی تو آپ پر بڑا فخر ہے اور ماسکو دیکھنے

کو بہت دل چاہتا ہے۔ اچھا تو خدا حافظ اور زیادہ آداب۔ آپ کا شُور کا۔''

اس دوران میں بڑی بی لکھوائے جا رہی تھیں:

''شاید ہم ذرا اس کے بعد ہی آئیں۔ جب پت جھڑ شروع ہو گی، جب تک ہم مَشروم چُن لیں گے، ان کا اچار تمھارے لیے لیتی آؤں گی، اور بیروں کا مربّہ بھی۔ ماسکو میں تو بازاری چیزیں ملتی ہیں، وہ انھیں میری طرح تھوڑے ہی بنا سکتے ہیں۔ گھر بنی ہوئی چیز کی اَور بات ہے۔ اچھا میری جان، اِس وقت تو یہی صورت ہے۔ بیوی بچّوں کو میری طرف سے بہت بہت پیار۔ شُور کا بھی سلام کہہ رہا ہے۔ خدا حافظ۔ شور کا، لکھ لیا سب کچھ؟''

''جی، لکھ لیا۔''

بڑی بی نے کاغذ اٹھا کر تہہ کیا، لفافے میں بند کیا اور اپنے ہاتھ سے پتا لکھا: ''موضع ماسکو، لیننسکی پراسپیکٹ، مکان نمبر ۷۸، فلیٹ نمبر ۱۵۶، بیرو آف دی سوویت یونین پاویل اگناتیوچ کو ملے۔ راقمہ سائبیریا سے اس کی ماں۔''

وہ پتا ہمیشہ خود ہی لکھا کرتی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ ایسے خط زیادہ ٹھیک سے پہنچے گا۔

''چلو یہ تو بات ہو ہی گئی۔ تم دل مَیلا نہیں کرو شُور کا، ہم گرمیوں میں ضرور جائیں گے۔''

''میں تو دل مَیلا نہیں کرتا، لیکن آپ تھوڑا بہت سامان باندھنا شروع کر دیں تو اچھا ہے۔ نہ جانے کسی دن آپ ہوائی جہاز ہی کا فیصلہ کر لیں۔''

بڑی بی نے اپنے نواسے کی طرف دیکھا لیکن کچھ کہا نہیں۔

اُس رات شُور کا سنتا رہا کہ بڑی سی انگیٹھی کے سامنے نانی امّاں بستر پر بار بار کروٹ بدل رہی ہیں اور چپکے سے ٹھنڈی سانس لے کر منھ ہی منھ میں کچھ بڑبڑا رہی ہیں۔ شُور کا کو بھی نیند نہیں آ رہی تھی۔ وہ بھی سوچ رہا تھا۔ ایسے ایسے عجوبے دیکھنے کی جلدی امید بندھ رہی تھی کہ اس کے خواب و خیال میں بھی نہیں آئے تھے۔

''شُور کا،'' بڑی بی پکاریں۔

''جی۔''

''پاویل کو کریملن میں بھی تو جانے دیتے ہوں گے؟''

''جانے ہی دیتے ہوں گے۔ تو پھر؟''

"ارے ذرا خیال تو کرو۔ ایک بار ہم بھی اندر جا کر دیکھ آئیں۔"

"آج کل تو ہر کوئی جا سکتا ہے۔"

بڑی بی پل بھر کو چپ رہیں۔

"ہر کسی کو جانے دیتے ہیں؟"

"نکولائی وسیلی وچ نے یہی بتایا تھا۔"

کچھ دیر دونوں چپ رہے۔ پھر شُور کا نے جیسے کچھ بگڑ کر کہا:

"نانی اماں، آپ یوں تو بہت دلیر ہیں ہر بات میں، اور اب آپ کو اتنا ڈر لگ رہا ہے۔ آخر کس بات سے اتنا ڈر رہی ہیں آپ؟"

"ارے سو جا چپکے سے،" نانی اماں نے ڈانٹا۔ "بڑے آئے تیس مار خاں۔ سب سے پہلے تمھیں اپنی نیکر گیلی کرو گے۔"

"اچھا تو ہو جائے شرط کہ میں بالکل نہیں ڈروں گا۔"

"اب سو جاؤ بچے، ورنہ صبح اسکول کے لیے وقت پر نہیں اٹھو گے۔"

اور شُور کا چپکے سے سو گیا۔

وَسیلی شُوکشِن

ترجمہ: فیض احمد فیض

سوچ بچار

اور ہر رات یوں ہی ہوتا رہا۔

جوں ہی گاؤں میں ذرا چُپ چاپ ہوئی اور لوگوں کی آنکھ لگنے کو ہوئی، اُس نے شروع کر دیا۔ گاؤں کے ایک سرے سے شروع کیا کمینے نے اور دوسرے سرے تک بجاتا چلا گیا اپنا اکارڈین۔ اور یہ اکارڈین بھی کوئی اپنی ہی قسم کا تھا: یہ بجتا نہیں تھا بنکارتا تھا۔ لوگ نینکا کریچیتووا کو بار بار صلاح دیتے: "ارے بھئی کر بھی لو نہ شادی اس سے، ورنہ یہ تو جینا بالکل اجیرن کر دے گا۔"

اور نینکا چور سی مسکراہٹ کے ساتھ کہتی: "تم لوگ نہ سنو نہ۔ سو کیوں نہیں رہتے؟"

"سوئیں کیسے؟ کھڑکی کے نیچے تو اُس نے آسمان سر پر اٹھا رکھا ہے۔ احمق کا بچہ، کہیں دریا کنارے جا کے بجائے تو بات بھی ہے، لیکن وہ تو ہٹتا ہی نہیں یہاں سے۔"

کولکا ملاشکِن بھرے بھرے ہونٹوں والا دیوہیکل گھبرُو تھا۔ اس سے کوئی بات کرتا تو وہ اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں سکوڑ کر بہت بدلحاظی سے کہتا: "کیوں نہ بجاؤں؟ میرا حق ہے۔ کس قانون میں لکھا ہے نہ بجاؤں؟"

مقامی اجتماعی فارم کے چیئرمین ماتوئے ریزانتسیف کا مکان گلی کے اس نکڑ پر تھا جہاں سے نکل کر کولکا گاؤں کے بازار میں داخل ہوا کرتا تھا، اس لیے اکارڈین کا شور پہلے تو گلی کے آخر تک سنائی دیتا پھر نکڑ سے گزر کر دیر تک گونجتا رہتا۔

جیسے ہی باجے کا پہلا سُر گلی میں سنائی دیتا، ماتوئے بستر سے اٹھ کر بیٹھ جاتا اور

ٹھنڈے فرش پر پاؤں لٹکا کر کہتا: "بس بہت ہو گئی! کل اُسے فارم سے نکال کر دم لوں گا۔ کوئی نہ کوئی بات سر تھوپ کر نکال باہر کروں گا۔"

وہ ہر رات یہی کہتا، لیکن نکالنا وکالنا کچھ بھی نہ ہوا۔ ہاں کہیں دن میں کولکا سے مُڈبھیڑ ہو جاتی تو پوچھتا: "ارے تم آدھی رات کب تک اودھم مچاتے رہو گے؟ لوگ باگ دن بھر کام کاج کے بعد ذرا آرام کرنا چاہتے ہیں اور تم، ڈھنڈورچی کے بچے، کسی کو سونے ہی نہیں دیتے!"

"میرا حق ہے،" کولکا حسبِ معمول جواب دیتا۔

"حق چکھادوں گا تجھے کسی دن، ذرا ٹھہر سہی!"

اور بس یہیں پر بات ختم ہو جاتی۔ لیکن ہر رات ماتوئے اپنے پلنگ پر بیٹھ کر عہد کرتا کہ کل نکال باہر کروں گا۔

اور پھر وہ دیر تک بیٹھا سوچتا رہتا۔ اکارڈین کی آواز بند بھی ہو جاتی لیکن وہ پھر بھی سوچتا رہتا۔ کرسی پر سے اپنی پتلون ٹٹولتا اور اس کی جیب سے سگریٹ نکال کر سلگانے لگتا۔

"دن بھر کافی دھواں نہیں اُڑا چکے کیا؟" بیوی کی نِندیائی ہوئی آواز آتی۔

"سو جاؤ!" ماتوئے رکھائی سے کہتا۔

آخر وہ سوچتا کیا تھا؟ کچھ خاص نہیں۔ ایسے ہی پُرانے دن آنکھوں میں پھرنے لگتے، اور ان میں بھی کوئی بندھی ہوئی بات نہیں۔ بس ایسے ہی بکھری ہوئی، دُھندلائی ہوئی یادیں۔ پھر ایک رات جب چاند کہیں آسمان پر دور جا چکا تھا اور اکارڈین بج رہا تھا اور رات کی ٹھنڈی ہوا کے ساتھ کسی تیز خوشبو کے جھونکے کھڑکی سے اندر آرہے تھے، ایک مختلف رات تصوّر کی طرح اس کی آنکھوں میں پھر گئی۔

وہ بالکل کالی سیاہ رات تھی۔

وہ، اُس کا باپ اور چھوٹا بھائی گورنا، گاؤں سے کوئی پندرہ کلو میٹر دور کوچو گوری میں گھاس کاٹنے گئے تھے۔ رات کے بیچ میں ننّھے گورنا کی سانس چلنے لگی۔ دن کی گرمی میں جب اُسے بہت پسینا آرہا تھا تو اس نے چشمے کا ٹھنڈا برف پانی پی لیا تھا، اور اب اُس کا دم گھُٹ رہا تھا۔ باپ نے ماتوئے کو جگایا اور کہا: "اگرینکا (ان کا سب سے تیز گھوڑا تھا) کو کہیں سے پکڑ کر سرپٹ گاؤں جاؤ اور تھوڑا سا دودھ لے آؤ۔ میں جب تک آگ جلاتا ہوں۔ دودھ آجائے تو اُبال کر اسے پلادیں گے۔ اس کے گلے کا جلد ہی کوئی دارُو نہ کیا تو نہ جانے کیا ہو!"

ماتوئے نے گھوڑوں کے چرنے کی آواز سنی اور پچھاڑی کے رسّے کا چابک بنا کر اسے سرپٹ گاؤں کی طرف دوڑا دیا۔ اور پھر --- ماتوئے اب ساٹھ کے پیٹے میں تھا، لیکن اُس وقت اس کی عمر کیا ہو گی؟ یہی کوئی بارہ تیرہ برس۔ لیکن وہ رات اسے اچھی طرح یاد تھی۔ گاؤں کی طرف گھور اندھیرے میں بھاگتے ہوئے ماتوئے اور گھوڑا ایک جان ہو گئے تھے۔ کالی رات، شبنم میں بھیگی ہوئی گھاس کی خوشبو لیے، طمانچے کی طرح اُن کے منھ پر گری، اور ماتوئے کو یوں لگا کہ سرخوشی کی کوئی لہر اسے بہا کر لے گئی ہے۔ اس کی کنپٹیوں میں لہو اُتھل پُتھل ہو رہا تھا۔ اسے یوں لگا جیسے وہ اُڑ رہا ہے اور زمین نیچے رہ گئی ہے۔ کچھ نظر نہیں آ رہا تھا: نہ آسمان نہ زمین، گھوڑے کا سر تک نہیں۔ وہ اپنے بیمار بھائی کا نہیں سوچ رہا تھا۔ وہ کچھ بھی نہیں سوچ رہا تھا۔ وہ تو اپنے مزے میں مگن تھا اور اس کی نس نس بے انت سُرور سے سنسنا رہی تھی۔

اور پھر اسے یکایک غم نے آ لیا۔ وہ دودھ لے کر لوٹا۔ اس کا باپ بچّے کو سینے سے چمٹائے، جیسے چُمکار رہا تھا۔

"ہوشیار ہو جاؤ بیٹے، کیا بات ہے؟ یہیں ذرا رُک جاؤ بیٹے، دودھ آ جانے دو۔ اب جھٹ پٹ اسے اُبالیں اور پھر ہمارا بیٹا ٹھیک ہو جائے گا۔ ذری حوصلہ کرو میرے یار، وہ دیکھو ماتوئے آ گیا دودھ لے کر۔"

لیکن ننّھے گوزما کی ہچکی بندھ رہی تھی، اور جب تک ماتوئے کے پیچھے پیچھے اس کی ماں وہاں پہنچی، گوزما مر چکا تھا۔ ماتوئے کچھ حیرانی اور کچھ کھوج کی نظروں سے اُسے تک رہا تھا۔ ابھی کل تو وہ گھاس میں ساتھ کھیل رہے تھے، اور آج یہ بالکل کوئی اور لڑکا تھا جو اس کے سامنے چپ چاپ پڑا تھا: کوئی اجنبی لڑکا جس کا رنگ نیلا پڑ چکا تھا۔

کیسی عجیب بات ہے کہ اس لعنتی اکارڈین نے یہ یاد جگا دی۔ اِتنی راتوں میں اِسی ایک رات کی یاد کیوں؟ جب سے اب تک وہ ایک پورا جیون گزار چکا تھا۔ شادی، انقلاب، زمینوں کا اشتمال، جنگ۔ جب سے اب تک کتنی راتیں آئیں گئیں، لیکن یہ سب ماضی کی دُھند میں کھو چکی تھیں۔ ماتوئے نے ساری عمر وہی کچھ کیا تھا جو کرنا ضروری تھا۔ جب انھوں نے کہا کہ اجتماعی فارم میں شامل ہو جاؤ تو وہ ہو گیا۔ جب شادی کے دن آئے تو اس نے الیونا سے شادی کر لی اور بچے بھی پیدا کر لیے۔ بچّے بڑے ہونے لگے، لڑائی شروع ہو گئی اور وہ بھرتی ہو کر لڑنے چلا گیا اور پھر زخمی ہو کر اَوروں سے پہلے گھر لوٹ آیا۔ پھر وہ کہنے لگے:

"ماتوئے، تم چیئرمین ہو جاؤ۔ تمہارے سوا اَور کوئی ہے نہیں۔" یوں وہ فارم کا چیئرمین بن گیا۔ پھر اسے اس کام کا ڈھب آ گیا اور لوگ بھی جیسے اس سے ہِل گئے اور اب وہ اسی کام میں جُتا ہوا تھا۔ کام، کام، کام، زندگی بھر کام۔ لڑائی میں گیا تو بھی کام۔ ہر چِنتا، ہر سُکھ، ہر دُکھ کام ہی سے بندھا ہوا تھا۔ چناں چہ، مثال کے طور پر، لوگ اس کے سامنے محبّت، پریم، عشق کی بات کرتے تو وہ کچھ کھویا سا جاتا۔ اسے پتا چلتا کہ محبّت نام کی کوئی چیز بھی دنیا میں ہوتی ہے۔ ویسے تو اس نے بھی الیونا سے محبّت کی ہو گی (وہ جوانی میں بہت خوب صورت تھی)، لیکن اس سے آگے اسے کچھ علم نہیں تھا۔ بلکہ اسے اکثر گمان ہوتا کہ لوگ جو ایسی باتیں کرتے ہیں یوں ہی اُڑار ہے ہوتے ہیں۔ یہ عاشقانہ گانے، اور آہیں بھرنا اور رونا دھونا، اور سنا ہے جان تک دے دینا، خیر یہ سب جھوٹ اور بناوٹ نہ سہی ایک لَت سمجھ لو۔ بس جان لیا کہ پریم محبّت کی بات کرنی چاہیے اور کرنے لگے۔ اور ہوتا اصل میں یہ ہے کہ بیاہ کا وقت آ چکا ہوتا ہے۔ اس کولکا ہی کو لے لو: کیا اسے سچ مچ عشق ہو گیا ہے؟ بس اتنا ہے کہ نینکا اس کی نظروں میں کُھب گئی ہے۔ آخر اچھی صورت کی چُلبلی لڑکی ہے۔ اور کولکا کی عمر آ گئی ہے کہ اپنا گھر بسائے، اس لیے رات بھر باجا بجا کر پریت بگھارتا پھرتا ہے۔ اور کیوں نہ کرے؟ گھبرو جوان ہے، پنڈے میں کس بل ہے۔ پہلے بھی چھوکرے ایسے ہی کیا کرتے تھے۔ کم از کم اب چھوکریوں پر دنگا تو نہیں کرتے جو پہلے کیا کرتے تھے۔ ماتوئے آپ کتنوں سے گتھم گتھا ہو چکا تھا۔ سب ایک ہی چکّر ہے: فالتو توانائی اور ہاتھوں میں اچھی، کھیں تو اسے خرچ کرنا ہی ہوتا ہے۔

ایک رات ماتوئے اسی طرح کی باتیں سوچ رہا تھا کہ اس سے رہا نہ گیا اور اس نے اپنی بیوی کو ٹھوکا دے کر جگایا۔

"نیک بخت، ذرا اٹھ تو۔ ایک بات پوچھنی ہے۔"

"کیا ہوا؟"

"تمہیں کبھی عشق ہوا ہے، مجھ سے یا کسی اَور سے؟"

"آج زیادہ پی گئے ہو کیا؟"

"بالکل نہیں۔ تمہیں سچ مچ مجھ سے پیار تھا یا ایسے ہی شادی کر لی تھی جیسے عام عادت ہے؟ میں سوچ سمجھ کر پوچھ رہا ہوں۔"

الیونا جان گئی کہ اس کا میاں نشے میں نہیں ہے، لیکن وہ کافی دیر چپ رہی۔ اسے کچھ

یاد نہیں تھا، نہ ماتوئے کو یاد تھا۔

"تمھیں یہ باتیں کون سُجھا رہا ہے؟" آخر اس نے کہا۔

"دیکھو کوئی بات ہے جس کی تہ تک پہنچنا چاہتا ہوں۔ اس نے مجھے زِچ کر رکھا ہے، جیسے کہیں اُلجھن ہو رہی ہو۔"

"بالکل تم سے پیار تھا،" الیونا نے بہت اعتماد سے کہا، "ورنہ تم سے بیاہ کیوں کرتی؟ یاد نہیں منکا کوالیوف نے کیسا پیچھا لے رکھا تھا میرا، لیکن میں نے اُس سے تو شادی نہیں کی۔ لیکن یہ آدھی رات تمھیں پیار محبت کی کیا سُوجھ رہی ہے؟ دماغ تو نہیں چل گیا تمھارا؟"

"جاؤ جاؤ، سو جاؤ!"

"دیکھو سویرے ڈھور باہر جائیں تو گائے ساتھ کر دینا۔ مجھ تمھیں بتانا یاد ہی نہیں رہا کہ ہم سب عورتیں سویرے رس بھریاں چُننے جا رہی ہیں۔"

"وہ کہاں؟" ماتوئے چوکنا ہو گیا۔

"تمھارے گھاس کے کھیت میں نہیں۔ فکر نہ کرو۔"

"اگر گھاس روندی گئی تو سب کو دس دس روبل جرمانہ کروں گا۔"

"ہمیں معلوم ہے ایک جگہ۔ وہاں کوئی کٹائی نہیں ہو رہی ہے۔ لیکن تم گائے کا نہ بھولنا۔"

"اچھا۔"

ہاں، تو اُس رات کیا ہوا تھا جب وہ اپنے بھائی کے لیے دودھ لینے گیا تھا؟ اور اچانک یہ خیال اسے کیوں ستانے لگا تھا؟ بُڑھاپے میں مَیں کچھ بدھو ہوتا جا رہا ہوں، ماتوئے نے سوچا، سب ہی ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس کے دل کی کسک مٹنے میں نہ آتی۔ ایکا ایکی اسے پتا چلتا کہ وہ کولکا اور اس کی بے سُری دھونکنی کی راہ دیکھ رہا ہے۔ اگر اس کو ذرا دیر ہو جاتی تو اسے فکر ہونے لگتی اور وہ نینکا کو کوسنے لگتا: "پھٹکار اس لونڈیا پر! اُسی نے پاس بٹھا رکھا ہو گا۔" اور وہ بیٹھا انتظار کرتا اور سگریٹ پیتا رہتا۔ اور پھر گلی میں دور کہیں باجا بجنا شروع ہوتا اور اس کے دل میں ہُوک سی اُٹھتی؛ عجیب سی ہُوک جو حُسن پسند تھی، جس کے بغیر کچھ ٹوٹ سی محسوس ہوتی۔

اور پھر اسے کچھ صبحوں کی بھی یاد آئی۔ وہ گھاس پر ننگے پاؤں چل رہا ہوتا جس پر شبنم

کے موتی پروئے ہوئے ہوتے اور اس کے پیچھے پیچھے ایک شوخ دھانی رنگ کی پگڈنڈی سی بنتی جاتی اور ٹھنڈی اوس سے اس کے پاؤں کٹنے لگتے۔ یہ ٹھنڈک یاد کر کے اسے جھرجھری سی آجاتی۔

یا پھر وہ موت کے بارے میں سوچنے لگتا کہ اب تھوڑے ہی دنوں میں سب دھندے مِٹ جائیں گے۔ کسی ڈر یا تکلیف کا خیال نہیں بلکہ انوکھی بات، کہ دنیا کا کاروبار یوں ہی چلتا رہے گا لیکن اُسے اٹھا کر قبرستان لے جائیں گے، زمین میں دفن کر دیں گے۔ یہ سمجھ میں آنا بہت مشکل تھا کہ اس کے بعد باقی سب کچھ ایسے ہی کیسے رہے گا۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ سورج نکلے گا اور ڈوبے گا، جیسے ہمیشہ ہوتا ہے، لیکن گاؤں میں اَور لوگ بسیں گے جنھیں وہ کبھی نہیں جان سکے گا۔ یہ کیسے ہو گا، اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ شاید دُس پندرہ برس تک لوگ یاد رکھیں گے کہ یہاں ایک ماتوئے ریزانتسیف نام کا بھی ایک آدمی رہتا تھا، لیکن اس کے بعد۔۔۔ اُسے ضرور جاننے کی ٹوہ ہو گی کہ یہ لوگ کس حال میں ہیں۔ لیکن وہ جانے گا کیسے؟ ویسے ان باتوں سے اسے کوئی بے کلی نہیں ہوتی تھی۔ اتنی بار سورج چڑھتے ڈوبتے دیکھا تھا۔ چھٹیوں کے دنوں میں کافی عیش لُوٹے تھے۔ اچھے وقت دیکھے تھے۔ نہیں، اسے کوئی رنج افسوس نہیں تھا۔ جی بھر کے دنیا دیکھ لی تھی۔ لیکن صرف یہ اُلجھن ستاتی تھی کہ جب وہ مر جائے گا تو باقی لوگ ایسے ہی چل پھر رہے ہوں گے؛ صرف وہ ہمیشہ کے لیے چلا جائے گا۔ اُس کے بغیر کچھ نہ کچھ تو انھیں زندگی سُونی معلوم ہو گی کہ نہیں؟

"ہٹاؤ جی، بڑھاپے میں واقعی مَت ماری گئی ہے!" اور سوچ سوچ کر واقعی اسے تھکن ہونے لگتی۔

"اری اٹھو!" وہ بیوی کو ٹھوکا دیتا۔ "تمھیں موت سے ڈر لگتا ہے؟"

"بالکل خبطی ہو گیا ہے! ارے موت سے کون نہیں ڈرتا؟" الیونا تنک کر کہتی۔

"میں تو نہیں ڈرتا۔"

"تو پھر سو جاؤ نہ۔ ان باتوں میں کیوں سر کھپا رہے ہو؟"

"سو جاؤ تم خود۔"

لیکن جب بھی اسے وہ کالی زور آور رات یاد آتی، اس کے دل میں کٹیلا، میٹھا میٹھا سا درد اٹھتا۔ نہیں، جینے میں کچھ ہے ضرور جسے کھو کر اسے بہت دکھ ہو گا، رُلا دینے والا دکھ۔

پھر ایک رات کولکا کے اکارڈین نے اسے بے کار انتظار کرایا۔ وہ سگریٹ پیتا رہا، پیتا

رہا، لیکن اکارڈین کی آواز نہ آنی تھی نہ آئی۔ وہ انتظار کرتا رہا، کرتا رہا، لیکن بالکل فضول، بے کار۔ اس رات نے سچ مچ اس کا کلیجا نکال کر رکھ دیا۔

پو پھٹی تو اس نے بیوی کو جگایا۔

"بھئی یہ ہمارے ڈھنڈورچی کو کیا ہوا؟ آج اُس کی آواز ہی نہیں آئی۔"

"اس کی شادی ہو رہی ہے۔ اتوار کو بیاہ ہو گا۔"

اس خبر سے ماتوئے کا دل اداس ہو گیا۔ اس نے بستر میں جا کر سونے کی کوشش کی لیکن نیند نہ آئی۔ وہ ایسے ہی لیٹے لیٹے چھت کو تکتا رہا اور سورج چڑھ آیا۔ اس نے پرانے دنوں کا کچھ اَور یاد کرنا چاہا لیکن کچھ بھی ذہن میں نہ آیا اور پھر اجتماعی فارم کے دھندوں کی فکر اسے ستانے لگی۔ گھاس کی کٹائی کے دن آرہے ہیں اور آدھے سے زیادہ کام کرنے والے، لوہار کی بھٹی پر اپنی درانتیوں کی ہتھیاں لیے کھڑے ہیں، لیکن لوہار، وہ بھینگا بدمعاش فلیا دُھت ہے۔ شادی پر اَور چڑھا لے گا اور پورا ہفتہ غارت ہو جائے گا۔ خیر، کل اُسے پکڑوں گا۔

اگلے دن جب موٹے ہونٹوں والا کولکا اسے ملا تو ماتوئے نے ذرا طنز سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں برخوردار، تو ہو چکا گانا بجانا تمھارا؟"

کولکا کی جیسے باچھیں کھِل گئیں۔

"ہاں ہو چکا۔ اب میں آپ کو راتوں میں نہیں جگاؤں گا۔ ختم۔"

"اچھی بات ہے،" ماتوئے نے کہا اور چل دیا۔ وہ دل ہی دل میں کہہ رہا تھا: "اتنے خوش کس بات پر ہو رہے ہو بچھڑے؟ ابھی تمھارے سینگ ایسے قابو کرے گی کہ یاد کرو گے۔ یہ کریچیتوف خاندان ہی ایسا ہے، تم کیا جانو!"

ایک ہفتہ گزر گیا۔

کھڑکیوں سے چاندنی کا دھارا بہہ رہا تھا۔ ہوا میں ترکاریوں کے کھیت سے آلو کے پتوں کی اور افسنطین کی تیز باس بسی ہوئی تھی اور چاروں طرف سناٹا تھا۔ ماتوئے کی نیند اُچٹ رہی تھی۔ وہ بار بار جاگتا اور سگریٹ پینے بیٹھ جاتا۔ کبھی باہر ڈیوڑھی میں کواس پینے چلا جاتا۔ کبھی باہر سیڑھیوں پر جا بیٹھتا اور سگریٹ پینے لگتا۔ سارا گاؤں چاندنی میں ڈوبا ہوا تھا اور غضب کا سناٹا تھا۔

محمّد خالد اختر

جوڈی اور میں

جوڈی السیشیئن نسل کا ایک کتا ہے جو میری زندگی میں اُس وقت داخل ہوا جب میں پنشن ملنے پر بہاولپور میں اپنے آبائی گھر میں آ آباد ہوا۔ میرے بھائی کے بچے بھی لاہور جانے کے بجائے، جہاں میرے بھائی کی نہر کے محکمے میں پوسٹنگ تھی، اسی گھر میں منتقل ہو گئے۔ آبائی مکان کی تقسیم یوں ہوئی تھی کہ آدھا مکان میرے حصّے میں آیا تھا اور دکھنی طرف کا آدھا مکان بھائی کے حصّے میں۔ جوڈی میرے بھائی کا کتا تھا۔ ایک صبح وہ رحیم یار خاں سے گھر کے سامان اور دو بکروں کے ساتھ ٹرک میں بہاولپور آیا۔ میرے بھائی کو پالتو جانور رکھنے کا شوق ہے۔ اُس کے پاس دو گھوڑے بھی تھے۔ (دراصل وہ گھوڑوں کا عاشق ہے اور ایک گھوڑے کو میں نے کھانے کی میز پر ایک بڑی پلیٹ میں کھاتے بھی دیکھا ہے۔) اس نے یہ دونوں گھوڑے چک عبداللہ میں اپنے فارم پر بھجوا دیے تھے، کیوں آبائی مکان میں اُن کی دیکھ بھال ممکن نہ تھی۔

میں نے کتا کبھی نہیں رکھا۔ (حقیقت میں مَیں سب جانوروں سے بیزار ہوں، خواہ وہ کتّے ہوں یا بلّے یا گھوڑے یا کوئی اَور چوپائے۔ مجھ میں اور جانوروں میں کبھی اتفاقِ رائے نہیں ہو سکا اور ہم اپنی مختلف راہوں پر چلتے رہے ہیں۔) پہلے پہل میں نے کتّے اور بکروں کو محفوظ فاصلے پر رکھا اور ان کے معمولات اور افعال پر مطلقاً کوئی توجہ نہ دی، مگر رفتہ رفتہ میں نے دیکھا کہ ہم ایک دوسرے کی زندگیوں پر چند لطیف اور پُراسرار طریقوں سے اثرانداز ہو رہے ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ میرے بیوی بچے ابھی کراچی میں تھے، اور بھائی کے بچے بھی اکثر ایک ایک دو دو مہینوں کے لیے لاہور آتے جاتے رہتے تھے، اس لیے کئی بار اس

مکان میں یہ جانور ہی میرے ہمجولی اور ہم صحبت ہوتے، سوائے اُس چھوٹے بچے شادی خاں کے جس کا ذکر میں پھر کبھی کروں گا۔ اس طرح جب بھائی کے بیوی بچے لاہور چلے جاتے تو جوڈی اور بکروں کی دیکھ بھال کی ذمے داری مجھ پر آن پڑتی اور میں ایک طرح اُن کا گارڈین بن جاتا۔

جوڈی ایک اونچا، جواں سال السیشیئن تھا: آنکھیں زرد کرنجی، معصوم تھوتھنی اور نوکیلے مضمحل کان۔ اُس کی پوستین گھری گرے تھی جس میں کہیں کہیں تھوڑی سی سفیدی جھلکتی تھی۔ جوڈی کا اگلا بایاں گٹّا رحیم یار خاں میں ایک اسکوٹر کو سامنے سے لینے کی کوشش میں کچلا گیا تھا اور وہ یہ پنجہ کچھ اوپر اٹھائے تین ٹانگوں پر چلتا تھا۔ تم اسے لنگڑا کہہ سکتے ہو، مگر وہ اس معذوری کو زیادہ خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ جب وہ آیا تو اچھا خاصا چاق و چوبند، ٹھیک ٹھاک کتا تھا اور اس کی پوستین صاف، مہرے دار تھی۔ پھر خدا جانے اُس کو نئی جگہ کی آب و ہوا راس نہ آئی یا کسی پُراسرار بیماری نے اس کے بدن میں گھر کر لیا، کہ وہ سست اور نڈھال رہنے لگا اور اتنا دُبلا ہو گیا کہ اس کی پسلیاں نکل آئیں۔ ناتوانی کی وجہ سے اُس کا دایاں کان، جو لووں پر سے کچھ کترا ہوا تھا، سیدھا کھڑا رہنے کے بجائے نیچے ڈھلک آیا۔ اُسے دیکھ کر ترس آتا تھا۔ بھائی کے بچے، کتوں کے عاشق نہ ہونے کی وجہ سے، اُسے زیادہ منھ نہیں لگاتے تھے۔ کوئی اُسے سلوتری کے پاس لے کر نہ گیا۔ بھابی البتہ اُس کا خیال کرتیں اور دو وقت کی روٹی اور دودھ اسے دیتیں۔ جب بھائی کا کنبہ پہلی بار ایک دو مہینے کے لیے لاہور گیا تو میرے علاوہ گھر میں جوڈی، میانوالی کے دو بکرے، دو سالہ بچہ شادی خاں اور اس کی نیم باؤلی ماں رہ گئے۔ زمانے کی ستائی ہوئی منظوراں مائی میری روٹی پکا دیتی اور میں اپنے کمرے میں لکھنے پڑھنے میں مصروف رہتا۔ بکرے جوڈی کے چارج میں تھے، یعنی جوڈی سے یہ ڈیوٹی متوقع تھی کہ وہ بکروں پر نظر رکھے اور اُن کو کوٹھی کے احاطے سے باہر سڑک پر نہ بھٹکنے دے۔ جوڈی اپنی اس ڈیوٹی کو خوبی سے انجام نہ دیتا۔ ویسے بکرے تھے بھی بڑے نٹ کھٹ اور سیلانی۔ وہ جوڈی کی بخ بخ اور گھیرے کی پروا نہ کرتے اور کوٹھی کے احاطے میں جہاں چاہتے گھومتے پھرتے اور مینگنیاں کرتے۔ انھیں چارپائیوں پر چڑھنے اور وہاں ضروریات سے فارغ ہونے کا بہت شوق تھا۔ آہستہ آہستہ انھوں نے جوڈی کو نظرانداز کرنا شروع کر دیا اور جوڈی بھی انھیں ناقابلِ اصلاح جان کر ان کی بداعمالیوں سے درگذر کرنے لگا۔ اپنی ڈیوٹی سے جوڈی کی اس غفلت نے، جو میرے نزدیک اس کی انتہائی سستی تھی، مجھے تین چار موقعوں پر

طیش سے پاگل کر دیا اور میں نے بید سے اس کی بُری طرح ٹھکائی کی۔ جوڈی نے اسے کبھی معاف نہیں کیا، مگر یہ بعد کی بات ہے، پہلے پہلی باتیں۔

بھائی کے بچوں کے جانے کے بعد میں نے جانوروں کی دیکھ بھال کی ذمے داری اپنے سر لیتے ہوئے جوڈی کے قریب آنے اور اسے دوست بنانے کا ارادہ باندھا۔ وہ اُن دنوں بڑی افسوس ناک اور تباہ حالت میں تھا اور میں نے محسوس کیا کہ جوڈی کو پیار محبت اور دیکھ بھال کی ضرورت ہے۔ اس دوستی میں بھی پہل جوڈی کی طرف سے ہوئی۔ جوڈی کی عادت تھی کہ جب بھی میں کسی کام یا سَیر کی غرض سے کوٹھی کے باہر جاتا تو وہ لنگڑا کر بھاگتا ہوا پھاٹک پر پہنچ جاتا اور اپنے کولھوں پر بیٹھ کر رحم طلب نگاہوں سے مجھے دیکھتا کہ میں اُسے اپنے ساتھ آنے دوں۔ میں پھاٹک بھیڑ کر اُسے پیچھے جانے اور بکروں کی رکھوالی کرنے کا آرڈر دیتا اور وہ دبک کر مایوسی کے عالم میں لوٹ جاتا۔ پھر مارچ کے شروع میں، جب ہوا میں بہار کی خوشبوئیں رچی تھیں، میں نے ڈاکٹر کی ہدایت پر صبح کے وقت کی لمبی سیر کا آغاز کیا۔ سپیدۂ صبح نمودار ہونے سے پہلے میں چائے اور سگریٹ پی کر اور بوٹ پہن کر اپنے کمرے سے نکل کھڑا ہوتا۔ جوڈی پہلے ہی جاگا ہوا اور ہوشیار، پھاٹک پر میرا منتظر ہوتا۔ ایک دو دن تو میں نے اسے "گیٹ بیک، جوڈی!" کہہ کر واپس بھیج دیا، پھر سیر کے لیے اُس کا شدید اضطراب اور اشتیاق دیکھ کر اسے اپنے ساتھ سیر پر لے جانے لگا۔ اور پھر وہ آدمی اور کتے کی لمبی سیریں!

جوڈی کی یہ اضطرابی کیفیت اور مسرّت مجھے حیران کر دیتی۔ وہ سینٹرل لائبریری کے پارک میں سے گزرتے ہوئے ہر جھاڑی کو سونگھتا، کھڑے ہوئے پانی میں سے چھپ چھپ کرتا، چھینٹے اُڑاتا گزرتا، چڑیوں اور کوّوں کو تاکتا اور ان کے تعاقب میں بھاگتا۔ ایک دفعہ میں نے اسے ایک شریر تیتری کو پکڑنے کے لیے دیوانہ وار ایک ہی جگہ گھومتے اور چکّر کاٹتے دیکھا۔ وہ اٹکھیلیاں کرتا، کھیلتا اور مچل مستیاں کرتا ـــ کتنے انسان ہیں، میں سوچتا ہوں، جو قدرت کی جمال آرائیوں، رنگینیوں اور حیرتوں کو اس طرح اپنے رگ و پے میں محسوس کرتے ہوں گے جیسے جوڈی ان سیروں میں کرتا تھا۔ وہ اکثر مجھ سے آگے دوڑتا اور راستے پر کھڑا ہو کر میرے آنے کا انتظار کرتا۔ سینٹرل لائبریری کے باغوں کو پار کر کے جب ہم کچہریوں کے پاس سے گزرتے تو وہ وکیلوں کے کیبنوں کا تفصیلی جائزہ لیتا اور پھر اچانک مڑ کر کسی غیر متوقع گوشے سے اپنی مضحک صورت دکھاتا۔ (اگر کتے ہنس سکتے ہیں تو

جوڈی اس وقت ہنس رہا ہوتا۔) دو ڈھائی میل کی اس سیر کے بعد کتا اور آدمی گھر لوٹ آتے۔ جوڈی بھوکا ہوتا اور اپنے ناشتے کے لیے بے تاب۔ میں اُسے برآمدے میں چھوڑ کر اس کے لیے ڈبے کا دودھ بناتا اور اسے ایک برتن میں اُنڈیل کر باہر برآمدے میں رکھ دیتا۔ میرے برتن نیچے رکھنے سے پہلے ہی جوڈی بے صبری سے اس پر پل پڑتا اور ایک منٹ میں دودھ کو چاٹ کر مجھ سے مزید دودھ کا طلب گار ہوتا۔ یہ ہمارا روز کا معمول ہو گیا اور ہم بڑے اچھے دوست بن گئے۔ کئی بار جب مجھے صبح تیاری میں دیر ہو جاتی، جوڈی اپنی پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہو کر برآمدے میں کھلنے والی میرے کمرے کی بند کھڑکی پر پنجے مارتا اور چیاؤں چیاؤں کی آواز نکالتا۔ میں اس کی نوکیلے کانوں اور معصوم تھوتھنی کو کھڑکی کے شیشے میں سے دیکھتا اور اسے تقریباً یہ کہتے ہوئے سنتا: ''میاں جی، کیا بات ہے؟ کیا تم باہر نہیں آؤ گے؟ سیر میں چوک نہیں ہونی چاہیے۔'' دو تین بار جب کسی وجہ سے میں سیر کے لیے نہیں جا سکا، جوڈی کو میرا نہ جانا سمجھ میں نہ آیا اور اسے بڑی مایوسی ہوئی۔ ان سیروں میں، جن میں چھوٹا شادی خاں بھی بعض دفعہ ہمارے ساتھ ہوتا تھا (اپنی آڑی ٹانگوں سے لپکتا ہوا)، ایک خرابی تھی جو بعد میں جوڈی کی عادات اور نفسیات کو بدلنے کا موجب بنی۔ (میرے بھائی نے مجھ سے کہا کہ مجھے جوڈی کو سیر پر نہیں لے جانا چاہیے تھا۔) وہ خرابی یہ تھی:

جوڈی کی موجودگی پڑوس کے کتوں میں مشہور ہو گئی ہو گی۔ ان میں سے چند ایک نے پھاٹک کی درزوں میں سے جھانک کر چمک دار پوستین اور برتر وضع کے اس کتے کو، جو کسی جج کی طرح سنجیدہ معلوم ہوتا تھا، ضرور دیکھا ہو گا اور اپنے ساتھیوں کو اس کی اطلاع پہنچا دی ہو گی۔ چناں چہ جس صبح جوڈی اور میں پہلی بار سیر کو نکلے، لائبریری کے پارک کے وکٹ گیٹ سے اندر جاتے ہوئے مختلف قدوقامت اور وضع قطع کے کتوں کی فوج جوڈی کی آؤبھگت کے لیے موجود تھی۔ جوڈی کو دیکھتے ہی وہ بخ بخ کرتے، غراتے اور کھکھیاتے ہوئے اس کی پیشوائی کو آگے لپکے۔ ان کے ارادے اچھے نہیں تھے۔ جوڈی ہَف ہَف کر کے دو تین کی طرف لپکا، مگر پھر یہ دیکھ کر کہ وہ بہت سے ہیں، میرے ساتھ ساتھ لگ گیا۔ میرے پاس چھڑی نہ تھی جس سے انھیں ڈرا بھگاتا۔ میں نے ایک سفید کتیا کو، جو دوسروں سے بڑھ کر کھکھیا رہی تھی اور غالباً اس ٹولی کی سرغنہ تھی، ہاتھ سے ڈرا کر دور رکھنے کی کوشش کی مگر وہ اپنے سفاک دانتوں کو مسوڑھوں تک ننگا کیے مجھ پر لپکنے کو ہوئی۔ میں اس سے کچھ ڈر سا گیا، اگرچہ میں بالعموم کتوں سے نہیں ڈرتا۔ اس کتیا نے پھر اپنا ارادہ بدل دیا، مگر اس نے اور اس

کے ساتھیوں نے بھوکتے ہوئے ہمارا محاصرہ جاری رکھا۔ انھوں کے لائبریری کے پرلے پھاٹک پر رسمِ مشائعت عمل میں لاکر ہم کو رخصت کیا۔

سیر سے لوٹنے کے بعد میں نے اپنے آپ کو مسلّح کرنے کا فیصلہ کیا اور دوسرے روز شاہی بازار میں سوٹیوں کی واحد دکان سے پیتل کی ٹوپی والی ایک پتلی چھڑی چھانٹ چھونٹ کر خرید لایا۔۔ اس قسم کی چھڑی جو گھڑسوار اپنی رانوں کو تھپتھپانے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ (یہ چھڑی کئی بار غائب ہونے کے بعد اب بھی میرے پاس موجود ہے اگرچہ جوڈی اور میں نے اپنی سیریں ایک عرصے سے موقوف کر دی ہیں۔) یہ چھڑی بہت مفید ثابت ہوئی۔ اس سے میں بڑی آسانی اور اعتماد کے ساتھ جوڈی کے مخالفین کی روک کر سکتا تھا۔ اُس کے بَیری مجھے ہتھیار بند دیکھ کر ذرا فاصلے سے غرّاتے۔ جوڈی خود کو محفوظ محسوس کرنے لگا بلکہ شیر ہو گیا۔ اب میرے ساتھ دبکنے کے بجائے وہ اپنے مخالفوں کو جواب آں غزل دیتا، موثر طور پر بھونکتے ہوئے اُن کا تعاقب کرتا۔ دو تین بار اس نے چند کتّوں کی گردن ناپی اور انھیں پچھاڑ دیا۔ اب میں سوچتا ہوں کہ مجادلہ کرنے والے کتّے حقیقت میں اس نووارد کے متعلق محض متجسّس تھے اور اس کا دم خم آزما کر اس سے راہ و رسم پیدا کرنے کے خواہاں تھے۔ چند بار مجھے شک سا گزرا کہ جوڈی کھڑا ہو کر اُن واویلا مچاتے ہوئے پلّوں کو حسرت سے دیکھ رہا ہے جیسے وہ بھی ان کے ساتھ شامل ہو کر کھیلنا کودنا اور دھینگا مشتی کرنا چاہتا ہو۔ اُن کی طرف جوڈی کا انداز شدید معاندانہ نہ رہا، آہستہ آہستہ اس میں ایک قسم کی نرمی اور بُردباری سی آ گئی۔ کیا وہ اپنی بڑھیا نسل کے ہونے کی غیرت کھو رہا ہے؟ مثَل ہے کہ آدمی ایک سوشل یا معاشرتی حیوان ہے۔ میرے خیال میں کتّا آدمی سے بھی کہیں زیادہ سوشل حیوان ہے۔ تم نے کتّے کو سر ڈالے، اکیلے جاتے کم ہی دیکھا ہو گا۔ بیشتر وہ ٹولی بنا کر گھومتے پھرتے ہیں جیسے کسی پارٹی میں جا رہے ہوں یا کسی پارٹی سے آ رہے ہوں۔ اس کے باوجود وہ بعض دفعہ ناپسندیدگی کا اظہار کر کے ایک دوسرے کو گُھرکتے اور کاٹتے ہیں۔ جلد ہی بغیر کسی جھجھک کے اُن میں صاحب سلامت ہو جاتی ہے۔ نسل، پوستین کی رنگت، شکل و شباہت اور سائز کی کوئی قید نہیں ہوتی۔ ممکن ہے اس فوری دوستی میں جنس کا بھی کچھ دخل ہو، مگر قیاس لگاتا ہوں کہ ان کی سوسائٹی پرمِسو (primissive) یا جنسی طور پر آزاد سوسائٹی ہے اور ان کی جنسی عادتیں اور رسمیں جدید امریکیوں سے ملتی جلتی ہیں۔ اُنھیں کی طرح وہ اجتماعی یا گروہی سیکس، بیوی کے باہمی تبادلے اور برسرِعام اختلاط وغیرہ کے قائل ہیں (گو جہاں تک میں جانتا

ہوں، وہ ہومو نہیں ہوتے جیسا کہ بعض انسان ہوتے ہیں) البتہ اُن کا ان حرکتوں اور جولانیوں کا ایک موسم ہوتا ہے جس کے گزرنے کے بعد وہ جنس میں دلچسپی کھو دیتے ہیں۔

اب جوڈی کی طرف واپس آتے ہوئے، ایک شام میں اور شادی خاں جوڈی کو لائبریری کے میدانوں میں پھرا کر واپس آ رہے تھے کہ اسکوٹر پر سوار، مقطّع داڑھی والے ایک موٹے آدمی نے اسکوٹر میرے پاس روکا۔ اس نے ایک نظر جوڈی پر ڈالی اور پھر مجھ سے کہا کہ وہ میری تلاش میں آیا ہے۔ اس کی ایک السیشین کتیا تھی اور وہ جاننا چاہتا تھا کہ آیا میں جوڈی کا اس سے میل کرانے پر رضامند ہوں گا۔ میں نے کھرّے لہجے میں جواب دیا کہ ہم جوڈی کا السیشین کتیا یا کسی اَور کتیا سے میل کرانے پر تیار نہیں۔ مقطّع داڑھی والا شخص ایسی بے ہودہ، مخربِ اخلاق بات کیوں کر کہہ سکتا ہے، میرا خون اُبلا۔ اس نے پھر میری طرف اس امید سے دیکھا کہ شاید میں اس کی درخواست مان جاؤں گا۔ جوڈی نے غالباً تاڑ لیا کہ ہم اُس کی باتیں کر رہے ہیں، اور وہ ہمارے پاس آ گیا۔ اس کی پسلیاں نکلی ہوئی تھیں اور حالت اتنی خستہ اور ماتم خیز تھی کہ مجھے اس کی جنسی اہلیت کے بارے میں شک تھا۔ اگر وہ یہ کرتب انجام نہ دے سکا تو جوڈی کا مالک ہونے کی حیثیت سے میری کرکری ہو گی۔ میں نے حتمی طور پر ''نہیں'' کہا اور وہ آدمی اپنا سا منہ لے کر چلا گیا۔ ہو سکتا ہے میرے اس انکار میں میرے اپنے جنسی ٹیبوز (taboos) اور خوف بھی کارفرما ہو۔ سیکس ایک ڈرٹی فعل تھا اور میں نہیں چاہتا تھا کہ جوڈی کو اس مضحکہ خیز، نامعقول آزمائش میں ڈالا جائے جس سے اس کا عہدہ بر آ ہونا بھی یقینی نہ تھا۔

اب میں سوچتا ہوں کہ میرا فیصلہ درست تھا۔ جوڈی کو سیکس میں زیادہ دلچسپی نہیں رہی تھی، اور میرا خیال ہے اب بھی نہیں، جہاں تک میں جانتا ہوں۔ اس نے کوئی شدید جوشیلی قسم کی "ڈیٹنگ" (dating) اپنی اس وقت تک کی زندگی میں نہیں کی۔ غالباً وہ جتی ستی یوگی ہے، اب تک ایک ورجن۔ جوڈی کے ساتھ ان سیروں میں مَیں کتوں کی دنیا سے آگاہ ہو گیا اور سڑک پر اُن آوارہ کتوں کو جو مجھے راہ میں ملتے، اُن کی نسل اور قبیلے کے مطابق شناخت کرنا میرا تفریحی مشغلہ بن گیا۔ بے شک یہ غیر ملکی پالتو بورژوا کتّے نہ تھے، گلوں میں پٹّے پہنے اور نازو نعم میں پلے۔ یہ پرول (prole) کتّے تھے، اور میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ وہ اپنے حلیے اور قد کاٹھ میں اپنے بدیسی بھائیوں سے کافی ملتے جلتے ہیں اور آسانی سے کلاسی فائی کیے جا سکتے ہیں۔

جوڈی کے ساتھ میری یہ صبح کی سیریں جاری رہیں مگر ان سے اس کی صحت بہتر نہ ہوئی۔ وہ دُبلا اور کم زور ہوتا گیا اور اس کی پسلیاں اَور نمایاں ہوتی گئیں۔ وہ کسی پوشیدہ عارضے میں گھُلتا نظر آتا تھا جس کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

پھر اس کے ساتھ میری سیروں میں ناغے آنے لگے اور رُفتہ رفتہ وہ بالکل بند ہو گئیں۔ اس کی کئی ایک وجوہات تھیں، مگر میں سمجھتا ہوں ایک خاص واقعہ جو ہمیں پیش آیا، سیر کے خاتمے کا سبب بنا۔ ایک صبح میں اور جوڈی جا رہے تھے۔ جب ہم پولیس اسٹیشن سے آگے نالے کے پُل پر آئے تو اس کے کنگورے پر تین چار نوجوان لونڈے بیٹھے تھے۔ انھوں نے ہمیں گستاخانہ تمسخر سے دیکھا اور ہمارے نالے کے کنارے پر مڑتے ہی ایک نے دوسرے سے کہا: "جیسا آدمی ہے ویسا ہی کتا ہے۔" ان کا اشارہ ہماری خستہ حالی کی طرف تھا۔ اس پھبتی پر میں جل بھن کر رہ گیا۔ میں نے پلٹ کر ان سے کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا۔ ہم اپنی راہ چلتے گئے۔۔۔ اگلے دن میں سیر کے لیے تیار ہو کر نہ نکلا، اور اس سے اگلے دن بھی نہیں۔ جوڈی ان سیروں کے بند ہونے پر حیران اور مایوس ہوا ہو گا۔ جب میں کمرے سے باہر برآمدے میں نکلتا تو وہ امید کی نظروں سے دیکھتا کہ شاید میں سیر کے لیے جا رہا ہوں اور اسے بھی ساتھ لے جاؤں گا۔ مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ جوڈی مجھ سے کچھ روٹھا روٹھا اور کھنچا کھنچا رہنے لگا ہے۔ ہماری دوستی اور رفاقت میں ان سیروں کے بند ہونے سے رخنہ پڑ گیا جو بعد میں کبھی پوری طرح پاٹا نہ جا سکا۔

انھیں دنوں جوڈی میں ایک تبدیلی رونما ہونے لگی۔ شاید اس کا تعلق کچھ کچھ اُس پُراسرار دکھ سے تھا جو اسے کھائے جا رہا تھا۔ وہ تیزی سے ایک قسم کی بے کسی اور زبوں حالی کی طرف سفر کرنے لگا۔ اس نے ہر چیز میں دلچسپی کھو دی اور بے پروا اور لاتعلق سا ہو گیا۔ اب اس نے میانوالی کے بکروں کی رکھوالی کی ذمے داری بھی تج دی۔ پہلے وہ ان کی حرکات پر آنکھ رکھتا تھا: جب وہ پھاٹک سے باہر سڑک پر نکلنے کی کوشش کرتے، جوڈی ان کے گرداگرد کچھ فاصلے سے بھونکتا (وہ بکروں کے سینگوں سے ڈرتا تھا) اور گھیر گھار کر ان کو اس ارادے سے باز رکھتا تھا۔ اب وہ بکروں پر بالکل توجہ نہ دیتا۔ وہ جہاں چاہتے آتے جاتے، گھومتے پھرتے، جوڈی کی بلا سے۔ وہ اگلی ٹانگوں پر سر رکھے، پژمردہ آنکھوں سے انھیں پھاٹک سے باہر جاتا دیکھتا رہتا، اور کھڑا ہو کر انھیں تنبیہ کرنے کو ہلکی سی بخ بھی نہ کرتا۔ یہ بکرے بھی ایک مصیبت تھے۔ ہر دوسرے تیسرے دن منظوراں مائی مجھے اطلاع دیتی کہ

ایک یا دونوں بکرے غائب ہیں۔ پھر وہ بے چاری برقع اوڑھ، ہاتھ میں درخت کی ایک شاخ لیے، شادی خاں کے ساتھ انھیں ڈھونڈنے نکلتی اور دور سڑک پر سے یا لائبریری کے میدان سے انھیں ہنکا کر لے آتی۔ اس کام میں شادی خاں اس کی مدد کرتا۔

ایک دن ایک بکرا سچ مچ گم ہو گیا۔ منظوراں مائی نے اور میں نے اس کو سڑک پر اور محلّے میں ہر جگہ ڈھونڈا مگر وہ نہ ملا۔ ہمیں یقین ہو گیا کہ اس کو کسی نے پکڑ کر باندھ لیا ہو گا (کیوں کہ یہ بکرے اسپیشل اور انعامی تھے)، اور اب اس کے لوٹ آنے کی کوئی صورت نہیں۔ مجھے اس کے کھو جانے پر بہت فکر تھی۔ جب بھابی اور بچّے لاہور سے آئیں گے تو میں ان کو کیا منھ دکھاؤں گا کہ ہم بکروں کی رکھوالی نہ کر سکے۔ میں نے بکرے کے کھوئے جانے کا قصوروار جوڈی کو ٹھہرایا۔ یہ سب اُس کی غفلت اور فرض ناشناسی کی وجہ سے ہوا۔ میں نے غصّے میں آ کر اپنی چھڑی لی جس سے میں جوڈی کا دوسرے کتّوں سے بچاو کیا کرتا تھا، اور اس سے اُسے خوب پیٹا۔ میں بہت غصّے میں تھا۔ بے چارے جوڈی کو کیا پتا کہ اسے کیوں پیٹا جا رہا ہے۔ اسے غالباً یہ علم نہ تھا کہ اسے بکرے کی محافظت کے فرض میں کوتاہی کی سزا دی جا رہی ہے۔ پہلے وہ حیران ہوا اور اس کی آنکھیں یہ کہتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں: "دیکھو تم کیا کر رہے ہو!" وہ مار کھتا رہا۔ میرے سر پر بھی بھوت سوار تھا۔ اب میں سوچتا ہوں کہ شاید میں اپنی مایوسیوں اور شکستوں کا غصّہ بے چارے کتّے پر اتار رہا تھا۔ اس کہاوت میں بڑی صداقت ہے کہ کم زور آدمی کا پارہ بہت جلدی چڑھتا ہے، اور شاید ہم میں سے بہت سوں کے اندر ایک مارکی دَساد (Marquis de Sade) چھپا ہوتا ہے جسے ایذارسانی سے ایک گونہ راحت نصیب ہوتی ہے۔ بے دردی اور اذیّت رسانی کے اس بدنما جذبے سے میں ایک مدّت سے آگاہ ہوں۔

جوڈی مار کھا کر ٹیاؤں ٹیاؤں کرتا پھاٹک سے باہر نکل گیا۔ میں نے باہر جا کر دیکھا مگر اس کا دور دور تک پتا نہ تھا۔ "یہ بدبخت کہاں چلا گیا!" میں نے اپنے آپ سے کہا۔ اس کے خلاف میرا غصّہ اب ٹھنڈا پڑنے لگا تھا۔ مجھے احساس ہوا کہ بکرے کے گم ہونے میں جوڈی کا اتنا قصور نہ تھا۔ گھنٹا گزر گیا، دو گھنٹے گزر گئے، جوڈی نہ لوٹا اور میں سوچنے لگا شاید وہ اب کبھی واپس نہیں آئے گا۔ کچھ اَور وقت گزرنے پر میں فی الواقع اس کے بارے میں فکرمند ہو گیا۔ آخر اُس کو ہوا کیا؟ میں نے منظوراں مائی سے کہا کہ جوڈی ناراض ہو کر چلا گیا ہے اور اب

کہیں بھی نہیں ہے۔ اس نے کہا: "پتا نہیں جی کہاں گیا ہے۔ میں جوڈی کو گول لاؤں (تلاش کر لاؤں)؟" وہ برقع اوڑھ کر شادی خاں کو گود میں لیے جوڈی کی کھوج میں گئی۔ جب آدھ گھنٹے بعد واپس آئی تو اس نے بتایا کہ جوڈی سینٹرل لائبریری کے میدان میں کتّوں کے ساتھ کھیل رہا ہے۔ منظوراں نے جوڈی کو ساتھ لے آنے کی کوشش کی تھی مگر جوڈی نے اس کی بات نہ سنی اور اسے دیکھ کر پرے بھاگ گیا۔ "وہ نہیں آتا جی۔ اب کیا کریں جی؟" میں سوچنے لگا کہ جوڈی کو کیا ہوا، کیا اُس کا دماغ چل گیا ہے؟ اس نے اپنی خاندانی شرافت کو بُھلا کر پرول کتّوں کی صحبت میں پناہ ڈھونڈی تھی، اور ان سے دوستی استوار کر کے ان کے ساتھ گھوم پھر رہا تھا۔ میں ہکّا بکّا رہ گیا اور چھڑی ہاتھ میں لے کر میدان میں پہنچا۔ میں نے اسے آواز دی: "جوڈی! جوڈی، کم آن!" اس نے مجھے دیکھا، میرے ہاتھ میں چھڑی دیکھی، اور آنے سے قطعی انکار کر دیا۔ میں سمجھ گیا کہ اسے منا کر ساتھ لے جانے کی کوشش فضول ہے۔ میں واپس آ گیا۔ منظوراں مائی کے مطابق جوڈی شام کو سورج ڈوبنے سے پہلے گھر واپس آ گیا تھا، مگر اس نے اپنے آپ کو میری نظروں سے اوجھل رکھا ہو گا کیوں کہ میں نے اسے دوسرے دن دوپہر کو دیکھا۔ وہ چھلّا سا بنا ہوا، سر اگلی ٹانگوں پر دھرے، بے حد ملول، برآمدے میں لیٹا تھا۔ خوف اب تک اُس کی آنکھوں میں تھا اور اس نے مجھے اس طرح دیکھا جیسے ہم اجنبی ہوں۔ میں نے اُسے سر پر تھپکا۔ ایک ہلکی سی سرسراہٹ ہوئی، مگر اس نے جواب میں میرے ہاتھ کو چاٹنے کے لیے گردن بینگی نہ کی۔ جوڈی کا چہرہ پتھر تھا۔ ہم اب بیگانے تھے۔ بھروسا اور رفاقت اب گزری بات تھی۔ اس کی جگہ عدم اعتماد اور غیریت نے لے لی تھی۔ میں نے جان لیا کہ میرے اور جوڈی کے تعلقات اب پہلے کے سے کبھی نہیں ہوں گے۔

اب جوڈی کی زندگی میں ایک نیا دور آیا۔ وہ مجھے ڈر اور نفرت اور انتہائی بدگمانی کے ساتھ دیکھنے لگا۔ اب نہ تو وہ مجھے پھاٹک تک چھوڑنے آتا اور نہ ہی کوٹھی کے احاطے میں داخل ہونے والے کتّوں سے غرض رکھتا۔

انھیں دنوں میرے بھائی کے بچے آ گئے، اور مجھے دو تین مہینوں کے لیے کراچی جانا پڑا۔ جب میں لوٹا تو جوڈی بدستور بیمار اور کم زور تھا۔ اس نے مجھے بے تعلّقی اور شاید خوف سے دیکھا: اس کی آنکھوں میں میرے لیے کوئی خوش آمدید نہ تھی۔ ہمارے تعلقات پھر پہلی ڈگر پر کبھی نہ آ سکے۔ میں نے بھی اُسے تھپکنا اور بلانا چھوڑ دیا اور وہ بھی مجھ سے لاتعلّق ہو گیا۔

پھر میں کچھ مدّت کے لیے لاہور اپنے ایک زین بدھسٹ دوست کے پاس ٹھہرنے چلا گیا اور جب لوٹا تو جوڈی میں ایک خوش گوار تبدیلی دیکھی۔ اس کا بدن بھر چکا تھا اور پسلیاں نظر نہیں آتی تھیں —۔ شاید پُراسرار عارضے نے اسے چھوڑ دیا تھا۔ میرے پیٹھ تھپتھپانے پر نہ تو اس نے دوستی کا اظہار کیا اور نہ ہی خوف سے سمٹا۔ وہ ہماری پرانی لاگ کو بھولا نہ تھا۔ گل شیر نے مجھے بتایا کہ اس کی حالت خود بخود ہی "زروئی" ہوتی گئی اور اب وہ بھلا چنگا ہے۔

میں نے نوٹ کیا کہ کتوں کے اندر آنے پر وہ واویلا نہ کرتا مگر ان سے زیادہ دوستی بھی نہ کرتا۔ بہت کم کتے البتہ اب کوٹھی کے اندر آتے۔ ساری مدّت میں مَیں نے دو ہی دیکھے۔ ایک تو لال تھوتھنی والی مفلوک الحال جھبری کتیا تھی۔ اس کی پوستین کا رنگ گدلا سفید تھا۔ میں اسے اکثر بھگاتا رہتا تھا کیوں کہ وہ مجھے ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ وہ کوٹھی کو کچھ کچھ اپنا گھر سمجھتی تھی۔ کھیت میں سونگھتی پھرتی یا راستے پر پڑی رہتی۔ میں نے جوڈی کو کبھی اُس کے پاس جا کر لاڈ کرتے نہیں دیکھا۔ ممکن ہے اُس کے دل میں جوڈی کے لیے چاہت ہو اور وہ وقتاً فوقتاً اسے دیکھنے کے لیے آ جاتی ہو۔ دوسرا ملاقاتی ایک چھوٹے قد کا سفید کتا تھا، مگر وہ کبھی کبھار ہی آتا تھا۔ ظاہرا جوڈی کے پہلے دوستوں نے اسے چھوڑ دیا تھا۔ وہ بھی ان سے دوبارہ آشنائی پیدا کرنے کی خواہش نہیں رکھتا تھا۔ وہ اب پھاٹک سے باہر کبھی نہ جاتا، اور اگر جاتا بھی تو حوائجِ ضروری سے فارغ ہونے کی خاطر۔ وہ یہ کام گھر کے اندر کبھی نہیں کرتا تھا، جوڈی میں اتنی سمجھ تھی۔ خدا جانے یہ خوش سلیقگی اس نے کس سے سیکھی تھی۔

جوڈی اب پرانا عناد بھول کر مجھ سے مانوس سا ہونے لگا ہے اور میرا خیال ہے کہ اس نے مجھے تقریباً معاف کر دیا ہے۔ ہو سکتا ہے میرے متعلق اس کے چند وسوسے اور شکوک ابھی پوری طرح اس کے شعور سے نہ نکلے ہوں۔ میں لان میں بیٹھا سرما کی دھوپ میں ایک ناول پڑھ رہا تھا۔ جوڈی مجھ سے کچھ فاصلے پر پہلو کے بل لیٹا تھا۔ پھر وہ اٹھ بیٹھا اور پچھلے بائیں پاؤں سے اپنا پیٹ اور سر زور زور سے کھجانے لگا جیسا کہ وہ اُن دنوں اکثر کرتا رہتا تھا۔ (وہ نہانے کا زیادہ قائل نہیں اور پانی سے الرجک ہے۔) اس حالت میں وہ مجھے بڑا تماشا سا لگا اور میرا دل اسے پیار کرنے کو چاہا۔ میں نے اسے بلایا: "کم آن، جوڈی!" (جوڈی انگریزی زبان بخوبی سمجھتا ہے مگر اردو کا ایک لفظ بھی نہیں جانتا۔) وہ کھجانا بند کر کے اصالت سے میرے پاس آ گیا، مگر پُراشتیاق مستعدی سے نہیں۔ میں نے اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا اور سر کو سہلایا۔ وہ اپنا سر میرے بوٹوں میں گھسیڑ کر ان کو چبانے کی کوشش کرنے لگا۔ میرے دل

میں دھک سی ہوئی -- اب پہلی محبت میں سے کچھ حصہ لوٹ آیا تھا اور ہم کسی قدر دوست ہو گئے تھے۔ اتنے میں میلی بوسیدہ وردی والی کتیا پھاٹک کے نیچے سے گزر کر اندر آئی۔ میں نے اس کی طرف اشارہ کر کے جوڈی سے کہا: "جوڈی، گیٹ ہر!" (جوڈی، اسے بھگاؤ!) جوڈی نے میری بات پوری طرح سمجھ لی مگر نہ تو کتیا کی طرف جنبش کی اور نہ بھونکنا مناسب سمجھا۔ میں نے اسے کان سے پکڑ کر ذرا کڑک دار آواز میں پھر کہا: "جوڈی، آئی سے گیٹ ہر!" اور میں نے دیکھا کہ خوف پھر اس کی آنکھوں میں لہرایا اور وہ سمٹ سا گیا۔ اس نے خیال کیا ہو گا کہ میں اسے اس نافرمانی کی پہلے کی طرح سزا دوں گا۔ میں نے اس کا خوف دور کرنے کے لیے اس کی پیٹھ ٹھونکی۔

چند دن ہوئے مجھے بھابی اور بھتیجی سے جوڈی کی اصل عمر کا پتا چلا اور میں نے جان کر متعجب ہوا کہ اپنے قد کاٹھ کے باوجود جوڈی نے ابھی اپنے بچپن کو پار نہیں کیا تھا۔ میں نے جوڈی کو دیکھتے ہوئے بھابی سے پوچھا: "جوڈی کی عمر کیا ہو گی؟" وہ سوچ کر اور حساب لگا کر کہنے لگیں: "ہمارے پاس جب آیا تو نومولود تھا۔ ایک سال تو ہمارے پاس رحیم یار خاں میں رہا، اور پھر دو سال ہمیں یہاں بہاولپور میں ہو گئے ہیں۔ اس طرح جوڈی تین سال سے زیادہ عمر کا نہیں ہو سکتا۔" حالاں کہ میں نے ہمیشہ جوڈی کو ایک سیانا بالغ کتا سمجھا تھا اور اسی طور پر اس سے برتاو کیا تھا۔ میں سوچ میں پڑ گیا کہ کتے کی نارمل عمر کیا ہوتی ہو گی، کتنے برس میں وہ جوان ہوتا ہے۔ میں نے کئی لوگوں سے پوچھا۔ ایک نے کہا کہ کتے کی اوسط عمر اٹھارہ سال ہوتی ہے، دوسرے نے کہا تیس سال۔ کسی کو پورے طور پر یقین نہ تھا۔ پھر میں نے "بک آف نالج" میں ڈھونڈ کر پتا لگایا کہ کتے کی اوسط عمر چالیس سال ہوتی ہے۔ آدمی کی طبعی عمر اگر اسی برس پر رکھیں تو اس حساب سے ایک "آدمی سال" کے دو "کتا سال" بنتے ہیں۔ آدمی اگر سولہ برس کی عمر میں بلوغت کو پہنچتا ہے تو کتا آٹھ سال کا ہونے پر عنفوان شباب میں ہو گا۔ اور جوڈی کی عمر تو ابھی بمشکل تین "کتا سال" یا چھ "آدمی سال" ہے، یعنی مکتب میں داخل ہونے کی عمر۔ جوڈی کے جوان ہونے میں ابھی پانچ برس اور پڑے ہیں۔ جوڈی کی قدوقامت اور وقار دیکھ کر میں "بک آف نالج" کی معلومات اور اپنے حساب کے بارے میں الجھن میں پڑ جاتا ہوں (مجھے وہ بالکل بالغ لگتا ہے)، اور ہندی کی چندی کرنے کے لیے میں اپنے زین بدھسٹ دوست کو خط لکھنے کا ارادہ رکھتا ہوں جس نے ایک السیشین کتا بارہ سال اپنے ساتھ رکھا اور جس کا اب السیشین یا کسی دوسری نسل کے کتوں سے کوئی واسطہ نہیں۔ ہاں،

چغتائی کے پاس بھی تو ایک السیشیئن کتیا ہے؛ اس سے پوچھوں گا۔ بعد از آں، پچھلے دنوں میرا زین بدھسٹ دوست لاہور سے آیا تو میں نے اس سے پوچھا کہ السیشیئن کتّے کی نارمل زندگی کتنی ہوتی ہے۔ اس نے اپنے تجربے کی روشنی میں بتایا کہ ہماری آب و ہوا میں دس بارہ سال سے زیادہ نہیں۔ اس نے مجھے یقین دلایا کہ کتّے سترہ اٹھارہ سال سے زیادہ زندگی نہیں پاتے، اور یہ کہ میری کتاب میں درج کتّے کی عمر صحیح نہیں ہو سکتی۔ میرے دوست کے کہنے کے مطابق انسانی زندگی کے چھ برس کتّے کی زندگی کے ایک برس کے برابر بنے۔ جوڈی اب تین "کتا سال" کی عمر کا ہے، گویا اٹھارہ "آدمی سال" کا، یعنی عین عنفوانِ شباب میں۔ اس کے کھیلنے کھانے کے دن ہیں مگر وہ مزاجاً افسردہ اور خاموش طبع کتا ہے۔ اس کی طبیعت میں ہنگامہ خیزی نہیں، لیکن چند روز ہوئے جب میں رات کے بارہ بجے کسی کھانے سے لوٹا تو میں نے اس کے ساتھ دو کتیاں دیکھیں۔ ایک تو وہی بوسیدہ پوستین والی تھی اور دوسری کھڑے بادامی کانوں والی چُست سی کتیا۔ جوڈی بھونکتا، اچھلتا کودتا، مجھ پر سو جان سے نثار ہوتا، مجھے پھاٹک سے میرے کمرے تک چھوڑ گیا۔ مجھے اندر سلامت اور محفوظ چھوڑ کر وہ پھر اپنی دوست کتیوں کے پاس جا پہنچا۔ میں نے سوچا کہ جوڈی محض زاہدِ خشک نہیں؛ اسے جنسِ لطیف میں دلچسپی پیدا ہو رہی ہے اور اس عمر میں ہونی بھی چاہیے۔ میں ان معاملات میں اتنا پُروڈ (prude) نہیں رہا جتنا کہ کبھی تھا۔

o o o

جوڈی کا یہ مرقّع مکمل کیے مجھے چار ہی روز ہوئے تھے کہ جوڈی مر گیا۔ وہ بڑے پُراسرار حالات میں مرا اور میں سمجھتا ہوں کہ اسے زہر دیا گیا تھا۔ دو دن صبح کے وقت باہر جاتے ہوئے میں نے اسے برآمدے میں دیوار کے ساتھ اپنی مقررہ جگہ پر لیٹے ہوئے نہ دیکھا مگر اس کے نہ ہونے پر کوئی دھیان نہ دیا۔ اگلے دن دوپہر کے وقت میں اپنے کمرے میں بیٹھا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا کہ گیلری میں میرے بھتیجے بل کی آواز آئی کہ جوڈی سخت بیمار ہو گیا ہے۔ اتنے میں مائی منظوراں بھی خبر سنانے میرے کمرے میں آئی۔ "صاب جی، وہ ساڈا جوڈی ہے نا، وہ شہدا بڑا بیمار ہے۔ کوئی بلا اسے چمٹ گئی ہے۔ اسے خون کی الٹیاں اور دست لگے ہیں۔ فیر جی ہُن کیا کریے؟" اس نے میری طرف توقع سے دیکھا جیسے میں جوڈی کو بچانے کے لیے کچھ کروں گا۔ میرے دل کو ایک دھچکا سا لگا مگر میں فوراً جوڈی کو دیکھنے نہ گیا کیوں کہ میرا خیال تھا کہ جوڈی اپنی بیماری پر غالب آجائے گا۔ بھلا جوڈی کیسے مر سکتا ہے؟

لڑکے خواہ مخواہ فکرمند ہو رہے ہیں۔ پھر چھوٹا شادی خاں آیا، بے حد مضطرب اور چھوٹی آنکھیں پھیلی ہوئی۔ "صاب!" اس نے کہا۔ "تیکوں پتا انے ساڈا جوڈی مردا پیا ہے۔ بچارے تے مکھیاں باندیاں پیاں ہن۔ چل جوڈی کوں ڈیکھ!" میں اٹھا اور شادی خاں کی انگلی پکڑ کر جوڈی کو دیکھنے چل پڑا۔ گیلری میں لڑکوں کے ٹیپ کی آواز آ رہی تھی۔ وہ جوڈی کے مرنے کا انتظار کر رہے تھے۔ میں نے اپنے بھتیجے ببل سے کہا کہ وہ جوڈی کو گاڑی میں ڈال کر وٹرنری ڈاکٹر کے پاس لے جائے۔ اس نے کہا کہ جوڈی کو منھ سے خون آنے اور دستوں کی تکلیف ہے، اسے اسپتال نہیں لے جایا جا سکتا۔ اندر کے برآمدے میں جوڈی کچن کی دیوار کے پاس لیٹا تھا —۔ بے سُدھ، تھوتھنی پر خون جما ہوا اور نچلا دھڑ ایک پرانے کمبل میں لپٹا ہوا۔ بے شمار مکھیاں اس کے اوپر بھنبھنا رہی تھیں۔ اُس کی کرنجی نیلی آنکھیں موت دیکھ رہی تھیں۔

میں اس کے پاس گیا اور اس کا سر سہلایا۔ اس کے جسم میں کوئی حرکت پیدا نہ ہوئی۔ اس کی آنکھیں بے حد نیلی پڑ گئی تھیں اور ان میں بے بسی اور بے پروائی تھی۔ دودھ کا پیالہ اس کے پاس جوں کا توں پڑا تھا۔ وہ بہت خستہ حالت میں تھا۔ شادی اور میں اسے کچھ دیر دیکھتے رہے۔ پھر میں نے ببل سے کہا: "ہمیں اس کو بچانے کے لیے کچھ تو کرنا چاہیے۔ تم موٹرسائیکل پر جا کر ویٹ کو یہاں لے آؤ۔" ببل نے کہا: "انکل، اب بہت دیر ہو چکی ہے۔ ویٹ کچھ نہیں کر سکے گا۔" پھر بھی وہ میرے اصرار پر گیا اور تھوڑی دیر بعد ویٹ کے اسسٹنٹ کو لے آیا۔ یہ شلوار قمیص میں ملبوس، افسرانہ برتری جتانے والا ایک نوجوان تھا جو اسسٹنٹ کا بھی اسسٹنٹ لگتا تھا۔ اس نے جوڈی کو دیکھا، اسے ٹٹولا، اور بولا: "اسے بہت تیز بخار ہے۔" پھر اس نے پوچھا: "یہ کوٹھی سے باہر تو نہیں چلا جاتا تھا؟" میں نے جواب دیا: "بس کبھی کبھی پھاٹک کے باہر چلا جاتا تھا۔" کچھ دیر اَور جوڈی کو دیکھنے کے بعد اس نے کہا: "یہ زندہ نہیں بچے گا۔ اس کی زندگی بس دو تین گھنٹے باقی ہے۔" یہ ایک ایسی خبر تھی جسے شاید ہم پہلے ہی جانتے تھے۔ ببل اسے اپنی موٹرسائیکل پر اسپتال چھوڑنے اور وہاں سے کوئی دوا لینے چلا گیا۔ میں نے جوڈی کو یہ جانتے ہوئے کہ اب موت اس سے زیادہ دور نہیں، آخری بار دیکھا اور مائی منظوراں کو وہاں بیٹھا چھوڑ کر چلا آیا۔ وہ چارپائی پر اکڑوں چڑھی بیٹھی، ہاتھ ٹھوڑی پر رکھے، جوڈی کو مرتا دیکھتی ہوئی کوئی جادوگرنی لگتی تھی۔ دس منٹ بعد ببل کی موٹرسائیکل کے لوٹنے کی پھٹ پھٹ سنائی دی اور پھر ایک لڑکے نے دوسرے سے کہا کہ

کسی گیراج میں سے لے آؤ۔ کسی کی آخر کیا ضرورت پیش آ گئی؟ ہو گا، لڑکے ہمیشہ کچھ نہ کچھ کرتے رہتے ہیں۔ ویٹ کے اسسٹنٹ نے جوڈی کو تین گھنٹے کا وقت دیا تھا، اس لیے مجھے یہ خیال نہ آیا کہ جوڈی ختم ہو چکا ہے اور کسی اس کی قبر کھودنے کے لیے درکار ہے۔ آدھ گھنٹے بعد جب میں نے ببل سے ویٹ کی دوا کے بارے میں پوچھا تو مجھے بتایا گیا کہ انھوں نے سبزی کے کھیت سے پرے گڑھا کھود کر جوڈی کو دفن بھی کر دیا ہے۔ اداسی سی میرے اوپر چھا گئی۔ سو جوڈی دیکھتے ہی دیکھتے ہم سے دور چلا گیا تھا، اور اب ہم اس سنجیدہ اور پُروقار کتے کو کبھی نہ دیکھ سکیں گے۔۔۔ پھر میں نے اس کی موت کو قبول کر لیا جس طرح ہم کسی دیرینہ رفیق کی ابدی جدائی کو قبول کر لیتے ہیں۔ سوچا جائے تو کتے اور آدمی کی زندگی میں کوئی فرق نہیں۔ موت ہر زندگی کا انجام ہے۔

جوڈی کو مرے دو دن ہوئے تھے۔ چھوٹا شادی خاں اور میں ناشتہ کر رہے تھے کہ شادی نے کہا: "صاب! ہمارا کتا مر گیا ہے۔ ہمارا پکا دوست تھا۔ پہلے مجھے چک مارتا تھا، پھر دوست ہو گیا۔ تیرا نہیں، میرا دوست! میں اسے بلاتا تھا تو آجاتا تھا، پھر مجھ کو پیار کرتا تھا۔"

"ہاں، جوڈی اچھا کتا تھا،" میں نے کہا۔

تھوڑی دیر کے بعد شادی چمچ سے چائے میں بھگوئی ہوئی ڈبل روٹی کھاتے ہوئے بولا: "صاب! تو بڈھا تھیندا او سندیں۔ میں بڈھا نہیں ہو رہا!"

"ہاں شادی، میں بڈھا ہو رہا ہوں اور پھر مر جاؤں گا جیسے ہمارا جوڈی مر گیا۔"

"وہ کوئی بات نہیں،" شادی نے مجھے تسلی دی۔ "پھر ہم تم کو جوڈی کی طرح پُور دیں گے (دفن کر دیں گے)۔"

"تم مجھے یاد نہیں کرو گے شادی؟"

"پھر تو مر جائے گا تو میں تیرے دراز سے سب پیسے بھی لے جاؤں گا،" شادی نے معاملے کے مثبت پہلو پر غور کرتے ہوئے کہا۔ "پھر صاب! تو مجھے منع بھی نہیں کر سکے گا!"

افضال احمد سیّد

کون کیا دیکھنا چاہتا ہے

وِنڈی ڈی
حَشرات کے خلاف ہماری جنگ
اپنے تماش بینوں کے لیے محفوظ کرنا چاہتی ہیں
(اُنھیں اس بات کے پیسے ملیں گے)

اُن کی خوش قسمتی سے
ہم اس وقت ٹڈی دَل کی زد میں ہیں

اِس بار گرمیوں میں
وہ
ایپانیما یا کویاکابانا جانے کا منصوبہ
ترک کر چکی ہیں
اور اس فکر سے آزاد ہیں کہ
آلٹی مَیٹ بِکینی کیا ہے

خوراک، لباس اور ممکنہ خطرات کے
پرنٹ آؤٹ کے ساتھ

وہ ہماری سائیکاڈیلک دھوپ میں
آنا چاہتی ہیں

ڈاکٹر ڈی
اپنے دانت سفید کرنے کے لیے
بیکنگ سوڈا نہیں استعمال کرتیں
اور انھیں
فرانسیسی مینی کیور سے دل چسپی نہیں ہے
(یہ کافی مہنگا عمل ہے)

اُنھیں ٹڈی دل سے دل چسپی ہے
جس کا ذکر خدا، پاؤسانیاس اور پلینی کر چکے ہیں
وہ
اٹروسکن شہنشاہوں کے مقام سے
ہمیں ایرنا میں شکست کھاتے دیکھنا چاہتی ہیں

ہم چاہتے ہیں
وِنڈی
فارفارا تخلص کر لے
اپنے بدن کے کسی حصے کو (عارضی یا مستقل طور پر) گدوائے
اور
ایک مووی میں بیڈروم سِین کرے
جو ہم قریب ترین وِڈیو لائبریری سے
حاصل کر سکیں

افتخار جالب

محبّت کے شاداب پھول

وٹگنسٹائین کے بارے میں یہ کتاب
ایک لڑکی نے اپنے محبوب کو تحفے میں دی تھی
اس امّید کے ساتھ کہ
اُس کی کتابوں کی شیلف میں
کوئی جگہ پا سکے
اس لاتعلّق سی خواہش کو
جگہ ملی بھی تو
فُٹ پاتھ پر، ایک کباڑیے کے یہاں
کوئی دیکھ بھی نہیں رہا تھا

دھڑکتے دل نے
کسی کو بھی معلوم نہیں
کیا چاہا تھا
بڑبڑا کر ہم نے اپنی شیلف میں رکھی
اور بھول گئے: محبّت کے شاداب پھول
کتابوں میں رکھنے کے بعد عمریں بیت جاتی ہیں
اچانک آرزو، دیوانگی اور زبان کی پتّیاں

بکھرنے لگتی ہیں: دیوانوں پر بھاری!
ایک نئی دنیا کی خلقت کا لمحہ لاتی ہے
وِٹگنسٹائین کے بارے میں یہ کتاب

لفظوں کے جہانوں میں

عمر بھر چاہا کہ جاناں، تری قربت کا زمانہ کبھی معدوم نہ ہو
روز و شب لفظوں کی دنیاؤں میں گھومیں ناچیں
بے تحاشا، کسی لمحے کو سکوت آ جائے
تم کہو: یہ بھی کوئی جینے کی مجبوری ہے
-- لفظ کہتے ہیں، بیاں کھوتے ہیں
-- معذوری میں جاں دیتے ہیں
جانِ جاں، ایسی ہی بے‌زاری میں روشن ہے سکوت
جس میں لفظوں سے بڑی کوئی بھی ناداری نہیں
وقت آتا ہے، تری قربتیں چھِن جاتی ہیں
جاناں، دیکھو، رات کی دُھند میں، محراب سے چاند اُبھرا ہے
تو نے ہر دشت کے چو گرد گل لالہ کی بیلیں کاڑھیں -- پھول بکھرائے
مگر دشت کا مرکز کسی محراب سے کیا دشت نہیں رہتا ہے
جان یہ مرکزِ جاں، چاہتے ہیں تا بہ ابد خاک بسَر پھول نہ بننے پائے
عمر بھر روشن و شاداب رہے، دل کی خبر کس کو، رہے یا نہ رہے
جانِ جہاں، لفظوں کے جہانوں میں دھما چوکڑی ہے: کچھ ہی کہو، جان چلی جاتی ہے

اب چو گرد فریم میں

کیمرے کے لاتعلق فریم نے اُسے اپنی گرفت میں لے لیا
اسے معلوم ہی نہیں تھا کہ وہ کس حال میں ہے
برسوں بعد اُس کی آنکھ کھُلی
موسم بدل چکا تھا
برسی ہوئی بدلی افق کو چھُونے لگی تھی
ایڈانفنے ٹم بے ترتیبی سے ایک فریم مرتب ہوتا تھا
گم گشتہ ذات میں گم دیوانگیوں میں اپنا آپ!
گھونگٹ کے پٹ کھول، تیرے پیا ملن گھر آئے!
جب رَس کا پیالہ پی سنگ پی بے حال ہوے تھے، بات کچھ اور تھی
اب کیا ہو، موسم کے تیور دوسرے ہیں
ہوش و حواس کو کھو کر بدن بدن سے نہانے پر آمادہ نہیں
خواب و خیال بے سرشاری کی آز خودر فتگی کا لافانی پھٹاپُرانا پن
بے زاری کی آشفتہ سیمن جان کا ریشمی ایندھن اُجڑ گیا
اب چو گرد فریم میں یکتائی کے اکیلے پن کی نسیجیں پھٹنے لگی ہیں
کوائٹس انٹرپٹس، وصلِ رخنہ پذیر فتہ شدہ شُدھ تیور کا تصادم:
نسیجیں پھٹنے لگی ہیں
ہوس اور لذّت کی ہم بستریوں میں نادم انسان کا فریم شدہ ہمہمہ برہم:
نسیجیں پھٹنے لگی ہیں
فریم فریم ہے: اپنے سبھاو میں اپنے خون خرابے کی بندش:
نسیجیں پھٹنے لگی ہیں

محرابوں کے اندر

ہمیں معلوم ہے رنگِ چمن سے
قسمتیں کھلتی ہیں
متن کے رو برو آنکھیں
اچانک اوٹ سے تکتی نگاہوں کو اُچک لیتی ہیں
مقدر، ایسی دُزدیدہ نگاہی سے سنور جاتے ہیں
ہم خوابوں میں گُھل جاتے ہیں
متن کے رو برو رکھے متن کا ترجمہ کرتے
خدا سی آرزو رکھتے
مقدر کے چھپے لفظوں کو پڑھ لیتے
خدائے نارسائی کو رسائی سے بدل دیتے
ترے ہاتھوں کو چھو لیتے
یہ ہوتا بھی تو کیوں کر
اتنی محرابوں ہی محرابوں کے اندر
ترے لفظوں کی تجریدی مہک سے آشنا جملے
مری تکتی نگاہوں کے تعاقب میں جھلک جاتے
میں کیا کہتا
ترے پیچھے درختوں کی قطاروں میں گھرا دریا افق تک پھیلتا جاتا

کون ہو، آؤ

وہ ہنستی ہے
اس کی نگاہوں میں قوسِ قزح کی جھلک بستی ہے
آنکھیں جھپکتی مدھ مستی کا جوبن آپ ہی آپ جھمکتا ہے

من پگلا مدھ ماتی جوانی کی رنگ رلیوں کے ساتھ تھر کتا ہے
اس کی آنکھ کی راس میں رچتا ہے، ازخود ہنستا ہے
آنکھیں چوم کے دیکھتا ہے، ان ناچتی آنکھوں کے
ڈوب اُبھرتے جیون کے افسون بطون میں!
تو ایسے بھی ننگ دھڑنگ نہ دیکھو
ہم شرمیلی محبتوں کی دیوار کی درز سے جھانکنے والے
اپنی کمینگیوں پہ چمکتے پردوں کی اوٹ میں جیوں جوت جگاتے
خوش فہمی کو عشقیہ جہل سمیت جھلاتے ہیں
خوب اپنے آپ کو پاتے ہیں، کیا خوش ہیں
انھیں کوئی ٹیڑھی بات قبول نہیں ہوتی
خود اپنے دل کے نہاں خانوں میں کمینگیوں کی وحشی دستک ہوتی ہے
وہ کہتی ہے: کون ہو، آؤ، کیا دروازہ ہی توڑ دو گے
اچھا تم، نہیں آپ ہیں؟
وہ ہنستی ہے۔ اس کی ناچتی آنکھوں میں
قوسِ قزح کی جھلک بستی ہے

لغو لفظیات

قدیم زبان نے پون صدی میں باشویک محاورہ نگل لیا
انقلاب نے، پرائیویٹ پراپرٹی زیرِ تصرف لاتے لاتے
عورت کی زندانی حقیقت کو خاکم بدہن، تسلیم و رضا کا معجزہ جانا
مجھے یاد ہے، گرانٹا کے سروے میں ایک کمیسار نے کہا تھا:
ہماری عورتیں مغرب کی نام نہاد آزاد خواتین سے زیادہ خوش ہیں
اُن کے یہاں مسائل کی یہ لغو لفظیات ہی نہیں
کہنے کو یہ بات ہے، لیکن مردانا ے ذات کا پرتو دیکھیے

سب کچھ ہوتا چلا جاتا ہے
اس کے حق میں
اس کے خلاف بھی
ایک قدیم حکومتی لہجے میں
لیکن میرے ساتھ ہی بیٹھے بیٹھے اُس نے اپنے بال سنوارے
بدن کی خوشبو پھوٹ پھوٹ کر والہانہ پن سے بہنے لگی
وائیڈ اسکرین پہ کپڑے اتار کے ٹینگو ڈانس کی خواہش مند مٹیار کو دیکھا
ان کے کلچر کی آزادی ہے
وہ کہتی ہے: سارے صیغے مذکر ہیں
ہنستی ہنستا، کرتی کرتا کی تخصیص نہیں ہو پاتی
سن جاناں، تیری ذات میں مردوا بول بچن ہے
سن جاناں، تیری طرزِ سخن بھی ہماری ہے

خالص معجزہ

خالص معجزے
ایک گونہ بے اعتنائی سے
رونما ہوتے ہیں
بسا اوقات پتا ہی نہیں چلتا
کسی مرحلے پر
تمھاری آنکھوں سے جھلکتی شکووں بھری اکتاہٹ سے
اچانک افق جھمکنے لگتا ہے: دلوں کی دوریاں سمیٹتے ہوئے
آواز آتی ہے: لگتا ہے، بلاوا آیا ہے ---
سمندر کا نہیں، بے مایگی کا
جاناں، دال دپال سے روکھی سوکھی کھانا اچھا لگتا ہے

آنکھ کے گوشے سے آنکھ کا گوشہ ملا کر سُدھ بُدھ کھونا اچھا لگتا ہے
ہر اک چیز سے غافل ہو کر پڑے پڑے رہ جانا اچھا لگتا ہے
سبھی کچھ اچھا لگتا ہے، تری برکت سے
سن جاناں، سب اچھا ہے
بھائی لوگ خبر نہیں کیا کھوت ہیں
مافوق الفطرتی شطرطی بھمبھک بھوں
ہللویاریح واہ وا، ریح ریح واہ وا

دُھند دماغ

کوئی بھید کی بات ضرور ہے: معنی و لفظ کا ربط مرتب ہو نہیں پاتا
ایک اُجاڑ پہاڑ سی خامشی چھائی ہوئی ہے: دُھند دماغ
اُگل نگل نہیں پا سکتے اس سکتہ سکوت کو جاناں کے ہوتے سوتے!
بے بس، حرفِ تمنا کی آس میں رسوا
پردہ تو بے شک ہوتا ہی ہے -- بے پردگیوں کی دُھول میں لپٹا
ہاتھ سے چُھٹ چُھٹ جاتا کہ گویا تم ہی ہمارا جامہ ہو
کیوں بھولے سمائیں: ننگ دھڑنگ کی انگنائی میں ناچتے ناچتے
پھٹ جائیں گے، بس میں رہیں: یہ مقام نہیں!
سن جاناں، کیا ذات کو بات میں گھول گھمانا ہی مقصد ہے؟
ہم آنکھوں سے راستا پوچھتے ہیں
کوئی راستا آنکھوں کو چومتا بجھ بجھ جاتا ہے
یا گل بات کا دامن چھوٹتے چھوٹتے چھوٹ چلا
بس مَن جاؤ، کوئی بات کرو
اس سادہ سی چپ سے پہاڑ بھی ریزہ ریزہ ہو سکتے ہیں

ثقافتی متن

پروفیسر ہی توشی اِگاراشی کی موت ترجمے کے کارن نہیں ہوئی
وہ سمورائی روایت کا سپوت تھا
مرتے مرتے بھی خنجر کے چند وار کر ہی گیا
متن سے یُدھ کے باعث آج تک کسی کی موت واقع نہیں ہوئی
اُسے ہی مرنا تھا کہ مقابلے کے باوجود کھیت رہا
رُوسو کو کی محبت کیسی تھی، یہ کوئی ہی توشی اِگاراشی سے پوچھے
ورنہ ترجمے میں ایسی کون سی بات ہے
جیسا بھی ہوتا ہے چل جاتا ہے
معاملہ تو اصل عبارت کا ہوتا ہے
زمانے کی اصل کی نسل مار کے رکھ دی ہے
اب تو استنباط ہے، نقل ہے، ترجمہ ہے، تفسیر ہے
وہ سب کچھ جس کے روپ بہروپ میں جیون ہے، جیوہتیا نہیں
عین مصاحبت کے درمیان اُس نے کہا: تم بہت بدل گئے ہو
"ہاں، رُوسو کو، تم ٹھیک کہتی ہو، میں نے قتل کیا ہے"
جبھی تو، لگتا ہے تم جانکھیں چیر رہے ہو
"ہاں، میں نے ترجمہ کر کے ثقافتی متن کو تہ تیغ کیا، اسی کا خمیازہ---"
اے کاش ابہام بھری دستک نہ ہوتی: ہونی کے کھیل نیارے
قاتل جھپٹا تو سہی، لیکن اس کی رانیں تر تھیں
میں نے قاتل اور مقتول کو مدّت بعد تراجم میں لت پت دیکھا

باطن کی وحشت

مسز سالالانکا کی آنکھیں تو کنچے ہیں

ہت تیرے کی! وہ نکل ہی گیا، سُوت کے فاصلے سے
یہ مارا!
یہ مارا: سمندر کی نیلی رسائی کا منظر
خلاو ملا کا جلاجل
مسز سالالمانکا کا جسم برہنہ
ہمارے لیے اس میں کچھ بھی پسندیدہ خاطر نہیں
جسم ہی جسم---
خوب صورت شعاعوں کی لپٹوں سے بوجھل ہُوا
مرے تن بدن کی برانگیختہ، موج در موج
پہنائیوں سے چمٹتی ہوئی، گدگداتی ہے
جیسے ہمارے جہاں میں بدن ہی بدن کا تلذّذ ہے
باطن کی وحشت نہیں
یہ اعصاب شکنی کا سفّاک لمحہ:
ارادوں کی تصدیق کو منہدم کرنے والا!
اُڑتے گھمنڈتے عذابوں کا ہذیان آشوب مدفن ہوا چاہتا ہے---
ورق سادہ: آگاہیِ ہمد گر سے تہی دست!
جہاں، جانِ جاناں، بدن کا کرشمہ نہیں ہے: فرائڈ سے پوچھو
کہ دائم فراق اشتہائے بدن ہے
وصال اُس گھڑی ہے کہ جب دیدہ و دل کو روح و بدن کا تموّج شرابور کردے
علاوہ ازیں باہیں رانیں ہیں، گردن کو تکتے پُراسرار پستان ہیں
یہ سبھی گوشت کے لوتھڑے ہیں
رہیں اُس کی یعنی مسز سالالمانکا کی آنکھیں
خداوند، تو جانتا ہے
مسز سالالمانکا کی آنکھوں میں رونق، چمک، چُلبلاہٹ نہیں
ایک دم مُردہ پتھریلا پن ہے!

محمّد انور خالد

یہ اچھے لوگ ہیں

یہ اچھے لوگ ہیں ان سے نہ ملنا
اور ملنا بھی تو ان کی آستینیں دیکھ لینا
یہ اچھے لوگ ہیں اور بے شکن شائستگی ان کا مقدّر ہے
یہ اچھے لوگ ہیں اور بے صدا شوریدگی ان کا مقدّر ہے
ٹپکتے پانیوں کی آخری آسودگی ان کا مقدّر ہے

یہ اچھے لوگ ہیں، جب شام ہوتی ہے
تو بے آواز گلیوں کے سہارے
کُنجِ گویائی میں اپنی آگ لینے جاتے ہیں
اور راستے بھر خود کو پیغمبر سمجھتے ہیں
یہ اچھے لوگ ہیں اور آگ ان کا مسئلہ ہے

یہ اچھے لوگ ہیں، صدیوں سے ان کی مائیں کہتی آرہی ہیں
پڑوسن آگ دینا
دھواں دیتے ہوئے چولھے کی صبحیں
آنگنوں میں پھیلتے سائے
کرنجی دھوپ، بھوری آنکھ والی لڑکیوں جیسی وفانا آشنا شامیں

توے کو سینکتے، ٹھٹھرے ہوے ہاتھ
اور راتوں کی اُلجھتی سلوٹیں
جسموں کی آسودہ صلیبیں
اسپتالوں میں جنم دیتی ہوئی، مرتی ہوئی مائیں
یہ شمشانوں کی بیوائیں
کئی صدیوں سے دُہرائیں
پڑوسن آگ دینا
پڑوسن آگ خمیازہ
اِنھی رستوں کا آوازہ
اِنھی رستوں پہ چلنا اور یہی کہنا
یہ اچھے لوگ ہیں ان سے نہ ملنا اور ملنا بھی تو ان کی آستینیں دیکھ لینا

ایک اتفاقی موت کی روداد

سراسر اتفاقی موت تھی
اُس نے کہا تھا مجھ کو جانا ہے
سو وہ ایسے گیا جیسے زمیں سے گھاس جاتی ہے
سراسر اتفاقاً
پاؤں چلنے کے لیے ہوتے ہیں
اتنا تو سبھی تسلیم کرتے ہیں
تو ایسے میں اگر مٹی کی عریانی شکایت گر بھی ہو جائے
تو اس پر اور مٹی ڈالتے ہیں
سو ہم نے ڈال دی مٹی پہ مٹی
اتفاقاً
یہ تو ہوتا ہے

سراسر اتفاقی حادثہ تھا
اُس نے خود لکھا تھا
دنیا بیچ آنا اتفاقی امر ہے
جانا سراسر حادثاتی
تو اس پر تو عدالت نے بھی کچھ حجت نہیں کی
اُس نے خود لکھا تھا
حجت نفسیاتی عارضہ ہے
سو عدالت نے بلا تفتیش اُسے جانے دیا
جیسے زمیں سے گھاس جاتی ہے
سراسر اتفاقاً
بالعموم ایسا ہی ہوتا ہے
ہمیشہ اتفاقاً

جو یوں ہوتا تو کیا ہوتا

یہ مصدر اسمِ ماضی کا نہیں ہے
آپ کہیے تو بنا دیتے ہیں ہونے کو
جو یوں ہوتا تو کیا ہوتا
"نہ ہوتا گر جدا تن سے تو زانو پر دھرا ہوتا"

وہ تم سے ابنِ ملجم کا پتا پوچھیں تو کہنا
چار ہفتوں سے بہت مصروف ہے
روٹی نہیں کھائی
سروں کی فصل بارِ خشک سالی سے گراں ہے

لوگ مسجد بھی نہیں جاتے
میں اُس کو مسجدِ ضرّار کے باہر ملوں گا

وہ گھوڑوں کی طرح تھے
فربہ اندامی پہ مائل
ساتھ والی کھڑکیوں پر ہنہناتے تھے
اب ان کے نعل ٹھونکی جا رہی ہے
میرا گھر جانا ضروری ہے
کہ ایسے میں ہمیشہ چھٹیوں کا کال ہوتا ہے

چلو گھر کی طرف چلتے ہیں
باہر برف باری ہے
میں تم پر نظم لکھوں گا
محبت لڑکیوں کو اصطبل میں چھوڑ آتی ہے
میں تم کو بیچ کھڑکی میں بٹھا کر نظم لکھوں گا
تمھیں آتا تو ہوگا درمیاں سے لوٹنا
میں لوٹنے پر نظم لکھوں گا

یہ مصدر اسمِ ماضی کا نہیں ہے
تم جو کہہ دو تو بلا لیتے ہیں گھر سے ابنِ ملجم کو
مجھے اپنی زمینِ اصطبل کی قسط دینی ہے
اُسے بھی کوئی صورت چاہیے گھر سے نکلنے کی

بے ارادہ زیست کیجے

اکیلاپن پرندے کا
پرندے کا اکیلاپن
سماعت گاہِ ویرانی میں بلبل بولتی ہے
اکیلاپن گڈریے کا
کسی سادہ گڈریے کا اکیلاپن
وہ اس شب بھیڑیوں کے درمیاں تنہا نہیں ہوگا
اکیلاپن مسافر کا
کسی بھولے مسافر کا اکیلاپن
مسافر قوّتِ پرواز سے مجبور ہے
آگے نکل جاتا ہے
ساحل پر پرندے گھاس پر ٹوٹے ہوئے پَر دیکھتے ہیں
مسافر چیونٹیوں کے درمیاں تنہا نہیں ہوگا
اکیلاپن ستارے کا
ستارے کا اکیلاپن
ستارہ ٹوٹتا ہے راکھ ہو جاتا ہے
مٹّی سب چُھپا لیتی ہے
مٹّی میں کوئی تنہا نہیں ہوتا

فنا تعمیلِ درسِ بے خودی ہے
بے ارادہ زیست کیجے
بے تقاضا پائیے
کوچۂ بنتِ سرائے دہر میں چلیے کبھی
سر سلامت آئیے
اور اک رقصِ فنا، تعمیلِ درسِ بے خودی

چیونٹیوں کے درمیاں، بھیڑیوں کے درمیاں
ٹیوں کے سلسلوں کے درمیاں رقصِ فنا
بے ارادہ زیست کیجے

ہجوم

یہ ہجوم صورت آسمانِ سیاہ میرے عقب میں ہے
میں بڑے بلند شجر کا پھل، بڑے فاصلے کا شکار
غمزۂ رازدار
کہا گیا کہ زمین اک کفِ جو، پہاڑ موجِ نسیمِ گیسوے خلوتی
سو زمین سایۂ تیرگی کی مثال میرے عقب میں ہے
مجھے نیند سے جو اٹھا کے جرعۂ آب دے
جو پسِ غبار چہار سمت سے آ کے میرا ہلاک ہو
جو دمِ شگفتِ گلِ شفق مری کہنیوں سے قریب ہو
وہ ہجومِ خلوتیانِ خاص میرے عقب میں ہے
میں سماعتوں کا شکار تھا
تو سماعتوں کا سحاب صورتِ آب میرے عقب میں ہے
کوئی راستے میں نہیں ملا
کوئی برگ و بار و گل و شجر
کوئی نان و لحمِ گزشتگاں
کوئی آنکھ، نیند، خیال، خواب، ابرِ شتاب نہیں ملا
کوئی خواب زادہ نہیں ملا
سرِ خود نہادہ نہیں ملا
سرِ خود نہادہ بہ کف یہ میں کہ زمین اک کفِ جو
پہاڑ موجِ نسیمِ گیسوے خلوتی

سرِ خود نہادہ بہ کف یہ مَیں کہ ہجومِ مارِ سیاہ میرے عقب میں ہے
میں بڑے بلند شجر کا پھل
بڑے فاصلے کا شکار غمزۂ رازدار

سفر ایسا بھی ہوتا ہے

وہ اپنے خیمۂ صحرائی میں ہے
سب زمینوں سے الگ
سورج کے بالکل ٹھیک نیچے
رات کی پھیلی ہوئی شبنم اسے پہچانتی ہے
جس نے دیکھا بھی نہیں اُس کو
جو اپنے خیمۂ صحرائی میں ہے

بارشوں میں کھیتیاں چاول کی کیسے جُھولتی ہیں
جب ہوا چلتی ہے ان سے پوچھتی جاتی ہوئی
سب ٹھیک ہے؟
سب ٹھیک ہی ہوتا ہے اکثر
بارشوں کے درمیاں، سورج تلے
یا اُن زمینوں پر جہاں کچھ بھی نہیں ہوتا
مگر آنکھیں
مسلسل دیکھتی رہتی ہیں جو کچھ دیکھتی رہتی ہیں آنکھیں
اور اپنے خیمۂ صحرائی سے باہر نہیں آتیں
سفر ایسا بھی ہوتا ہے

سفر ایسا بھی ہوتا ہے چراغوں کا

جو دریا پر مخالف سمت رکھے جا رہے ہوں بے دھیانی میں
سفر ایسا بھی ہوتا ہے
سپر انداز بوڑھے قیدیوں نے جس طرح سَو ناریل پانی میں ڈالے
اور سَو واپس چلے آئے
سفر ایسا بھی ہوتا ہے
سفر ایسا بھی ہوتا ہے کہ سب زادِ سفر اپنی جگہ رہتا ہے
دروازے نہیں کھُلتے
اور اس اثنا میں سارا شہر خالی ہونے لگتا ہے
مگر آنکھیں
نئے کپڑوں، پرانے برتنوں کے درمیاں اُلجھی ہوئی آنکھیں
مسلسل دیکھتی ہیں اور اپنے خانۂ صحرائی سے آگے نہیں جاتیں
سفر ایسا بھی ہوتا ہے

ابنِ زیاد کا فرمان

تمھاری ہڈیاں مُڑتی نہیں ہیں
رحمِ مادر سے نکلنے کے لیے بے تاب ہو
سوتے رہو، یہ گھر گرہستی کا زمانہ ہے
مویشی اصطبل میں جائیں گے اور اونٹ خیمے میں
فرس ابنِ زیادہ کے لیے عضو زیادہ ہے
سواری واسطے مُشکی ہرن زنجیر کرتے ہیں

زمینِ شور سے شوریدہ سر، عفریت سے بونے
سمندر سے گلابی مچھلیاں
مٹی سے سورج مکھ کا جنگل

چاردیواری سے اٹھ کر دیکھتا ہے
آنگنوں میں ہل نہیں چلتے
ابوسفیان سے میں نے سنا تھا

ابوسفیان سے میں نے سنا تھا
آنگنوں کا حال،
خیموں کی خبر،
گھوڑوں کے جل جانے کا قصہ
جب بدک کر بھاگ اٹھے تھے
مویشی، اونٹ، سورج مکھ سپہ زادے،
ابوسفیان کے بیٹے
ابوسفیان سے میں نے سنا تھا

ابوسفیان سے میں نے سنا ہے
آنگنوں کی خیر لکھی ہے زیاد ابنِ زیادہ نے
نئی بیلیں چڑھائی ہیں پرانی کرسیوں پر
میز پر خرگوش پالا ہے
گھڑوں میں ناریل کی کاشت کی ہے
بیچ انگنائی میں لکھا ہے
تمھاری ہڈیاں مڑتی نہیں ہیں
رحمِ مادر سے نکلنے کے لیے بے تاب ہو
یہ گھر گرہستی کا زمانہ ہے
مویشی اصطبل میں جائیں گے اور اونٹ خیمے میں

زباں پر ذائقہ دو پانیوں کا ہے

زباں پر ذائقہ دو پانیوں کا ہے
سمندر درمیاں ہوتا تو اس سے پوچھتے
کس سَمت جائے گا مسافر کل
خنک پانی کے بجرے پر نمک کی گرم لہروں میں
اکیلا جانے والا جس طرف بھی جائے گا تنہا نہیں ہو گا
محبّت پانیوں پر کھیلتی ہو گی
سو یہ جل مکڑیوں کی جعل سازی تھی
کہ ساحل سے اُلجھ کر لوگ لہروں میں اترتے
اور ان کو خوف ہوتا آنسوؤں میں پانیوں کے خشک ہونے کا
میں ان کو پانیوں کی نذر کرتا ہوں
سوائے آدھے بدن کی مہرباں مچھلی!
تم اپنے آنسوؤں کو خشک مت کرنا
محبّت پانیوں پر کھیلتی ہو گی
اور اس کا ذائقہ کھل جائے گا
جس وقت جائے گا مسافر کل
خنک پانی کے بجرے پر نمک کی گرم لہروں میں

نیلی لڑکی

وہ اپنے گھر سے نیلی ہو کے آئی تھی
سو اس نے رنگ بدلے آسمانوں کے زینوں پر
ہواؤں کو درختوں پر اٹھایا
سمندر پر اُلٹ دی آسماں کی میز

گھر جا کر بہت روئی
وہ اپنی ساعتِ زنجیر پر چلتے ہوئے لغزش نہیں کھاتی
وہ اپنے آئنوں پر مَیل جمنے سے بہت پہلے انھیں آزاد کر دیتی ہے اپنے عکس سے
جب نیل پڑ جاتے ہیں اس پر
انگلیوں پر رنگ آ جاتا ہے شاہی روشنائی کا
وہ اپنی داستاں خود آپ لکھتی آپ سنتی
بیٹھ کر دیوار پر دیوار چُنتی
عکس کو زنجیر پر رکھ کر پلٹتی
اور نیلی ہو کے پڑ جاتی
سیاہی پھیل جانے پر مجھے آواز دیتی
میں سارے رنگ اپنے چاہتا تھا
اور وہ رنگوں کو رنگوں سے ملانے میں
بدل دیتی ہے سارے رنگ نیلے آسمانوں کے زمینوں کے
وہ اپنے گھر سے نیلی ہو کے آئی ہے

مسلسل چلتے رہنے کی خوشی

یہاں سے دو کنیزیں جا رہی تھیں
راستے میں خود سے آسودہ ہوئیں
اور سو گئیں ساون کے میلے میں
مسلسل چلتے رہنے کی خوشی آسودہ کرتی ہے

مسلسل چلتے رہنے کی خوشی میں لیٹ جاتی ہے محبت گھاس میں،
پتھر کی سِل پر، یادگاری سیڑھیوں کے بیچ،
گیلے موسموں میں پاؤں میں آتی ہوئی اُن سیڑھیوں کے ساتھ

جن پر لوگ چلتے ہیں
اور اک دم ہنسنے لگتے ہیں
اب ان کے پاؤں پر شبنم گرے گی
آؤ چل دیں
باندھ لیں جوتوں کے تسمے ان کنیزوں کے تعاقب میں
جو آسودہ ہوئیں
اور سو گئیں پتھر کی سِل پر
یادگاری سیڑھیوں کے بیچ
گیلے موسموں میں
اب ان کے پاؤں پر شبنم گرے گی

اگر تم دو قدم اوپر گئے

اگر تم دو قدم اوپر گئے بادل کو چُھو لو گے
کہیں بارش میں برسو گے
کسی پتھر پہ روندے جاؤ گے
چھت سے گرو گے
چھتریوں پر سوکھ جاؤ گے
نکالیں گی تمہیں گھروالیاں گھر سے
اٹھا کر ڈال دیں گی دھوپ میں
اُن گدڑیوں کے ساتھ
جن کو چھوڑ کر تم دو قدم اوپر گئے تھے ایک دن
جب حبس تھا اور لوگ باہر سو رہے تھے

یہ گھر جل کر گرے گا

یہ گھر جل کر گرے گا
تم نے لو دھیمی نہیں کی
ہجرتی، گھر چھوڑنے کے بھی کوئی آداب ہوتے ہیں
چلو دو چار دن رہ لو
کسی کے آنے جانے تک
جہاں تک معصیت ہے ارتقا کا در کھلا ہے
یہ گھر جل کر گرے گا
ان پرندوں سے کہو
دہلیز سے آگے نکل جائیں
خدائے خشک و ترکی سلطنت اک گھر نہیں ہے
اور موسم ہیں حوادث کے
ابھی بارش بھی ہو گی
ابھی بارش بھی ہو گی
خیمہ دوزوں سے کہو اک بادباں سی لیں
کسی کی بازیابی تک یہ سارا شہر
جلنے کے لیے باقی رہے گا
تم دِیے کی لو مگر آہستہ رکھنا
اور موسم ہیں حوادث کے
جہاں تک معصیت ہے ارتقا کا در کھلا ہے

دریائے چارلس کے کنارے ایک نظم

یہ گرجا ہے کہ مجھ پر آسماں کی مہربانی ہے
صلیبی جنگ میں سارے سپاہی کام آئے
اب کسے پانی پلاؤ گی تم اپنے دامنِ تر سے
اٹھاؤ گی کسے پھیلے ہوئے بازو پہ، نیلے ناخنوں پر روک لو گی
آنکھ چہرہ
جب زمیں پر راکھ ہو گی اور مٹی پھیل جائے گی
طنابیں راکھ ہو جائیں تو مٹی پھیل جاتی ہے
زمینوں آسمانوں پر
سو گرجا مجھ پہ نیلے آسماں کی مہربانی ہے
یہ دریا ہے کہ مجھ پر آسماں کی مہربانی ہے
زمیں جب راکھ ہو جائے تو دریا پھیل جاتا ہے
اور اس کو روک لیتی ہو تم اپنی خشک آنکھوں میں
بدن کی آڑ دے کر
جب سپاہی راستے میں بیٹھ جاتے ہیں
بچھا دیتے ہیں سایہ پتّیوں پھولوں کناروں کا
تمہارے دامنِ تر کا
اتر جاتے ہیں گیلی جھاڑیوں میں آگ لے کر
آسماں دیکھا نہیں جاتا
تو بھیگی ریت کو سوکھی ہوائیں چھانتے ہیں
اور مٹی پھیل جاتی ہے
یہ مٹی مجھ کو کل تک آسمانوں میں اڑاتی تھی
یہ دریا مجھ کو کل تک کھینچ لاتا تھا زمینوں پر
یہ مٹی پھیلتی جاتی ہے دریا سوکھتا جاتا ہے
مجھ پر آسماں کی مہربانی ہے

خرابی ہے محبّت میں

خرابی ہے محبّت میں
محبّت میں خرابی ہے
یہ قبریں پانیوں میں گھُل رہی ہیں
سو ان کے استخواں دیکھو!
میں مجنوں کو لڑکپن میں بہت رویا
بہت رویا میں مجنوں کو لڑکپن میں
کہ پانی مٹیوں سے پھُوٹتا تھا اور مٹی گھُل رہی تھی پانیوں میں
سو اس کے استخواں دیکھو!

محبّت رات مجھ سے کہہ رہی تھی اس کے گھر جانا
کہ آنکھیں دُھل گئی ہیں اور چہرہ دھوپ دیتا ہے
گھن کی مار ہو اس آنکھ پر جو اس گھٹا میں دھوپ دیکھے!

محبّت رات مجھ سے کہہ رہی تھی
اس کے گھر جانا
محبّت کی خرابی ہے
یہ قبریں پانیوں میں گھُل رہی ہیں

ہندوستان میں تین نظمیں

مرے پاؤں کے نیچے خاک نہیں

مرے پاؤں کے نیچے خاک نہیں کسی اَور کے پاؤں کی مٹّی ہے
دروازہ کھُلا
اور ماہِ زوال در آیا
بند مکاں کے روزنِ در سے
آگے سات دُلھن کی قبر ہے
نیچے کوزہ گروں کی بستی ہے
کوزہ گروں کی بستی میں مرے پاؤں کے نیچے خاک نہیں
بڑے قصّے ہیں
بڑے قصّے ہیں دل صبر و سوال کے سننے کو
بڑی باتیں سیف و کتاب پہ لکھنے کی
بڑے خواب ہیں اوڑھ کے سونے کو
کبھی خواب لکھے نہیں جاتے
کبھی باتیں سنی نہیں جاتیں
کبھی قصّے کہے نہیں جاتے
کوزہ گروں کی بستی میں بڑے قصّے ہیں اور خاک نہیں
مرے پاؤں کے نیچے خاک نہیں
اور ماہِ زوال در آیا
بند مکاں کے روزنِ در سے
آگے سات دُلھن کی قبر ہے
نیچے کوزہ گروں کی بستی ہے
کوزہ گروں کی بستی میں
مرے پاؤں کے نیچے خاک نہیں کسی اَور کے پاؤں کی مٹّی ہے

اس چھالیہ کے پیڑ کے نیچے

اس چھالیہ کے پیڑ کے نیچے خدا گواہ
مجھ پر نزولِ رحمت و اجلالِ حق ہوا
اور یوں ہوا کہ مجھ پہ زمیں کھول دی گئی
اور آسمان سر پہ مسلّط نہیں رہا
اور یہ کہا گیا کہ جو گھر لوٹیے تو پھر
ہاتھوں میں دھوپ لے کے مُنڈیروں پہ ڈالیے
مٹّی اُگائیے کہ زمیں شورہ پُشت ہے
اور یہ کہ میش و ابلق و اشتر کے درمیاں
کافی ہے زندگی کی ضرورت کے واسطے
دو چھالیہ کے پیڑ، مزاروں کے تین پھول،
اور ایک آنکھ جس پہ جہانِ عبث کھُلے
ویسے تو گھر تک آ گئی ساعت زوال کی

خانہ بدوشوں کا گیت

اب کس لیے جہانِ خرابی میں گھومنا
وہ سو گئی تو اس نے نہ دیکھا کہ اس کے بعد
کتنی بڑی قطار کھُلے زاویوں کی تھی
وقت آ گیا تھا وصل و مکافاتِ وصل کا
اونچی زمیں پہ ریل کی کھڑکی کے ساتھ ساتھ
غاروں میں، بستروں میں، زمیں پر، رضائی میں
اب کس لیے جہانِ خرابی میں لوٹنا
سو آشیاں کو مثلِ کبوتر اڑائیے

اور دن گزر چلے تو یہ بازو سمیٹ کر
انگشتری کو آئنے پر مار سوئیے
وقت آگیا ہے وصل و مکافاتِ وصل کا

محمد انور خالد
کی نظموں کا پہلا مجموعہ
ریت آئینہ ہے
شائع ہونے والا ہے
ناشر
عمارہ پبلی کیشنز
کراچی

نیّر مسعود

بُن بَست

اس بار وطن آنے کے بعد میں نے شہر میں دن دن بھر گھومنا شروع کیا اس لیے کہ میرے پاس کچھ کرنے کو نہیں تھا۔ میری اماں سلائی کڑھائی کا کام کر کے جو تھوڑی بہت رقم پیدا کرتی تھیں وہ ہم ماں بیٹوں کا پیٹ بھرنے کو کافی تھی، بلکہ میرے لیے تو ہمیشہ عمدہ کھانا پکتا تھا۔ اماں جیسا کچھ بھی کھاتی ہوں مگر مجھے دونوں وقت کھانے کو گوشت اور کوئی میٹھی چیز ضرور ملتی تھی۔ صبح دودھ کے ساتھ کبھی جلیبی اور کبھی شیرمال کا ناشتہ کر کے میں گھر سے نکل جاتا تھا اور دوپہر تک شیش محل، حُسین آباد، مفتی گنج سے لے کر ٹھاکر گنج، چوک، سعادت گنج تک کا چکّر لگا لیتا تھا۔ میں نے کوئی دوست نہیں بنایا تھا اس لیے بغیر کسی سے بات کیے پرانی عمارتوں کو دیکھتا، تنگ گلیوں میں گھومتا پھرتا تھا۔ دوپہر کو گھر واپس آتا تو اماں کی نماز کی چوکی پر میرا کھانا سینی سے ڈھکا رکھا ہوا ملتا تھا۔ میں کھانا کھاتا، جھوٹے برتن کنویں کے پاس رکھ دیتا اور اسی چوکی پر کچھ دیر لیٹ کر سو لیتا تھا۔ سہ پہر کو اماں کام پر سے واپس آتیں تو میرے لیے کچھ نہ کچھ کھانے کو ضرور لاتی تھیں: کبھی کوئی نیا فصلی پھل، کبھی اکبری دروازے کی کوئی عمدہ مٹھائی اور کبھی بالائی کے پان جو مجھ کو بہت پسند تھے۔ مجھے بھوک نہیں ہوتی تھی، پھر بھی اُن کی محبّت سے دی ہوئی چیز تھوڑی سی کھا لیتا اور پھر گھومنے نکل جاتا تھا۔ اُس وقت میں زیادہ گھومتا نہیں تھا بلکہ رومی دروازے کے بُرج میں بیٹھ کر شہر پر شام اُترتے، پھر رات ہوتے دیکھتا۔ رات ہوتے وقت بُرج سے اتر کر بازاروں کا چکّر لگاتا ہوا گھر واپس آ جاتا جہاں اماں کھانا پکاتی ملتیں۔ اُس وقت مجھ کو خوب گرم گرم کھانا ملتا۔ میرے آگے وہی گوشت، چاول لگتا تھا اور اماں کے آگے وہی چپاتی اور کوئی سادھی

ترکاری یا دال، لیکن میں زبردستی اُن کو اپنے حصّے میں سے کچھ کھلاتا اور زیادہ رات آنے سے پہلے ہی سو جاتا تھا۔ اس طرح دیکھا جائے تو خاصی آرام کی زندگی تھی، حالاں کہ ہمارے گھر میں آرام کا سامان گویا کچھ تھا ہی نہیں۔ کھانے پکانے کے پانچ پچکے ہوے برتن، ایک ٹوٹا ہوا نواڑی پلنگ، ایک ہلتی ہوئی نماز کی چوکی، لوٹا، بالٹی، معمولی بستر، ایک گھڑا، کٹورا، اور کھجور کی دو چٹائیاں، یہ ہماری کل بساط تھی۔ میرے پاس پہننے کے کپڑے بھی ڈھنگ کے نہیں تھے۔ صرف دو جوڑے تھے جو گھسنے کے قریب ہو گئے تھے اور اماں روز نیا جوڑا بنوانے کا ارادہ ظاہر کرتی تھیں۔ رفتہ رفتہ میرے کپڑے چیتھڑوں کی شکل اختیار کرنے لگے جنھیں اماں کی کاریگری کسی طرح پہننے کے لائق رکھے ہوے تھی۔ انھوں نے کبھی مجھ سے یہ نہیں کہا کہ مجھے بھی کچھ کام کرنا چاہیے۔ میری عمر اٹھائیس برس کی ہو چکی تھی لیکن مجھ کو نہ اپنی بڑھتی ہوئی عمر کا احساس تھا نہ اس کا خیال آتا تھا کہ میں خاصا تعلیم یافتہ ہوں۔ اپنے ہم عمر جوانوں کو دیکھ کر بھی میں اُن کی اور اپنی حالت کا مقابلہ نہیں کرتا تھا۔ اب سوچتا ہوں کہ وہ میری زندگی کا اچھا زمانہ تھا۔ لیکن ایک دن اُس زمانے کا خاتمہ شروع ہو گیا۔

o o o

رات ہو گئی تھی اور میں رومی دروازے سے اتر کر گول دروازے سے ہوتا ہوا چوک میں سے گزر رہا تھا۔ بیچ چوک میں پہنچ کر مجھے محسوس ہوا کہ بازار میں سناٹا ہے اور دُکانیں سب کی سب بند ہیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ شاید آج بازار بند رہنے کا دن ہے اور دل ہی دل میں ہفتے کے دنوں کا حساب لگا رہا تھا جو مہینے کی تاریخوں کی طرح مجھے کبھی یاد نہیں رہتے تھے۔ اتنے میں کہیں دور پر ایک شور سنائی دیا اور میرے قدم تیزی سے اٹھنے لگے۔ پھر کسی اَور طرف سے بھی شور اٹھا، اور اب مجھے پتا چلا کہ پورے چوک میں میرے سوا ایک بھی آدمی نہیں ہے۔ شور کچھ اَور بڑھا اور چوک کی سڑک سے اِدھر اُدھر پھوٹنے والی گلیوں میں کچھ ہلچل سی پیدا ہوئی۔ کسی نے پکار کر کسی سے کچھ کہا اور مجھے مکانوں کے دروازے بند ہونے کے دھڑاکے سنائی دیے؛ پھر روشنیوں کے ساتھ ایک ہجوم نظر آیا جو اکبری دروازے کے نیچے سے گزر کر میری طرف بڑھ رہا تھا۔ مجھے اپنے داہنے ہاتھ والی چوڑی گلی میں بھی شور سنائی دیا اور میں بے سوچے سمجھے بائیں ہاتھ کی ایک تنگ گلی میں گھُس گیا۔ کچھ دور بڑھ کر اُس گلی کے پہلو میں ایک اَور گلی مُڑتی دکھائی دی۔ میں اُس گلی میں مڑ گیا، مگر کوئی پچاس قدم آگے بڑھ کر گلی آہستہ آہستہ ایک سمت گھومنا شروع ہوئی، پھر اچانک بند ہو گئی۔ اس اندھی گلی میں زیادہ تر

مکانوں کے پچھواڑے تھے۔ صرف سامنے، جہاں گلی ختم ہوتی تھی، ایک صدر دروازہ نظر آ رہا تھا۔ یہ دروازہ تھوڑا کھلا ہوا تھا۔ میں اس کی طرف بڑھ رہا تھا کہ اندر سے کسی نے اسے بند کر لیا۔ میں کچھ اَور آگے بڑھا تو دروازے کے دوسری طرف کُنڈی لگنے کی کھڑکھڑاہٹ سنائی دی۔ مجھے محسوس ہوا کہ دوسری طرف جو کوئی بھی ہے اُسے کُنڈی چڑھانے میں کامیابی نہیں ہو رہی ہے۔ اُسی وقت گلی کے دہانے کی طرف دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز کے ساتھ کوئی چیز چمکی اور میں نے دروازے پر پورے بدن کا زور لگایا۔ دروازہ لمحہ بھر کو کھُل کر رک گیا اور میں اس کی چوکھٹ پھاند کر اندر چلا گیا۔ تاریک ڈیوڑھی میں مجھے چوڑیوں کی کھنک اور ہلکی سی خوف زدہ بیخ سنائی دی، لیکن میں نے اس پر زیادہ دھیان دیے بغیر جلدی سے دروازہ بند کر کے اس سے اپنی پیٹھ لگا دی۔ ایک ہاتھ کو بڑی دقت سے پیچھے گھُما کر میں نے کُنڈی ٹٹولی اور چڑھا دی۔ ڈیوڑھی میں اب خاموشی تھی۔

"یہاں کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

کوئی جواب نہیں ملا۔ میں کچھ دیر وہیں رکا رہا۔ مکان کے اندر خاموشی تھی۔ میں ڈیوڑھی کے اندرونی دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازے کے سامنے ایک دہلیز اتر کر پردے کی دیوار تھی۔ خود کو دیوار کی آڑ میں رکھ کر مَیں صحن میں اُترا۔ میرا پَیر ٹین کی کسی چیز سے ٹکرایا اور وہ چیز ہلکی آواز کے ساتھ ایک طرف لڑھک گئی۔ مجھے قریب ہی مرغیوں کی کُڑکُڑاہٹ سنائی دی اور میں نے احتیاط کے ساتھ دیوار کے دوسری طرف جھانک کر دیکھا۔ سب کچھ دُھندھلا دُھندھلا تھا۔ سامنے ایک دالان نظر آ رہا تھا جس کے بیچ والے در میں مدّھم روشنی کی لالٹین لٹک رہی تھی۔ میں نے پیر سے ٹٹول کر ٹین کی چیز کو ہلکی سی ٹھوکر ماری۔ اس آواز کے جواب میں پھر مرغیوں کی کُڑکُڑاہٹ سنائی دی۔ اب میں زرا اطمینان کے ساتھ بیچ صحن میں آ گیا۔ ہلکی روشنی میں مکان کا نقشہ میری سمجھ میں ٹھیک سے نہیں آیا، لیکن اتنا اندازہ ہوتا تھا کہ صحن کے تین طرف دالان ہیں، اوپر کی منزل نہیں ہے اور ڈیوڑھی سے متصل باورچی خانہ، غسل خانہ، مرغی خانہ وغیرہ ہے۔ دالانوں کے پیچھے کوٹھریاں تھیں اور سب باہر سے بند معلوم ہوتی تھیں۔

اب مجھے اُس کی فکر ہوئی جو ڈیوڑھی کے اندر سے دروازہ بند کرنا چاہ رہی تھی۔ میں ڈیوڑھی میں واپس آیا، کچھ دیر تک اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کرتا رہا، پھر بولا:

"مجھ سے ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ میں خود ڈرا ہوا ہوں۔"

کچھ جواب نہیں ملا۔ اب میں پھر صحن میں اترا۔ دَر میں لوہے کی آنکڑے دار چھڑ سے لٹکتی ہوئی لالٹین اتار کر پھر ڈیوڑھی میں آیا۔ لالٹین کی چمنی قریب قریب سیاہ ہو رہی تھی، پھر بھی تاریک ڈیوڑھی کے لیے اس کی روشنی کافی تھی۔ ڈیوڑھی خالی تھی لیکن اس کے ایک کونے سے متّصل ایک نیچا سا دروازہ نظر آ رہا تھا جو آدھا کھُلا ہوا تھا۔ میں نے لالٹین والا ہاتھ دروازے کے اندر کیا، پھر سر اندر ڈال کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ یہ چھوٹی سی کوٹھری تھی جس میں دروازوں کے گلے ہوئے پٹ، پلنگوں کے پائے اور پٹیاں، ایک مسہری کی ڈھانچا اور اُس پر مَیلی نِواڑ کے الجھے ہوئے لچھے اور اسی طرح کا دوسرا سامان بھرا ہوا تھا۔ میں لالٹین کو گھُما گھُما کر کوٹھری کا جائزہ لیے جا رہا تھا کہ نواڑ کے ایک بڑے سے لچھے میں مجھے ہلکی سی جنبش نظر آئی اور میں کوٹھری میں داخل ہو گیا۔ ایک عورت اس لچھے کے پیچھے چھپنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''باہر آئیے،'' میں نے کہا، ''مجھ سے ڈریے مت۔''

وہ خاموش رہی۔

''میں جان کے ڈر سے یہاں چلا آیا تھا،'' میں نے کہا۔ ''میں خود ڈرا ہوا ہوں، لیکن اگر آپ کو مجھ سے ڈر لگ رہا ہے تو جاتا ہوں۔''

وہ پھر بھی کچھ نہیں بولی، اور اچانک مجھے احساس ہوا کہ میں وہاں ہوں جہاں مجھ کو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ میں نے کہا:

''باہر لوگ چاقو چھُریاں لیے گھوم رہے ہیں۔ خیر، دیکھا جائے گا۔''

اس کے بعد میں کوٹھری سے باہر آ گیا۔ صدر دروازے کی کُنڈی بہت کسی ہوئی تھی۔ لالٹین زمین پر رکھ کر میں دونوں ہاتھوں سے اُسے کھولنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اپنی پُشت پر مجھے کسی کی کچھ حدّت سی محسوس ہوئی اور میں نے پلٹ کر دیکھا۔

زمین پر رکھی ہوئی لالٹین کی مَری مَری روشنی میں اُس کا چہرہ ڈراونا سا معلوم ہو رہا تھا۔ میں نے جھک کر لالٹین اوپر اٹھائی۔ اُسی وقت مجھے اس کی آواز سنائی دی۔

''آپ یہاں کیوں آئے ہیں؟''

''گلی میں یہی ایک دروازہ تھا،'' میں نے کہا۔ ''لیکن اب جا رہا ہوں۔''

''باہر کیا ہو گیا ہے؟''

''معلوم نہیں۔ شاید کوئی جھگڑا ہوا ہے۔''

وہ دیر تک خاموش رہی اور مجھے پھر احساس ہوا کہ میں وہاں ہوں جہاں مجھ کو نہیں ہونا

چاہیے تھا۔ میں نے ایک ہاتھ سے کُنڈی کھولنے کی ناکام کوشش کی۔ مجھے یہ سوچ کر حیرت ہوئی کہ کچھ دیر پہلے میں نے پُشت پر ہاتھ گھما کر اُسے آسانی سے چڑھا دیا تھا۔ اتنے میں اُس نے پوچھا:

"باہر خطرہ تو نہیں ہے؟"

"خطرہ؟" میں نے کہا۔ "کچھ نہیں، سوا اس کے کہ جب باہر نکلوں گا تو ذبح کر دیا جاؤں گا۔"

"تو ابھی نہ جائیے،" اس نے کہا اور لالٹین میرے ہاتھ سے لے لی۔ اُسی وقت باہر گلی میں دبا دبا سا شور اور بھاری چیزوں کے گرنے کی آوازیں سنائی دیں۔

"اندر آجائیے،" اس نے کہا۔

میں اُس کے پیچھے صحن میں اترا۔ لالٹین اُس نے بیچ والے در میں لٹکا دی۔ اب اس کا چہرہ قدرے صاف نظر آرہا تھا۔ ایک نگاہ میں وہ مجھ کو برسوں کی بیمار معلوم ہوئی۔ میں اُسے ٹھیک سے دیکھ بھی نہ سکا۔ وہ دیر تک مجھ سے منھ پھیرے چُپ کھڑی رہی۔ پھر اسی طرح منھ پھیرے پھیرے دالان کی طرف اشارہ کر کے بولی:

"بیٹھیے۔ آپ نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا ہوگا۔"

مجھے واقعی بہت بھوک لگ رہی تھی، لیکن میں نے کہا:

"نہیں، بھوک نہیں ہے۔"

"ہم کچھ لاتے ہیں،" اس نے کہا۔ "آپ بیٹھیے۔"

میں نے اسے ڈیوڑھی کی طرف جاتے دیکھا۔ کچھ دیر تک برتنوں کی ہلکی کھڑکھڑاہٹ سنائی دیتی رہی اور میں دالان میں ایک چھوٹی چوکی پر بیٹھا لالٹین کی کالی چمنی کو دیکھتا رہا۔ پھر میں نے دیکھا کہ وہ ایک گول سینی اٹھائے ہوئے روشنی کی طرف آرہی ہے۔ دالان میں آکر اس نے سینی چوکی پر رکھ دی اور بولی:

"اس وقت یہی ہے۔"

میں نے سینی کی طرف دیکھا۔ اس میں دو تین برتن تھے لیکن یہ نظر نہیں آتا تھا کہ برتنوں میں کیا ہے۔

"آپ نے خواہ مخواہ تکلیف کی،" میں نے کہا۔ "مجھے کوئی خاص بھوک نہیں تھی۔"

"آپ شروع کیجیے،" وہ بولی۔ "ہم پانی لارہے ہیں۔"

میں نے اُسے صحن کی طرف مڑتے دیکھا، لیکن اُسی وقت لالٹین ہلکی آواز کے ساتھ بھڑکنے لگی۔ وہ لالٹین کے بالکل نیچے تھی۔ اس نے سر اٹھا کر لالٹین کو دیکھا، پھر مجھ کو، اور اب وہ پھر پہلے کی طرح ڈری ہوئی معلوم ہونے لگی۔

"آپ کو یہاں نہیں آنا چاہیے تھا،" اس نے گھُٹی گھُٹی آواز میں کہا۔ اس کے ساتھ ہی لالٹین آخری بار بھڑکی اور بُجھ گئی۔

گھُپ اندھیرے میں مجھے چوڑیوں کی کھنک اور کپڑوں کی سرسراہٹ سنائی دی۔ پھر دالان میں میری پُشت پر کوئی دروازہ کھلا اور دھڑاکے کے ساتھ بند ہو گیا۔ اب مکان میں سناٹا تھا، البتہ کہیں بہت دور پر شور ہو رہا تھا۔

میں اسی اندھیرے میں اٹھ کر اندازے سے ڈیوڑھی کی طرف چلا۔ پردے کی دیوار کا مجھ کو خیال نہیں رہا تھا اس لیے میں نے پہلی ٹکر اُسی سے کھائی۔ سنبھلنے کی کوشش میں ایک بار پھر ٹین کی وہ چیز میری ٹھوکر میں آئی اور کچھ دور تک لڑھکتی چلی گئی۔ مرغی خانے میں کسی مرغ نے زور سے پَر پھٹپھٹا کر بانگ دی اور میں ڈیوڑھی میں داخل ہو گیا۔ صدر دروازے کی کسی ہوئی کُنڈی میں نے ایک جھٹکے میں کھول لی اور باہر نکل آیا۔

چند قدم چل کر مجھے خیال آیا کہ صدر دروازے کا ایسے وقت میں کھلا رہنا ٹھیک نہیں ہے، لیکن اسے اندر سے بند کرنا میرے بس کی بات نہیں تھی، اس لیے اسے یوں ہی چھوڑ کر میں بند گلی سے باہر آ گیا۔

(بہ شکریہ سوغات بنگلور شمارہ ۴)

نیّر مسعود

تحویل

۱

اب کوئی یہ بتانے والا بھی نہیں ہے کہ نوروز کی دُکان اصلاً کس چیز کی دکان تھی۔ کچھ منتشر زبانی روایتوں اور جھوٹے سچے قصّوں کی بنیاد پر صرف قیاس کیا جاسکتا ہے کہ جب یہ قصبہ ایک چھوٹی سی بستی تھا اُس وقت بھی یہ دکان بہت پہلے سے موجود تھی۔ اُس وقت یہ آبادی کے وسط میں تھی اور بستی والوں کی ضرورت کا قریب قریب سارا سامان یہیں مل جاتا تھا۔ اگر واقعی ایسا تھا تو یہ بھی قیاس کیا جاسکتا ہے کہ اُس وقت یہ بستی کی واحد دکان تھی۔

یہ دکان کئی پُشتوں تک چلتی رہی اور دکان کے مالک کا نام ہر پُشت میں نوروز ہی رہا۔ حالاں کہ ملکیت سنبھالنے سے پہلے اس کا نام کچھ اور ہوتا تھا لیکن دکان پر اس کے بیٹھنے کے بعد سب اُس کو نوروز کہنے لگتے، شاید اس لیے کہ اس دکان کو نوروز کی دکان کہا جاتا تھا۔ ان لوگوں میں کوئی موروثی بات ایسی تھی کہ آخر آخر میں ہر نوروز کا دماغ خراب ہوجاتا تھا۔ ایک نوروز کا دماغ خراب ہوجانے کے بعد دوسرا نوروز دکان سنبھالتا اور آخر وہ بھی پاگل ہوجاتا اور اس کی جگہ نیا نوروز آجاتا اور اس وقت تک دکان پر بیٹھتا جب تک پاگل نہ ہوجاتا۔ جنون کے اس سلسلے کو کسی بددعا کا اثر بتایا جاتا تھا۔ جو لوگ اس روایت پر یقین رکھتے تھے ان میں کبھی کبھی اس بات پر بحث ہوجاتی تھی کہ اس بددعا کا تعلق دکان سے تھا کہ دکان کے مالکوں سے کہ نوروز کے نام سے۔

ہر نوروز کے پاگل ہونے کا پتا اس سے چلتا تھا کہ وہ دکان پر بیٹھنا چھوڑ دیتا تھا۔ لیکن ایک نوروز ایسا بھی گزرا ہے جس نے پاگل ہونے کے بعد دکان نہیں چھوڑی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ

تھوڑے ہی دن کے اندر خود دکان پاگل معلوم ہونے لگی۔ میرا تعلق اسی نوروز کے زمانے سے ہے۔

شروع شروع میں کسی کو خیال نہیں ہوا کہ نوروز پاگل ہو چکا ہے۔ البتہ اگر غور کیا جاتا تو یہ ایسی بات نہیں تھی جو سمجھ میں نہ آسکتی ہو، اس لیے کہ دکان کی یہ حالت ہو گئی تھی کہ ایک دن کھلی تو وہاں مٹی کے کھلونے بھرے ہوئے تھے، دوسرے دن گھریلو پرندے، تو تیسرے دن انھیں پرندوں کا گوشت بک رہا تھا۔ کسی دن وہاں جڑی بوٹیوں کے پودے نظر آتے اور کسی دن ایندھن کی لکڑیوں کا ڈھیر۔ لیکن بجائے اس کے کہ لوگ نوروز کی دماغی حالت میں شک کرتے، انھیں دکان کے بدلتے ہوئے مال میں دل چسپی پیدا ہو گئی اور دل چسپی بھی ایسی کہ وہ آپس میں شرطیں بدنے لگے کہ کل جب دکان کھلے گی تو وہاں کیا بک رہا ہو گا۔ جب یہ دل چسپی وبا کی طرح پھیل گئی تب کہیں جا کر کچھ لوگوں کو، جو کئی کئی شرطیں ہار گئے تھے، خیال ہوا، اور یہ خیال بھی وبا کی طرح پھیل گیا، کہ نوروز پاگل ہو گیا ہے۔ اب یہ دستور ہو گیا کہ ہر صبح لوگ دکان کے سامنے جمع ہوتے، دکان کا پردہ اٹھایا جاتا، وہاں جو کچھ بھی مال ملتا اسے چند لوگ آپس میں بانٹ لیتے اور اپنے اندازے سے اس کی قیمت بھاری پایوں والے اُس اونچے تخت پر رکھ دیتے جس کے ایک کونے پر نوروز سکڑا ہوا بیٹھا ہوتا۔

لیکن ایک روز جب دکان کا پردہ اٹھایا گیا تو نوروز کا کہیں پتا نہ تھا: تخت خالی پڑا تھا اور دو چھوٹی چھوٹی بچیاں، جو ابھی ٹھیک سے بیٹھ بھی نہیں پاتی تھیں، دکان کے کچے فرش پر مٹی کے دو گولوں سے کھیل رہی تھیں۔ ظاہر ہے اس کا چرچا بہت ہوا۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ ان بچیوں کو دکان کا مال نہیں سمجھا گیا، اور نہ مٹی کے اُن گولوں کو جو شاید ان کے کھلونے تھے۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ وہ پہلا دن تھا جب نوروز کی دکان میں فروخت کے لیے کچھ نہیں تھا۔

نوروز کی تلاش میں ناکامی کے بعد کسی ایسے آدمی کی تلاش شروع ہوئی جو ان بچیوں کو دیکھ بھال سکے، اس لیے کہ ان کا کوئی دعوے دار سامنے نہیں آیا تھا۔ لوگوں کو نئے نوروز کی بھی تلاش ہوئی۔ اس غائب ہو جانے والے نوروز کا ایک بھائی موجود ضرور تھا لیکن وہ پہلے ہی سے پاگل تھا۔ بعض لوگ تو اسے پیدائشی پاگل کہتے تھے، پھر بھی کئی بار اسے پکڑ کر لایا اور دکان کے تخت پر بٹھایا گیا لیکن ہر بار وہ موقع پاتے ہی بھاگ کھڑا ہوتا تھا، اور آخر ایک دن وہ بھی اپنے بھائی کی طرح غائب ہو گیا۔ اس عرصے میں دونوں بچیاں میرے پاس رہیں، اس

لیے کہ میں نورروز کی دکان کے اوپری حصّے میں رہتا تھا، اور اس لیے بھی کہ میرے ٹھکانے کا ایک زینہ دکان کے اندر اترتا تھا، اور اس لیے بھی کہ کوئی اَور ان کا ذمّہ لینے پر راضی نہیں تھا۔

دکان کا کاروبار بند ہو گیا تھا لیکن اتنے دن میں قصبے کے لوگ مجھ کو بھی نورروز کہنے لگے۔ تب ایک دن مَیں نے دکان کا جائزہ لیا۔

دکان کھنڈروں والے جنگل کے پہلو سے آتی ہوئی سڑک کے آخری موڑ پر پہنچتے ہی نظر آنے لگتی تھی۔ اس میں داخلے کے دروازے کی جگہ صرف ایک موٹا پردہ تھا جو دکان داری کے وقت دو بانسوں کے سہارے سائبان کی طرح اٹھا دیا جاتا تھا۔ اُس وقت دور سے دیکھنے میں کبھی یہ معلوم ہوتا تھا کہ دکان ابھی ابھی سو کر اٹھے ہوئے بچّے کی طرح جمائی لے رہی ہے، اور کبھی یہ کہ وہ کسی درندے کی طرح آواز نکالنے سے پہلے منھ کھول رہی ہے۔ مجھے ان دونوں مشابہتوں سے دل چسپی تھی اور میں کبھی کبھی بے خیالی میں ان پر غور بھی کیا کرتا تھا۔

اندر دکان کا فرش باہر کی زمین سے کچھ نیچا تھا اور اس کا رقبہ قصبے کی دوسری دکانوں کے رقبے سے بہت زیادہ تھا۔ اس کی اونچی دیواروں میں جگہ جگہ خانے اور مچان بنے ہوئے تھے یا موٹی لکڑی کی بڑی بڑی کھونٹیاں اور لوہے کے بھاری آنکڑے تھے۔ ان آنکڑوں سے بندھی ایک دوسرے کو کاٹتی ہوئی رسّی کی الگنیاں بھی بہت تھیں۔ چھت کے کڑوں سے بانس اور زنجیریں لٹک رہی تھیں اور ان سب کے دونوں سِروں پر آنکڑے تھے۔ فرش میں بھی کئی جگہ چھوٹے بڑے خانے بنے ہوئے تھے جنھیں اندر سے پکّا کر کے لکڑی کے سُڈول پٹروں سے ڈھک دیا گیا تھا۔ ان پٹروں کو اٹھانے کے لیے ان میں پیتل کے کڑے لگے ہوئے تھے۔ پیتل کے کڑے کچّی زمین میں بھی کئی جگہ لگے ہوئے تھے، لیکن ان کے نیچے کوئی خانہ نہیں تھا۔ میں نے باری باری ان کڑوں کو اوپر کھینچ کر دیکھا مگر ان کے آس پاس کوئی جنبش نہیں ہوئی۔ پاگل پن کی حرکت، میں نے سوچا؛ پھر ان بے مصرف کڑوں کو گنا۔ پھر سوچا، کیا ان کی تعداد اتنی ہی ہے جتنی پُشتوں سے نورروز کی دکان چلی آ رہی ہے؟ میں نے ایک بار پھر پوری دکان کا جائزہ لیا۔ دیواری خانے، زمینی مچان، کھونٹیاں، الگنیاں، چھت سے لٹکتے ہوئے بانس اور زنجیریں، فرش پر پڑے ہوئے وضع وضع کے خالی مرتبان اور ٹوکریاں، یہ سب چیزیں یہ تو بتاتی تھیں کہ دکان نے کئی پُشتیں دیکھی ہیں لیکن اس کا پتا نہیں دیتی تھیں کہ یہ اصلاً کس چیز کی یا کس قسم کی چیزوں کی دکان تھی۔

میں بھاری پایوں والے اونچے تخت کے اُس کونے پر بیٹھ گیا جہاں آخری نوروز غائب ہونے سے پہلے بیٹھا کرتا تھا۔ دکان فروخت کے مال سے خالی ہونے کے بعد بھی اتنی بھری بھری تھی کہ اس کے اندر آزادی سے چلنا پھرنا ممکن نہ تھا۔ تخت کے کونے پر بیٹھے بیٹھے مجھے محسوس ہونے لگا کہ میرے آس پاس کی یہ چیزیں اُس مال سے زیادہ قیمتی ہیں جو اس دکان میں فروخت ہوتا رہا ہے۔ مگر، میں نے فیصلہ کیا، میں ان میں سے کسی بھی چیز کو فروخت نہیں ہونے دوں گا، کم سے کم اُس وقت تک فروخت نہیں ہونے دوں گا جب تک مجھے نوروز کہا جائے گا۔ پھر مجھے یاد آیا کہ میں کس غرض سے دکان کا جائزہ لینے آیا تھا۔ میں نے پھر ایک ایک چیز کو دیر دیر تک دیکھا اور آخر مجھے اطمینان ہو گیا کہ یہاں کوئی شے ایسی نہیں ہے جس سے چھوٹے بچوں کو نقصان پہنچ سکے۔ تب میں دکان کے اندرو الا زینہ چڑھ کر اپنے ٹھکانے پر پہنچا جہاں دونوں جاگ اٹھی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی، منھ سے آواز نکالے بغیر، دونوں میری جانب ہمکنے لگیں۔

o o o

وہ اب بیٹھنے لگی تھیں، بلکہ کچھ دن سے بیٹھے بیٹھے آگے کی طرف تھوڑا رینگ بھی لیتی تھیں لیکن ایک دو بالشت بڑھ کر ایک طرف گر جاتی تھیں۔ مجھے ان کا اس طرح خاموشی کے ساتھ گرنا اور گر کے خاموش رہنا اچھا لگتا تھا۔ میں کبھی کبھی ان کو اپنے سامنے بٹھاتا اور ان کی آنکھوں کے آگے چٹکیاں بجاتا ہوا دھیرے دھیرے پیچھے ہٹتا تھا۔ وہ میرے ہاتھ پر نظریں جمائے جمائے آگے کی طرف رینگتیں، پھر ایک طرف گر جاتی تھیں۔ ابھی تک ان کے ساتھ میرا بس یہی ایک کھیل تھا۔ کچھ دیر تک ان کے ساتھ کھیلنے کے بعد میں انھیں اٹھا کر نیچے دکان میں لے آیا۔ میں نے دونوں کو کچے فرش پر بٹھا دیا اور اچانک ان میں اس طرح جان سی پڑ گئی جیسے مچھلی کے بچوں کو پانی میں چھوڑ دیا گیا ہو۔ ہر چیز کی طرف ہمکنے کے بعد ان میں سے ایک مرتبانوں کی طرف چلی، دوسری نے ایک ٹوکری کو تاکا۔ تھوڑی تھوڑی دور چل کر دونوں ایک طرف گر گئیں، پھر اٹھ کر چلیں، پھر گریں۔ اس بار اٹھتے اٹھتے ایک کی نظر چھت سے لٹکے ہوئے آنکڑوں پر پڑ گئی اور وہ انھیں پکڑنے کی کوشش میں نرم زمین پر پیٹھ کے بل گری۔ میں نے اسے اٹھا کر بٹھایا اور ٹوکری لا کر اس کے قریب رکھ دی۔ دوسری کے ہاتھ میں ایک پٹرے کا کڑا آ گیا تھا اور وہ اسے کھولنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے اسے بھی ٹوکری کے پاس بٹھا دیا اور دونوں ٹوکری میں لگ گئیں۔ تب میں نے انھیں غور سے دیکھا۔

ان کے چہرے اور بدن اتنے مِلتے ہوئے تھے کہ انھیں جڑواں بہنیں سمجھا جا سکتا تھا۔ مجھے خیال ہوا کہ کئی موقعوں پر میں نے ان میں سے ایک ہی کو دو بار پانی وغیرہ پلا دیا ہوگا۔ بہت توجّہ سے اور دیر تک دیکھنے پر مجھے ان کے ناک نقشے میں برائے نام سے فرق کا گمان ہوا، لیکن دونوں کی الگ الگ پہچان میں ان کی آنکھیں حائل تھیں جو بالکل ایک جیسی تھیں۔

یہ کسی ایسی نسل کی آنکھیں تھیں جس سے میں واقف نہیں تھا، بلکہ میرا خیال تھا اس بناوٹ کی آنکھیں صرف تصویروں میں ہوتی ہیں، لیکن تصویری آنکھوں کے برخلاف ان میں پیچھے کہیں دور پر مدّھم روشنیاں سی جلتی بجھتی معلوم ہوتی تھیں۔ دیر تک ان آنکھوں کو دیکھتے دیکھتے مجھ پر خیال طاری ہونے لگا کہ میرا ان بچّیوں سے کوئی تعلق نہیں اور مجھے خواہ مخواہ ان کا ذمے دار بنا دیا گیا ہے، اور ان کی وجہ سے میری کچھ عادتیں بدل گئی ہیں اور کچھ معمول ختم ہو گئے ہیں۔ اب مجھے اس کا احساس ہوا کہ ان کی وجہ سے میرا جنگل جانا، بلکہ اپنے ٹھکانے پر بیٹھے بیٹھے جنگل کو دیکھتے رہنا بھی ختم ہو گیا ہے۔ تب میں نے سوچا، اور قریب قریب فیصلہ کر لیا، کہ ان کو نوروز کے مکان میں رکھا کروں جو میرے ٹھکانے سے صاف نظر آتا تھا۔ یہ دکان سے کچھ ہٹ کر بہت پرانی اور مضبوط بنی ہوئی چھوٹی سی عمارت تھی جس میں نوروز اپنے بھائی کے ساتھ رہتا تھا۔ میں وہاں کبھی نہیں گیا۔ خود نوروز بھی وہاں زیادہ وقت نہیں گزارتا تھا۔ مجھے نوروز یاد آیا۔ جب تک وہ ٹھیک رہا اس کا معمول تھا کہ سورج ڈوبنے کے وقت دکان بند کر کے قصبے کے باہر کہیں نکل جاتا اور کبھی رات گئے، کبھی دوسرے دن، کبھی خالی ہاتھ، کبھی دکان کے لیے کچھ مال کے ساتھ واپس آتا۔ بھائی کے سوا اس کا کوئی اَور نہیں تھا، کم سے کم اس قصبے میں نہیں تھا جس میں اس کی دکان تھی۔ قصبے کے لوگوں سے اس کا ملنا جُلنا دکان داری کی حد تک تھا اور مجھ سے اس کی ملاقات اُتنی بھی نہیں ہوتی تھی جتنی قصبے والوں سے ہوتی تھی، البتہ میں کبھی کبھی اس کی دکان داری کا حساب کتاب دیکھ لیا کرتا تھا اور اس نے مجھ کو اپنی دکان کے اوپری حصّے میں رہنے کی جگہ دے دی تھی۔ وہاں وہ خود بھی کبھی کبھی آ بیٹھتا، لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ مجھ سے ملنے کے لیے نہیں آیا ہے اس لیے میں اس سے زیادہ نہیں بولتا تھا، پھر بھی ہماری کچھ نہ کچھ بات چیت ہو جاتی تھی۔ اس بات چیت میں وہ مجھے ساسان کہہ کر مخاطب کرتا تھا اور بتاتا تھا کہ یہ میرا موروثی نام ہے۔ وہ ہمیشہ اس کھڑکی کے پاس بیٹھتا تھا جس کے نیچے دکان میں داخلے کا در تھا۔ وہاں سے اگر کوئی گاہک دکان کی طرف آتا دکھائی دیتا تو نوروز اٹھ کھڑا ہوتا اور اندرونی زینہ اتر کر

گاہک سے پہلے دکان میں پہنچ جاتا۔

میرے بیٹھنے کا ٹھکانا بھی اسی کھڑکی کے پاس تھا اس لیے کہ وہاں سے کھنڈروں والے جنگل کے درخت صاف نظر آتے تھے۔

مجھے اپنی آنکھوں کے آگے اُن درختوں کی ہلکی سی جھلک محسوس ہوئی، اور اُس وقت مجھ کو پتا چلا کہ میں اتنی دیر سے بچیوں کی آنکھوں کو گھور رہا ہوں۔ انھوں نے ٹوکری سے کھیلنا بند کر دیا تھا اور اب مجھے اپنی طرف اس طرح دیکھتے دیکھ کر خوف کھا رہی تھیں۔ میں سیدھا ہوا تو انھوں نے رک رک کر، مجھ پر ڈری ہوئی نظریں جمائے ہوئے، میری طرف رینگنا شروع کیا۔ مجھے احساس ہوا کہ وہ مجھ سے سہم کر میرے ہی پاس بھاگ آنا چاہتی ہیں۔ میں چند قدم پیچھے ہٹا اور ان کے رینگنے کی رفتار تیز ہو گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ گر جاتیں، میں نے بڑھ کر دونوں کو ایک ساتھ اٹھا لیا۔ ان کے چھوٹے چھوٹے دل تیزی سے دھڑک رہے تھے۔ دیر کے بعد میں انھیں ہنسانے میں کامیاب ہوا۔

۲

مجھے بچوں کی پرورش کا تجربہ نہیں تھا، پھر بھی میں کسی طرح اُن کو پال رہا تھا۔ شروع شروع میں میرا خیال تھا کہ دکان کے آس پاس کے لوگ، جن سے میری اچھی جان پہچان تھی، میرا ہاتھ بٹائیں گے۔ وہ میرا اور میری ضرورتوں کا بہت خیال رکھتے تھے، صرف اس وجہ سے کہ میں ان کے لیے لکھنے پڑھنے کا کام کر دیتا تھا؛ لیکن جب ایک آدھ مرتبہ میں نے ان کے سامنے بچیوں کا ذکر چھیڑا تو وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔

ایک دن جب باہر اچھی ہوا چل رہی تھی، میں دونوں کو سڑک کے موڑ تک لے گیا۔ کنارے کی نرم گھاس پر کچھ دیر تک اُن کو کھلا کر واپس لا رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ دکان کے پردے کے سامنے قصبے کے چار پانچ خاص آدمی کھڑے ہیں۔ میں نے اُن سے اِدھر اُدھر کی دو ایک باتیں کیں جن کے سرسری جواب دے کر وہ خاموش ہو گئے اور دیر تک خاموش رہے۔ پھر اُن میں سے ایک، بچیوں کی طرف اشارہ کیے بغیر بولا:

"نوروز، انھیں باہر نہ لایا کرو۔"

"اس میں کچھ بُرائی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کچھ نہیں، لیکن---" وہ بولا، "پتا نہیں یہ کون ہیں۔"

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔ "اُس کی بیٹیاں نہیں ہو سکتیں؟"

"بیٹیاں؟" وہ بولا، "پھر وہ انھیں چھوڑ کر چلا کیوں گیا؟"

"وہ پاگل ہو گیا تھا۔"

"پاگل تو ہر نوروز ہو جاتا ہے، نوروز۔ لیکن کوئی پاگل بھی۔۔۔"

اس کے بعد وہ سب مجھے دیر تک خاموشی سے دیکھتے رہے۔

"پھر بھی،" آخر میں نے پوچھا، "انھیں باہر لانے میں کوئی برائی ہے؟"

"پتا نہیں یہ کون ہیں۔"

"ان کا کوئی دعوے دار سامنے نہیں آیا ہے۔"

"سامنے نہیں آیا، بالکل،" وہ بولا، "لیکن کیا ان کا کوئی دعوے دار ہے ہی نہیں؟"

"میں ان کو پال رہا ہوں،" میں نے کہا، "اکیلا، اور میں سمجھتا ہوں ان کا دعوے دار نوروز ہے۔"

"کون سا نوروز؟"

اس کے کئی جواب میرے ہونٹوں تک آ کے رہ گئے۔ وہ سب، شاید جواب کے انتظار میں، مجھ پر نظریں جمائے ہوئے تھے۔

"ٹھیک ہے،" آخر مجھ کو کہنا پڑا۔ "اب سے میں انھیں باہر نہیں لایا کروں گا۔"

اُسی دن میں نے دکان کے در پر پڑا ہوا پردہ ہٹا کر اس کی جگہ دروازہ لگا دیا اور اسے اندر اور باہر سے بند کرنے کا پکا انتظام کیا۔ اس میں قصبے والوں نے میری بڑی مدد کی، جس طرح وہ ہر کام میں میری مدد کرتے تھے۔

o o o

دروازے کی مضبوطی کا اطمینان کر لینے کے بعد میں نے سب سے پہلے کھنڈروں والے جنگل کا ایک چکّر لگانے کا فیصلہ کیا۔

نوروز کے غائب ہونے سے پہلے میں پابندی کے ساتھ۔۔ قریب قریب روزانہ۔۔ وہاں جایا کرتا تھا۔ میں کوشش کرتا تھا کہ جنگل کی اندرونی ہیئت کا اندازہ کروں لیکن زیادہ تر محض کھنڈروں کی سیر کر کے رہ جاتا تھا، اور کھنڈر بھی درختوں کے گھَن کی وجہ سے صاف دکھائی نہیں دیتے تھے۔ موٹے شکستہ ستونوں پر جھکے ہوئے سنگی چھجوں سے کترا کر اوپر اٹھتے ہوئے درختوں کے ٹیڑھے میڑھے تنوں اور چٹخی ہوئی چھالوں کی وضع قطع کا پتا مشکل سے چلتا

تھا۔ اِدھر اُدھر بے چینی سے دوڑتی، درختوں پر چڑھتی اترتی بیلوں پر کسی خانہ باغ میں کھیلتے ہوئے بچّوں کا گمان ہوتا اور انھیں خواہ مخواہ چھُونا پڑتا تھا۔ کبھی کبھی تو یہ بیلیں جنگل میں پھیلی ہوئی خاموشی کو توڑے بغیر ہنستی چلّاتی معلوم ہوتی تھیں۔ پتھروں پر جمی ہوئی مٹّی سے اُگ آنے والی پتاوَر کی گھنی جھاڑیاں اوپر اٹھتی جا رہی تھیں، اور پرانے درختوں کی لٹکتی ہوئی جٹائیں کچّی زمین تک پہنچنے کے لیے پتھروں کی دراڑوں میں راستے تلاش کر رہی تھیں اور اس میں مدد کی محتاج معلوم ہوتی تھیں۔

جنگل کی باہری صورت کا یہاں سے اندازہ نہیں ہو سکتا تھا لیکن نوروز کی دکان کے اوپر جس کھڑکی کے پاس مَیں ۔۔ اور نوروز بھی ۔۔ بیٹھا کرتا تھا وہاں سے اس کے درختوں کی چوٹیاں صاف دکھائی دیتی تھیں اور جنگل کی باہری صورت کا اندازہ ہو سکتا تھا، کم سے کم اُس کو جس نے جنگل کو اندر سے، کھنڈروں کے درمیان گھوم کر، بھی دیکھا ہو۔

یہ اصلی جنگل نہیں تھا، کھنڈروں کی چوڑی دیواروں کے شگافوں سے اٹھے ہوئے کہن سال درختوں اور خودرو جھاڑیوں کا ایک ایسا سلسلہ تھا جس کی پستی بلندی کا یقین نہیں آتا تھا۔ کہیں جہاں ایک درخت کی چوٹی ہوتی وہاں کسی شگاف سے دوسرے درخت کی جڑ شروع ہوتی تھی۔ نشیب میں درخت زیادہ تھے اور انھوں نے بلندی والے درختوں کے سائے سے نکلنے کے لیے عجیب عجیب صورتیں اختیار کی تھیں۔ یہ درخت کچھ دور تک سیدھے اوپر کو اٹھتے، پھر ایک طرف جھک کر زمین کے متوازی بڑھتے اور سائے کی حد سے نکل کر پھر سیدھے اوپر کو اٹھ جاتے تھے۔ دیکھنے میں یہ کئی منزلہ جنگل کسی باغ کی ایسی تصویر معلوم ہوتا تھا جس کا کاغذ جگہ جگہ سے سمٹ گیا ہو۔ ہوا تیز چلتی تو جنگل سے کاغذ ہی کی سی پھڑپھڑاہٹ کی آواز آتی جیسے کسی کتاب کے ورق جلدی جلدی پلٹے جا رہے ہوں۔ لیکن جب ہوا آندھی میں بدلتی تو جنگل کی آوازیں بھی بدل جاتی تھیں اور رات کے وقت قصبے والوں کو ڈراتی تھیں۔ آندھی کے ناہموار جھونکوں میں طرح طرح کی آوازیں اُبھرتی ڈوبتی رہتی تھیں اور آدمی واہمے پر زور دے کر دوسری آوازوں سے ان کی مشابہت تلاش کر سکتا تھا، اور قصبے والے شاید یہی کرتے تھے۔ خود میں نے کئی مرتبہ ایسے موقعوں پر نوروز کی دکان کے اوپر، کھڑکی کے سامنے بیٹھے بیٹھے، جنگل کی آوازوں میں اپنی مرضی سے کھلکھلاہٹیں اور سسکیاں، قہقہے اور خوشی اور غم کی چیخیں، ڈانٹیں اور فریادیں سنی تھیں۔

انھیں آوازوں کے بیچ میں کبھی کبھی اچانک ایک ایسی آواز بھی آ جاتی تھی جیسے کسی

نے زور سے کچھ کہا ہو۔ یہ غالباً بڑے ٹہنوں کے چٹخنے اور ان کی چھال اُدھڑنے کی آواز ہوتی تھی۔ میرا یہی خیال تھا، لیکن لوگوں نے اس آواز کے قصے بنا رکھے تھے۔ یہ قصے پُشتوں سے چلے آ رہے تھے اور شاید اُتنے ہی پرانے تھے جتنی نوروز کی دکان۔ ہر قصے کا خاتمہ اس پر ہوتا تھا کہ ہر نوروز کے پاگل ہونے سے پہلے یہ آواز ضرور سنی گئی ہے۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس آواز نے کیا کہا ہے، مگر مشہور تھا کہ نوروز کی دکان کا ہر مالک کبھی نہ کبھی اسے سمجھ لیتا تھا اور دکان پر بیٹھنا چھوڑ دیتا تھا اور پاگل ہو جاتا تھا، یا پاگل ہو جاتا تھا اور دکان پر بیٹھنا چھوڑ دیتا تھا۔

لیکن وہ نوروز جو میرے زمانے میں تھا -- مجھ سے پہلے والا نوروز -- اُس کے پاگل ہونے سے پہلے یہ آواز نہیں سنی گئی تھی۔ ایسا تو ہوتا رہتا تھا کہ آواز آتی تھی اور کوئی نوروز پاگل نہیں ہوتا تھا، لیکن قصبے والوں کا کہنا تھا ایسا پہلی بار ہوا ہے کہ آواز نہیں سنی گئی اور نوروز پاگل ہو گیا۔ شاید اسی لیے شروع شروع میں لوگوں کو خیال نہیں ہوا کہ وہ پاگل ہو گیا ہے۔

اُس دن جنگل کی سیر میں میرا دل نہیں لگا اور میں جلد ہی وہاں سے باہر نکل آیا، پھر بھی اپنے ٹھکانے تک پہنچتے پہنچتے مجھے شام ہو گئی۔ میں اندرونی زینے سے دکان میں اترا تو وہاں اندھیرا اور سناٹا تھا۔ کانوں پر زور دے کر میں نے سانسوں کی آواز سنی، پھر زینے کے پاس کھڑے کھڑے دو تین بار چٹکی بجائی اور آنکھوں پر زور دے کر دیکھا کہ دو چھوٹے چھوٹے دُھندلے ہیولے فرش پر رینگتے ہوئے میری طرف بڑھ رہے ہیں۔ کچھ دیر میں مجھے اپنی پنڈلیوں پر اُن کی پتلی پتلی انگلیوں کا لمس محسوس ہوا، پھر اُن کے ہاتھ میرے گھٹنوں کے گرد لپٹ گئے۔ اس طرح وہ پہلی بار میرے سہارے سے اٹھ کر کھڑی ہوئیں۔

کچھ دن میں یہ دوڑنے لگیں گی، میں نے سوچا اور انھیں اوپر لے آیا۔ اُسی دن سے میں نے اُن کو اپنے ساتھ کھڑکی کے سامنے بٹھانا شروع کیا۔ ہواؤں کے موسموں کا آغاز تھا۔ وہ اپنی تصویری آنکھوں سے جنگل کے درختوں کو جُھومتے دیکھتیں اور اُدھر سے آتی ہوئی پھڑپھڑاہٹ کی آواز سن کر خوش ہوتی تھیں، لیکن جب پہلی بار ہوا آندھی میں بدلی تو وہ ڈر گئیں۔ میں نے انھیں کھڑکی کے پاس سے نہیں ہٹایا، اور کچھ دیر بعد وہ جنگل کی نئی نئی آوازوں کو اور بھی دل چسپی سے سننے لگیں۔ ان وقتوں کے سوا میں زیادہ تر اُنھیں دکان ہی میں رکھتا اور اپنے ٹھکانے پر بیٹھے بیٹھے اُن کے آپس میں کھیلنے اور ہنسنے چلّانے کی آوازیں

سنتا رہتا۔ جب آوازیں مدھم پڑ جاتیں تو میں سمجھ لیتا کہ ان کو نیند آ رہی ہے اور نیچے جا کر ان کو اوپر لے آتا۔ اپنی آنکھوں کی جلتی بجھتی روشنیوں میں مجھ کو دیکھتے دیکھتے وہ جلد ہی سو جاتی تھیں۔

وہ بیچ میں جاگتی نہیں تھیں اور بہت سویرے اٹھتی تھیں۔ ان کے اٹھنے سے پہلے میں نیچے اتر کر دکان کا دروازہ پورا کھول دیتا اور جب مجھے یقین ہو جاتا کہ باہر کی تازہ ہوا دکان کے ہر گوشے میں پہنچ گئی ہے تو دروازہ مضبوطی سے بند کر دیتا تھا۔ اس کے بعد میں انھیں نیچے لاتا تھا جہاں انھیں نقصان پہنچانے والی کوئی شے نہیں تھی۔

۳

وہ دن ایسے تھے کہ میں سمجھنے لگا ان میں کبھی کوئی تبدیلی نہ ہو گی، یہاں تک کہ موسم بھی نہ بدلیں گے، حالاں کہ اب جنگل کے اُس پار آسمان کے جُھکاو پر شفق کی لالی کی جگہ مٹیالاپن دکھائی دیتا تھا۔ کبھی کبھی پورا آسمان گدلا ہو جاتا اور کہیں بہت اوپر چھوٹی چھوٹی خاموش بجلیاں کونداتی ہوئی آندھی گزرتی تھی۔ میں اُسے دیکھتا اور ہمیشہ کا معمول سمجھتا تھا اس لیے کہ نوروز کی دکان میں نیچے اور اوپر سب کچھ اُسی طرح تھا۔

لیکن ایک دن شام ہونے کے دیر بعد جب نیچے سے آتی ہوئی ہنسنے کھیلنے کی آوازیں مدھم پڑتے پڑتے غائب ہو گئیں اور میں نے دبے پاؤں دکان میں اُتر کر اور زینے کے پاس ٹھہر کر چٹکی بجائی اور آنکھوں پر زور دیے بغیر دیکھا کہ دُھندلے ہیولے فرش پر رینگتے ہوے میری طرف آ رہے ہیں اور اپنی پنڈلیوں پر لمس، پھر گھٹنوں پر گرفت محسوس کی اور جھک کر دونوں کو ایک ساتھ اٹھانا چاہا تو میرے ہاتھوں میں صرف ایک بدن آیا۔ ایک ہاتھ آگے بڑھا کر میں نے اِدھر اُدھر ٹٹولا اور فرض کیا کہ ایک بچّی ہنسی ہنسی میں مجھ سے بھاگ رہی ہے۔ پھر میں نے دکان میں روشنی کر دی۔ مجھے فوراً پتا چل گیا کہ وہاں صرف ایک بچّی ہے۔ پھر بھی میں نے احمقوں کی طرح دوسری کو تلاش کیا۔ میں نے خالی مرتبانوں میں ہاتھ ڈالا، ٹوکریوں کو الٹا پلٹا، زمینی خانوں کے پٹرے ہٹائے، یہاں تک کہ اُن کڑوں کو بھی کھینچا جن کے نیچے مجھے معلوم تھا کوئی خانہ نہیں ہے۔ میں نے چھت اور اس سے لٹکتے ہوے آنکڑوں کو بھی دیکھا اور اُس زینے پر بھی تین بار چڑھا جس سے خود اتر کر آیا تھا۔ دکان کا پردہ ایک کونے میں لپٹا کھڑا تھا؛ میں نے اسے کھول کر فرش پر پھیلا دیا اور اس کی ہر سلوٹ کو ہاتھ سے تھپتھپایا۔ آخر میں

نے دکان کے دروازے کو ہلایا، تب دیکھا کہ اس کے پٹ صرف بھڑے ہوئے ہیں۔ مجھے آج صبح دروازہ بند کرنا یاد نہیں آیا۔ مجھے یہ بھی یاد نہیں آیا کہ آج صبح میں نے دروازہ کھولا تھا، لیکن اِس وقت وہ کھلا ہوا تھا۔

ابھی وہ یہیں تھی، میں نے سوچا، دکان سے باہر آیا اور ایک سیدھ میں نکلتا چلا گیا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ دکان کا دروازہ پورا کھلا چھوڑ آیا ہوں۔ لپکتا ہوا واپس آیا۔ آدھے راستے ہی سے میں نے خود کو یقین دلانا شروع کر دیا تھا کہ مجھے دکان کے اندر دونوں بچیاں موجود ملیں گی، لیکن وہاں صرف ایک بچی بیٹھی ہوئی نیند بھری آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی اور سُلائے جانے کی منتظر معلوم ہوتی تھی۔ میں اسے اٹھا کر اوپر لے گیا اور اپنے بستر پر لٹا کر جنگلی پن سے تھپکنے لگا جیسے اُسے سُلانا نہیں، جھنجھوڑ کر جگانا چاہتا ہوں۔ پھر بھی وہ مجھے دیکھتے دیکھتے جلد سو گئی۔ میں نے ایک نظر اس کو غور سے دیکھا، پھر اسے کچھ اُڑھا کر باہر نکلا۔ چند قدم آگے بڑھا تھا کہ یاد آیا پھر دروازہ کھلا چھوڑ آیا ہوں۔ پھر پلٹا، دروازہ مضبوطی سے بند کیا اور واپس ہوا۔

موڑ پر پہنچ کر میں رُکا۔ یہاں سڑک داہنی طرف گھوم کر دوسرے قصبوں کو نکل گئی تھی۔ بائیں ہاتھ پر جنگل کا دہانہ کسی گری ہوئی کالی دیوار کی طرح نظر آ رہا تھا۔ میں سڑک پر کچھ دور چلا تھا کہ مجھ کو جنگل کے اندر کسی آواز کا وہم ہوا اور میں سوچے سمجھے بغیر پتھر اور ہریالی کی اُس بھول بھلیاں میں گھُس گیا۔ اس سے پہلے کبھی میں رات کے وقت جنگل میں نہیں آیا تھا اور اس وقت وہاں گھُپ اندھیرا تھا۔ مجھے کاغذ کی سی پھڑپھڑاہٹ سنائی دی۔ یہ آواز پورے جنگل میں پھیلی ہوئی تھی اور اس کا کوئی مطلب نہیں تھا لیکن ابھی میں باہر نکلنے کی سوچ ہی رہا تھا کہ ہوا آندھی میں بدلی اور ہر طرف سے آوازیں آنے لگیں۔ کہیں بہت دور پر کسی نے زور سے کچھ کہا اور ساری آوازیں تیز ہو گئیں۔ ان آوازوں کے بیچ میں مجھے بار بار شبہ ہوتا تھا کہ میں نے کسی بچے کی آواز سنی ہے، لیکن یہ آواز کبھی سب سے بلندی والے درختوں کی چوٹیوں پر سنائی دیتی، کبھی سرسراتی ہوئی جھاڑیوں میں دوڑتی معلوم ہوتی۔ مجھے اور بھی بہت کچھ سنائی دے رہا تھا مگر دکھائی کچھ نہیں دیتا تھا۔ محض اندازے سے میں بیلوں کو ہٹاتا، جھاڑیوں کو چیرتا، پتھروں کے انباروں پر چڑھتا اترتا رہا۔ اسی میں اِک بار گی مجھے پتا چلا کہ آندھی نکل گئی ہے اور جنگل خاموش ہے۔ میں بھی کچھ دیر خاموش کھڑا رہا۔

یہاں کچھ نہیں ہے، آخر میں نے خود کو بتایا اور اندھیرے میں اِدھر اُدھر دیکھا۔ دور پر

ایک طرف جنگل کا دہانہ بڑے سے نیلگوں دھبّے کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ میں باہر نکل آیا۔ کچھ دیر تک دوسرے قصبوں کو جاتی ہوئی سڑک کو گھورتا رہا، پھر دکان کی طرف چلا مگر اس کے قریب پہنچ کر رک گیا۔ ابھی بہت رات نہیں ہوئی تھی۔ میں نے قصبے کی گلیوں کا رخ کیا اور جو بھی مکان سامنے پڑا اُس کا دروازہ کھٹکھٹا دیا اور اس کے مکینوں کو شُبہے کی نظر سے دیکھا اور ان سے بے معنی جرح کی، اور آدھی رات ہوتے ہوتے پورے قصبے کی آزُردگی مول لے لی۔ مگر خود میری آزردگی بھی کم نہ تھی۔ پہلے ہی دروازے پر جب میں نے بتایا کہ ایک بچّی غائب ہو گئی ہے تو مجھ سے پوچھا گیا:

"کون سی؟"

پھر ہر ایک نے مجھ سے یہی سوال کیا۔ میں جواب میں بے معنی جرح شروع کر دیتا اور سوال کرنے والے کو آزردہ کر کے آگے بڑھ جاتا۔ آخر قصبے کے خاص لوگوں نے مجھے ایک جگہ روک لیا اور پھر مجھ سے وہی سوال کیا کہ کون سی بچّی غائب ہوئی ہے، اور اُلٹی مجھ سے جرح شروع کر دی۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ بچّیوں کو دکان میں تنہا چھوڑ کر مجھے اوپر نہیں رہنا چاہیے تھا۔ اس پر میں نے کہا:

"تنہا وہ نہیں ہوتی تھیں، تنہا مَیں ہوتا تھا۔"

اور انھوں نے مجھے اس طرح دیکھا جیسے کسی پاگل کو دیکھا جاتا ہے۔ پھر وہ مجھے اطمینان دلانے لگے کہ میری طرف سے کوئی کوتاہی نہیں ہوئی ہے اس لیے مجھ کو پریشان نہ ہونا چاہیے۔ اس پر میں نے اُنھیں اس طرح دیکھا جیسے کسی پاگل کو دیکھا جاتا ہے۔ میں نے ان کی ہر بات کا کچھ نہ کچھ جواب ضرور دیا، لیکن جب اُن میں سے ایک نے، جو مجھ پر بہت مہربان تھا، کہا:

"تم کو اس طرح ہر ایک پر شبہ نہیں کرنا چاہیے تھا، نوروز۔"

تو میں خاموش رہا۔ اور جب دوسرے نے کہا:

"اور شبہ کرنے کو تو۔۔۔ کیا ہم نہیں پوچھ سکتے کہ تم نے اُسے کیا کیا؟"

تب بھی میں خاموش رہا۔ اس کے بعد انھوں نے جو بھی کہا میں نے اس کا جواب نہیں دیا۔ اُن لوگوں نے میری لمبی خاموشی کے شاید کئی مطلب نکالے اور میری تسلّی کے لیے بہت باتیں کہیں، پھر بھی میں ان کے سامنے خاموش کھڑا رہا۔ آخر اُس مہربان آدمی نے آگے بڑھ کر مجھے قریب قریب چمٹا لیا اور بولا:

"شاید یہی ہونا تھا، نوروز۔ اور۔۔۔ ایک طرح سے۔۔۔ یہ بھی تو دیکھو کہ اُن میں سے

ایک ہی غائب ہوئی ہے۔"

"ایک ہی۔۔۔" میں نے کہا، "مگر کون سی؟"

ظاہر ہے اس کا اُس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا، پھر بھی وہ کچھ کہنے کو تھا، مگر اس سے پہلے ہی میں نے خود کو اس کی گرفت سے چُھڑا لیا۔

"بہت دیر سے باہر ہوں۔۔۔" میں نے تھکی ہوئی آواز میں اُسے بتایا اور اپنے ٹھکانے پر واپس آ گیا۔

اکیلی بچّی اُسی طرح میرے بستر پر سو رہی تھی۔ بقیہ رات میں نے اسے دیکھتے ہوئے گزاری۔ مجھے یقین ہو گیا کہ جو غائب ہوئی ہے وہ بھی بالکل ایسی ہی تھی، اس لیے سامنے سوتی ہوئی بچّی کو موجود دیکھتے ہوئے بھی میں نہیں بتا سکتا تھا کہ ان میں سے کون سی غائب ہوئی ہے۔ یہ سوال مجھے طرح طرح سے تکلیف دے رہا تھا، مگر اس سے بھی زیادہ تکلیف یہ سوال دے رہا تھا کہ جو موجود ہے وہ کون سی ہے۔ اِنھیں سوالوں کے درمیان مجھے صبح ہو گئی۔ بچّی کلبلانے لگی اور میں اس کے کاموں میں لگ گیا۔

○ ○ ○

تین دن تک میں نے ہر وقت اسے اپنے پاس رکھا۔ تین دن تک قصبے والے دوسرے قصبوں میں آدمی بھیجتے رہے۔ تین دن تک یہ آدمی کھوئی بچّی کا حُلیہ بیان کرنے کے لیے میرے پاس والی بچّی کو آ آ کر دیکھتے رہے اور وہ باہر کے لوگوں کو دیکھ کر مجھ سے چمٹتی رہی۔ چوتھے دن میں نے دیکھا کہ اس کی صورت بدل رہی ہے۔ اس کا چہرہ کچھ لمبا ہو گیا تھا، آنکھیں پہلے سے بڑی معلوم ہوتی تھیں اور ان کے پیچھے روشنیاں صرف بجھتی دکھائی دیتی تھیں۔ وہ بالکل خاموش رہتی تھی اور ذرا دیر کو بھی مجھے چھوڑنے پر تیار نہیں ہوتی تھی، بلکہ سوتے میں بھی اس کا ایک ہاتھ میرے بدن کو چھوتا رہتا تھا۔ کسی کسی وقت اس کے منھ سے مدھم سی سسکی نکلتی تھی جیسے بہت دیر روئی ہو، لیکن میں نے اسے روتے نہیں دیکھا تھا اور سوچتا تھا کہ کیا دوسری کا بھی ایسا ہی حال ہو گا۔ یہی سوچتے سوچتے میں رات کو اپنے ٹھکانے سے اتر کر نیچے سڑک پر آ جاتا اور کسی تجسّس کے بغیر اِدھر اُدھر دیکھتا تھا، لیکن جلد ہی مجھے اوپر رونے کی آواز سنائی دیتی اور میں سیڑھیوں پر زور زور سے پَیر رکھتا واپس آتا تو دیکھتا کہ وہ سو رہی ہے اور خاموش ہے۔

۴

وہ دن، جو میں سمجھتا تھا کبھی نہیں بدلیں گے، بدل چکے تھے۔ اور اب یہ دن، یہ نئے دن، مجھے بدلتے نظر نہیں آرہے تھے۔ مجھ کو قصبے کے مہربان آدمی کا کہنا یاد آتا تھا:

"بچّے کا کھونا اُس کے مرنے سے زیادہ بُرا ہوتا ہے، نوروز۔"

میں نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا تھا لیکن اب میں بتا سکتا تھا کہ اس میں کیا برائی ہوتی ہے۔ کبھی میں خواہش کرتا تھا کہ کھوئی ہوئی بچّی کے مرنے کی خبر آجائے، اور کبھی صرف یہ سُن لینا چاہتا تھا کہ وہ زندہ ہے۔ اور وہ جو میرے پاس رہ گئی تھی، اب میں اسے دیکھ رہا تھا کہ دھیرے دھیرے مُرجھا رہی ہے۔

آخر جب میرے اندر ایک ولولہ پیدا ہوا کہ کچھ کروں، اور میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کروں، تب ایک رات پچھلے پہر نوروز آگیا۔

o o o

وہ بڑے سے کمبل میں خود کو چُھپائے ہوئے تھا اور اندھیرے میں ٹھیک دکھائی نہیں دیتا تھا، لیکن اس نے دکان کے دروازے پر تین بار ہلکی دستک دی تھی اور مجھے ساسان کہہ کر دھیرے سے پکارا تھا۔ میں نے کھڑکی میں سے اُس کو دیکھا اور اندر والا زینہ اتر کر دکان کا دروازہ تھوڑا کھول دیا۔ لیکن وہ دکان میں نہیں آیا، اور جب وہ دہلیز سے کچھ ہٹ کر دروازے کے قریب زمین پر بیٹھا تو میں نے سمجھ لیا کہ اسے اندر بلانے کی کوشش بے سود ہو گی، اس لیے میں اس کے قریب دہلیز پر بیٹھ گیا۔

"ایک غائب ہو گئی،" میں نے بیٹھتے ہی اسے بتا دیا۔

اس کے بعد، خود اُس سے پوچھے بغیر، میں نے سب کچھ بیان کر دیا۔ اُس وقت سے لے کر جب دکان کے اندر میری گرفت میں صرف ایک بدن آیا تھا، اِس وقت تک جب سوئے ہوئے قصبے کی رات کے اندھیرے اور بڑے سے کمبل میں لپٹا ہوا نوروز دکان کے باہر زمین پر بیٹھا ہوا تھا، میں اُسے کچھ بھی بتانا نہیں بُھولا۔

نوروز نے سب کچھ خاموشی کے ساتھ سُنا اور میرے چُپ ہو جانے کے بعد بھی دیر تک خاموش رہا۔ پھر اس نے کہا:

"تم اُسے چھوڑنے پر راضی نہیں ہو۔"

اور میرے جواب کا انتظار کیے بغیر بولا:

''یہ میرے پاس رہنے پر راضی نہیں ہے۔''

اور میری گرفت میں ایک چھوٹا سا بدن آ گیا۔

''کچھ بیمار سی ہو گئی ہے،'' نوروز کہہ رہا تھا، ''تمھارے پاس، اور اُس کے پاس، اُس دوسری کے پاس، رہ کر ٹھیک ہو جائے گی۔''

''اسے تم لے گئے تھے، نوروز؟'' میں اس کے سوا اور کچھ نہ کہہ سکا۔

''تم نے اس کی بڑی حفاظت کی، لیکن ---'' اُس نے رُک کر دکان کے دروازے کو چھُوا، ''جو دروازے پابندی کے ساتھ بند کیے جاتے ہیں اُن کا کھُلا رہ جانا ٹھیک نہیں ہوتا۔''

اس نے لمبی سانس کھینچی، دروازے پر ہاتھ پھیرا اور بولا:

''اسی لیے دروازے پر ہمیشہ پردہ ڈالا گیا۔''

''پردہ رکھا ہوا ہے،'' میں نے اُسے بتایا، پھر پوچھا: ''دروازہ ہٹا دوں؟''

''نہیں،'' اس نے بڑی مایوسی کے ساتھ کہا، ''اب تو لگ گیا۔''

اسی وقت اوپر سے رونے کی آواز آئی۔

''جاؤ،'' نوروز نے کہا۔ ''اِسے اُس کے پاس لے جاؤ۔''

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ جاتے جاتے میں نے کہا:

''ابھی جانا مت، نوروز۔''

''بیٹھا ہوں،'' اس نے جواب دیا۔

میرے سینے سے لگی ہوئی بچی گہری نیند سو رہی تھی لیکن میں نے اس کی مدھم سسکی سنی۔ دبے پاؤں اوپر جا کر میں نے اسے بھی اپنے بستر میں لٹا دیا۔ دوسری بچی سوتے میں رو رہی تھی۔ میں نے آہستہ آہستہ تھپکیاں دیں اور دونوں کے ہاتھ ایک دوسرے کے بدن پر رکھ دیے۔ میں نے انھیں دیر تک دیکھنے کی خواہش کو دبا دیا اور دکان میں اتر کر نوروز کے پاس آ گیا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا اور دروازے پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ مڑا اور سست قدموں سے واپس جانے لگا۔ میں بڑھ کر اس کے برابر آ گیا۔ وہ رُک گیا۔

''بھائی کیسا ہے؟''

میں کچھ دیر جواب دینے نہ دینے کا فیصلہ کرتا رہا، پھر بولا:

''وہ بھی غائب ہو گیا۔''

''اُسے ڈھونڈھا نہیں گیا؟''

"نہیں۔"

وہ پھر سست قدموں سے آگے بڑھا۔ مجھ کو اپنے ساتھ آتے دیکھ کر اُس نے میرا کندھا چُھوا اور بولا:

"بس، اب اُن کے پاس جاؤ۔"

یہ جانتے ہوئے بھی کہ مجھ کو جواب نہیں ملے گا، میں نے اس سے پوچھا:

"تم کہاں چلے گئے تھے، نوروز؟"

وہ کچھ بولے بغیر آگے بڑھتا رہا۔ میں نے پوچھا:

"کہاں رہتے ہو؟"

مجھے خیال آیا کہ یہ بھی قریب قریب وہی سوال ہے، اور نوروز نے اس کا بھی جواب نہیں دیا بلکہ اس کی رفتار تیز ہو گئی۔ میں پھر آگے بڑھ کر اس کے برابر آ گیا اور کچھ دور تک اس کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔

"وہ تمھاری کون ہیں، نوروز؟" آخر میں نے پوچھ ہی لیا۔

"ماں،" اس نے ایک لفظ میں جواب دیا اور چُپ ہو گیا۔

"اُن کی ماں کون ہے؟"

"نہیں ہے۔"

"وہ تمھاری کون تھی؟"

"ماں،" اس نے پھر اُسی ایک لفظ میں جواب دیا اور چُپ ہو گیا۔

کیا یہ اسی طرح جواب دیتا رہے گا؟ میں نے سوچا، اور پوچھا:

"تم انھیں چھوڑ کر چلے کیوں گئے، نوروز؟"

"تم جو تھے، ساسان۔"

"ساسان،" میں نے دُہرایا، اور اسے بتایا: "اب میرا نام نوروز ہے۔"

اُس کی رفتار دھیمی ہو گئی۔

"ایک زمانے میں دو نوروز۔۔۔" اُس نے کچھ سوچتے ہوئے اور بہت رُک رُک کر کہا، "ان میں سے ایک کا پاگل ہونا ضروری ہے۔"

اور مجھے یقین ہو گیا کہ وہ پاگل نہیں ہوا ہے، لیکن اسی وقت اس کے لہجے میں ایک وحشت پیدا ہوئی۔

"واپس جاؤ،" اس نے غرّاتی ہوئی آواز میں کہا، "وہ کھُلا ہوا ہے جسے تم نے لگایا ہے اور بند کرنا بھول جاتے ہو۔"

میں نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"نوروز، اگر کبھی تم سے ملنا ضروری ہو۔۔۔"

"دہانے پر،" اس نے اُسی آواز میں کہا، "کبھی کبھی، اور صرف۔۔۔"

"تم جنگل میں رہتے ہو؟"

"جنگل میں صرف۔۔۔ جنگل میں آدمی نہیں رہتے۔"

اُس نے اپنا ہاتھ چھُڑا کر کمبل میں چھُپا لیا۔ میں نے اس کے کمبل کا ایک کونا پکڑ لیا اور ضدّی بچّوں کی طرح پوچھا:

"تم نے دکان کیوں چھوڑ دی، نوروز؟"

"پاگل ہونے کا وقت آ گیا تھا،" اس نے جواب دیا اور کمبل میری گرفت سے نکل گیا۔

اس کے بعد اس کی رفتار اتنی تیز ہو گئی کہ میں اس کا ساتھ نہیں دے سکا۔ مجھے دکان کے کھلے ہوئے دروازے کا بھی خیال آیا اور میں مڑ کر نوروز ہی کی رفتار سے واپس ہوا۔

وہ دونوں ایک دوسرے پر ہاتھ رکھے سو رہی تھیں۔ میں دیر تک جھکا ہوا انھیں دیکھتا رہا۔ اب مجھے ان کی صورتیں الگ الگ معلوم ہو رہی تھیں، پھر بھی اُس رات، جو اَب تھوڑی رہ گئی تھی، میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اُن میں سے کون غائب ہوئی تھی۔ اُن کی مدّھم سسکیاں بھی ایک سی تھیں۔

o o o

"یہ تمھیں کہاں ملی، نوروز؟" مہربان آدمی نے پوچھا۔

"دکان کی دہلیز پر،" میں نے جواب دیا۔

"کوئی اسے اٹھا لے گیا تھا،" اس نے کہا، "مگر پھر واپس کیوں کر گیا؟" اور وہ کسی سوچ میں ڈوب گیا۔ میں نے کہا:

"شاید وہ اسے بہلا نہ سکا ہو گا۔"

"بچّوں کو بہلانے کے لیے نہیں اٹھایا جاتا، نوروز،" وہ بولا اور اسی طرح سوچ میں ڈوبا ہوا واپس چلا گیا۔

بچّی کی واپسی کے بارے میں قصبے والوں سے میری کُل اتنی ہی بات چیت ہوئی، حالاں کہ میرا خیال تھا میں اُن کو جواب دیتے دیتے تھک جاؤں گا اور ایک ہی قصہ بار بار سناتا رہوں گا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ اسے دیکھنے کے لیے آنے والوں کا سلسلہ کئی دن تک نہیں ٹوٹے گا اور مجھ کو ان ننھی مریضاؤں کی تیمارداری کا وقت نہ ملے گا، لیکن دکان پر مہربان کے سوا کوئی نہیں آیا، اور وہ دونوں اس تیزی سے ٹھیک ہوئیں کہ مجھے حیرت ہو گئی۔ تھوڑے ہی دن میں سب کچھ پہلے کی طرح ہو گیا سوا اس کے کہ اب میں تازہ ہوا کے لیے دکان کا دروازہ نہیں کھولتا تھا۔ میں اُسی طرح کھڑکی کے پاس بیٹھ کر جنگل کو دیکھا کرتا اور بچّیوں کو بھی دیر دیر تک وہیں بٹھائے رکھتا تھا۔ وہ اُسی طرح زیادہ تر نیچے دکان میں کھیلا کرتیں اور میں اوپر اپنی جگہ پر تنہا بیٹھا اُن کے ہنسنے چیخنے کی آوازیں سنا کرتا تھا۔

میں قصبے کی سیر بھی کرتا اور دوسرے قصبوں کو بھی نکل جاتا اور جنگل میں بھی گھومتا تھا۔ کئی مرتبہ میں آدھی رات کے وقت جنگل کے دہانے پر پہنچا اور اندھیرے میں کچھ دیر تک اندر جا کر واپس آ گیا۔ نوروز نے کہا تھا جنگل میں آدمی نہیں رہتے، اور اس کھنڈروں والے جنگل میں تو مجھے کوئی جانور بھی نظر نہیں آیا، پھر بھی مجھ کو شبہ تھا کہ نوروز کا ٹھکانا وہیں کہیں ہے، اور میں نے اُسے دن کی سیروں میں کئی بار تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن مجھے وہاں کبھی کسی کے رہنے کے آثار نہیں ملے، البتہ اس تلاش میں مجھ کو ان کھنڈروں کا کچھ اندازہ ہو گیا۔

پہلے میرا خیال تھا کہ یہ کسی بڑی عمارت کا خرابہ ہے، لیکن اب مجھے یقین ہو گیا کہ یہ کوئی بستی تھی جو، کسی بھی آسمانی یا زمینی آفت کے بغیر، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ویران ہوتی گئی۔ پھر درختوں نے نمو کی قوت سے اس کی بنیادوں کو ہلا دیا اور عمارتوں کو چھپا لیا، اور چھوٹی بڑی آندھیوں نے درختوں کو ہلا ہلا کر عمارتوں کو گرا دیا۔ اس میں کتنا وقت لگا ہو گا، اس کا میں نے اندازہ نہیں کیا اس لیے کہ مجھے ان مُردہ کھنڈروں میں دل چسپی پیدا نہ ہو سکی؛ نہ کبھی میں نے یہ تصوّر کرنے کی کوشش کی کہ اپنی اصل حالت میں یہ کیسے رہے ہوں گے، نہ یہ کہ یہاں رہنے والے کس طرح کے ہوں گے۔ ڈھئی ہوئی دیواروں، جھکے ہوئے ستونوں اور ملبے کے انباروں کے قریب سے گزرتے وقت میں اپنی رفتار بھی دھیمی نہیں کرتا تھا۔ لیکن ایک دن دہانے سے بہت دور اندر کی طرف ایک چھوٹے سے کھنڈر پر مجھ کو نوروز کی دکان کا دھوکا ہوا۔

وہاں نشیبی زمین پر جھکے ہوئے ایک چھجے کی منڈیر اس طرح خم کھا گئی تھی کہ دور سے اس پر کسی کھُلے ہوئے منھ کا گمان ہوتا تھا۔ میں تیزی سے بڑھ کر اس کے قریب پہنچ گیا۔ چھجّے کے اندر اندھیرا اندھیرا سا تھا۔ میں نے آہستہ سے پکارا:

"نوروز!"

اندر میری آواز کی کم زور سی بازگشت سنائی دی اور میں چھجّے میں داخل ہو گیا۔ وہاں کسی کے رہنے کی کوئی نشانی نہیں تھی۔ اونچی نیچی کچّی زمین کا رقبہ نوروز کی دکان سے کچھ ہی کم یا زیادہ تھا۔ پتھروں کے قدرتی گول اور بیضوی ٹکڑے جگہ جگہ بکھرے پڑے تھے۔ میں نے سب کچھ دیکھا اور اطمینان کیا کہ وہاں بچّوں کو ضرر پہنچانے والی کوئی چیز نہیں ہے۔ اگر کبھی ضرورت پڑی، میں نے کسی ارادے کے بغیر سوچا، تو میں اُن کو یہاں لے آؤں گا۔ اس کے بعد میں جنگل سے باہر آ گیا۔

اُس دن دکان کے سامنے والی سیدھی سڑک پر کوئی چھوٹا سا میلا لگا ہوا تھا۔ ایک جگہ بچّوں کے لیے تماشے ہو رہے تھے۔ میں نے دیکھا بچّے خوب ہنس رہے ہیں اور ایک دوسرے کو نام لے لے کر پکار رہے ہیں۔ اُن کی ایک ٹولی اپنی ٹوٹی پھُوٹی زبان میں بار بار کوئی گیت گانے لگتی تھی جس کے بول کچھ کچھ میری سمجھ میں آ رہے تھے۔ گیت کو سنتے سنتے اچانک مجھے ایک خیال آیا، لیکن میں سمجھ نہیں سکا کہ یہ کوئی شبہ ہے یا انکشاف، اس لیے میں میلے کی دکانوں کو پیچھے چھوڑتا ہوا نوروز کی دکان کی طرف روانہ ہو گیا۔

o o o

وہ اب دکان میں دوڑتی پھرتی تھیں اور کچّے فرش پر ہر طرف ان کے چھوٹے چھوٹے پیروں کے نشان بنتے، مٹتے اور بنتے رہتے تھے۔ ان کو بلانے کے لیے مجھے چُٹکی نہیں بجانا پڑی، میری آہٹ سن کر وہ خود ہی زینے کے سِرے پر آ کھڑی ہوئی تھیں۔ میں نے جھک کر انھیں دیکھا اور اُلٹے پاؤں دو تین سیڑھیاں اوپر چڑھ گیا۔ انھوں نے بھی چاروں ہاتھ پیر سے زینہ چڑھنے کی کوشش کی اور ان میں سے ایک آہستہ سے زمین پر گر گئی۔ میں نے دونوں کو اٹھا لیا۔

یہاں بھی دروازہ لگانا ہو گا، میں نے سوچا اور زینہ چڑھنے لگا۔ اوپر کی آخری سیڑھی پر پہنچ کر میں رُکا۔

اور ایک یہاں بھی، میں نے پھر سوچا اور آگے بڑھ کر دونوں کو فرش پر کھڑا کر دیا۔

تب ان کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر میں نے پہلے پہل ان سے اس طرح باتیں کیں جس طرح بچوں سے کی جاتی ہیں، لیکن میری کسی بھی بات کے جواب میں کچھ کہنے کے بجائے وہ مجھے دیکھ کر ہنستی اور مجھ سے چمٹتی رہیں۔ میں نے آس پاس موجود روزمرّہ کی کئی چیزوں کے نام لیے۔ وہ اسی طرح ہنستی اور مجھ سے چمٹتی رہیں۔

یہ انتہا ہے، میں نے اپنے آپ سے کہا۔ دکان سے آتی ہوئی اُن کی آوازوں کو میں سنا کرتا تھا مگر میں نے کبھی اس پر غور نہیں کیا کہ وہ کچھ کہہ نہیں رہی ہیں، صرف بول رہی ہیں۔ میں نے اِدھر اُدھر ڈھونڈھ کر مٹی کے وہ دونوں گولے نکالے جو اُن کے ساتھ دکان میں پائے گئے تھے۔ یہ خمیر کھائی ہوئی سُرمئی مٹی کو پکا کر بنائے گئے تھے، اپنی جسامت کے مقابلے میں بہت ہلکے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پکی زمین پر گر کر وہ دیر تک اُچھلتے رہیں گے۔ میں نے اُن کو ہر طرف گُھما کر دیکھا۔ اس عرصے میں بچیوں کی نظریں میرے ہاتھوں پر جمی رہیں۔ میں نے ان کے سامنے گولوں کو فرش پر کچھ دیر تک نچایا، پھر ادھر سے اُدھر لڑھکایا اور دونوں کو ان میں ایسی دل چسپی پیدا ہو گئی جیسی ابھی تک کھیلنے کی کسی بھی چیز سے نہیں ہوئی تھی۔ میں نے زینے کے پاس ایک رکاوٹ کھڑی کی اور اُنھیں گولوں سے کھیلتا چھوڑ کر کھڑکی کے پاس آ بیٹھا۔ تھوڑی ہی دیر میں ان کے ہنسنے چیخنے کی آوازیں آنے لگیں اور میں نے ان پر غور کیا۔

وہ آوازوں کی نقلیں کر لیتی تھیں۔ آندھی میں جنگل سے آنے والی قریب قریب ہر آواز، اور وہ زور سے کسی کے کچھ کہنے کی آواز، ان کی باریک آوازوں میں بھی پہچانی جا سکتی تھی۔ پھر میں نے غور کیا کہ وہ کچھ بے معنی لفظ بھی بول رہی ہیں۔ میں اٹھ کر ان کے پاس آ گیا، اور ان کی زبان سے جب بھی کوئی لفظ نکلا میں نے وہاں پر موجود کوئی چیز انھیں دکھا دکھا کر اس لفظ کو بار بار خود بولا اور انھیں بھی بولنے دیا، یہاں تک کہ اب جب میں ان کی طرف دیکھ کر وہ لفظ بولتا تو وہ اس چیز کی طرف دیکھنے لگتیں اور اس کا یہ نام خود بھی دُہراتیں۔

کچھ دن میں یہ مجھ سے باتیں کرنے لگیں گی، میں نے خود کو اطمینان دلایا اور دونوں کو بستر پر بٹھا دیا۔ وہ خوش تھیں اور اپنے اس زبانی کھیل کو جاری رکھنے پر مُصر معلوم ہوتی تھیں، لیکن میں چپ چاپ ان کی طرف دیکھتا رہا۔

اچانک ان میں سے ایک نے بستر پر خود کو گرا کر آنکھیں بند کر لیں اور اُس کے ہونٹ دو تین بار کھُلے اور بند ہوئے۔ میں نے جھک کر اُسے دیکھا۔ اُس کے ہونٹ پھر کھُلے اور

بند ہوئے۔ میں نے آہستہ سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور وہ آنکھیں بند کیے ذرا بھاری آواز میں بولی:

"ساسان!"

پھر اُس نے آنکھیں کھول دیں، اٹھ کر بیٹھ گئی اور میری طرف دیکھ کر معصومیت اور شرارت سے ہنسی۔ میں نے کئی قدم پیچھے ہٹ کر اسے دیکھا، پھر اس کے قریب جا کر اپنے سینے پر ہاتھ رکھا اور بولا:

"نوروز!"

اُس نے نفی میں سر ہلائے بغیر کہا:

"ساسان!"

اور میری طرف دیکھ کر اُسی طرح ہنسنے لگی۔

"نوروز!" میں نے پھر کہا اور ایک انگلی سے اپنے سینے کی طرف اشارہ کیا، "نوروز، نوروز!"

وہ پھر بستر میں لیٹ گئی اور آنکھیں بند کر کے بولی:

"ساسان! ساسان! ساسان!"

اس کی آواز میں کراہنے کی سی کیفیت تھی اور وہ سینے پر ہاتھ باندھے ہوئے تھی جیسے مَیں باندھ کر سوتا تھا۔ میرے دیکھتے دیکھتے اُس پر نیند طاری ہوئی، پھر بھی ایک بار اُس کی آنکھیں تھوڑی سی کھُل کر بند ہوئیں اور میں نے اس کی لمبی سرگوشی سنی:

"ساسان!"

چھوٹی آواز اور مدھم سرگوشی تھی مگر مجھ کو وہ اس طرح سنائی دی جیسے ہوا جنگل کے درختوں میں ساری آوازوں کے ساتھ سنسنا رہی ہو۔

۵

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں دو ننھی اُستانیوں کا سُست ذہن شاگرد ہوں۔ چیزوں کو نام دینے اور انھیں یاد کر لینے میں اُن کی رفتار اتنی تیز تھی کہ میں اس کا ساتھ نہیں دے پاتا تھا۔ پھر بھی، جس طرح کوئی نیا کھیل سیکھنے والے کے دماغ میں دن رات اُس کی چالیں گھوما کرتی ہیں، میرے کانوں میں ہر وقت اُن کی آوازیں گونجا کرتی تھیں، اُس وقت بھی -- بلکہ اُس

وقت زیادہ۔۔ جب دونوں سو جاتی تھیں۔ سونے سے پہلے دونوں باری باری آنکھیں بند کر کے لمبی سرگوشی میں کہتیں:

"ساسان!"

اس کے بعد جب تک وہ آنکھیں کھول کر معصومیت سے ہنس نہ دیتیں مجھے ایسا معلوم ہوتا رہتا کہ میرے سامنے بچیاں نہیں، دو چھوٹی چھوٹی عورتیں لیٹی ہیں۔

اُن کے سو جانے کے بعد میں اُن کے دیے ہوئے ناموں کو یاد کر کے کسی کاغذ پر لکھتا، پھر اس کاغذ کو دیکھ دیکھ کر ان ناموں کو یاد کرتا۔ دھیرے دھیرے ایسے کاغذوں کی تعداد بڑھ رہی تھی اور میں فرصت کے وقتوں میں ان کاغذوں پر جھکے جھکے خود کو تھکا لیتا تھا۔

o o o

اس دوران میں نے دوسری آوازوں پر دھیان دینا چھوڑ دیا تھا، لیکن ایک دن مجھے کھڑکی کے نیچے ایک نامانوس لہجے والی بلند آواز سنائی دی:

"نوروز کی دکان یہی ہے؟"

ذرا فاصلے سے قصبے کے کسی آدمی کی آواز آئی:

"دکان تو یہی ہے، مگر اب یہاں کچھ بِکتا نہیں۔" پھر وہ آواز بھی کھڑکی کے نیچے آ گئی۔ "آپ کو کچھ لینا ہے؟"

پہلی آواز نے روزمرّہ کی ضرورت والی دو تین چیزوں کے نام لیے اور مقامی آدمی نے قصبے کی کئی دوسری دکانوں کے نام لے کر ان تک پہنچنے کا راستا بتایا۔ پھر ایک اَور نامانوس آواز نے کسی اَور زبان میں دھیرے سے کچھ کہا۔ اور پہلی آواز نے کہا:

"اوپر، اس کھڑکی کے پاس ابھی ایک بچّی تھی۔"

"دو ہیں،" قصبے کے آدمی نے بتایا، "نوروز کی بیٹیاں۔"

نامانوس آوازوں نے آپس میں کچھ باتیں کیں، پھر پہلی آواز نے پوچھا:

"اور ان کی ماں؟"

"اُسے ہم نے نہیں دیکھا۔"

"نوروز سے کس وقت ملاقات ہو سکتی ہے؟"

"وہ کہیں چلا گیا، پاگل ہو گیا تھا۔"

"اُس کا کوئی رشتہ دار؟"

"ہمیں زیادہ نہیں معلوم۔ دوسرے دکان داروں کو شاید پتا ہو۔"

نامانوس آوازوں نے پھر آپس میں کچھ باتیں کیں، اور پہلی آواز نے پوچھا:

"بچیوں کو کون پال رہا ہے؟"

"نوروز۔۔۔ ہمیں زیادہ نہیں معلوم، دکان داروں سے پوچھیے۔ آئیے، ہم اُدھر ہی جا رہے ہیں۔"

پھر سب آوازیں دور ہوتے ہوتے غائب ہو گئیں۔ اسی وقت بچیوں نے، جو ابھی تک خاموش تھیں، مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

نیچے ہونے والی گفتگو کا مطلب میری سمجھ میں ٹھیک سے نہیں آیا تھا۔ میں نے یہ فیصلہ کر لینا مناسب خیال کیا کہ اس گفتگو کا، اس کے کسی جملے کا، بلکہ کسی لفظ کا بھی، کوئی مطلب نہیں تھا۔ پھر بھی اُس دن آدھی رات کے وقت میں نے خود کو جنگل کے دہانے پر پایا۔ دیر تک جنگل کے سنسان اندھیرے کو گھورتے رہنے کے بعد میں واپس آیا۔ دوسری رات پھر وہاں پہنچا اور بے سود انتظار کر کے واپس آ گیا۔ تیسری رات میں نے دہانے کے سامنے کھڑے کھڑے زیادہ انتظار کیا اور جنگل کے اندر کچھ سننے کی کوشش کی۔ مجھے پورے جنگل میں ایک سنسناہٹ کا واہمہ سا بھرا ہوا محسوس ہوا۔ یہ ہوا کی آواز نہیں تھی، بلکہ یہ کسی بھی جنبش کی آواز نہیں تھی۔ کھنڈروں کی آواز، میں نے سوچا اور مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میرے سامنے دہانے کے بجائے کوئی آنکھ ہے اور اندھیرے میں چھپے ہوئے کھنڈر اس کے سیاہ حلقے سے مجھے گھور رہے ہیں۔ پھر بھی دیر تک اس سنسناتے ہوئے اندھیرے میں دیکھنے کی فضول مشق کر کے میں واپس آ گیا۔

o o o

چوتھے دن سہ پہر کے قریب میں باہر نکلا۔ سیدھی سڑک پر دیر تک بے مقصد گھومنے کے بعد واپس آ رہا تھا کہ میری نظر نوروز کے مکان کے کھلے ہوئے دروازے پر پڑی۔ وہ زیادہ تر کھلا رہتا تھا اور دور سے کسی خالی مکان کا دروازہ معلوم ہوتا تھا، لیکن اُس دن مجھے مکان کے اندر لوگ چلتے پھرتے دکھائی دیے۔ میں نے اُنھیں اس سے پہلے کبھی قصبے میں نہیں دیکھا تھا۔ ان میں سے دو تین آدمی دروازے کے باہر بھی ٹہل رہے تھے۔ انھوں نے ایک اُچٹتی نظر مجھ پر بھی ڈالی، لیکن ان کی زیادہ توجہ دکان کی طرف تھی جسے وہ نیچے سے اوپر تک اور اوپر سے نیچے تک دیکھتے رہے؛ شاید اسی لیے جب میں باہری زینہ چڑھ کر اپنے ٹھکانے پر جانے لگا تو

مجھے کئی نظریں اپنی پیٹھ پر سرسراتی محسوس ہوئیں۔

دونوں منتظر تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی وہ میری طرف لپکیں اور مجھ کو خوش کرنے کے لیے وہ سب کرنے لگیں جو صرف بچّے کر سکتے ہیں، اور میں نے بھی وہ سب کیا جو کوئی آدمی بچّوں کے سوا کسی اَور کی خوشی کے لیے نہیں کر سکتا، اور جس سے خود اُس کا خوش ہونا ضروری نہیں ہوتا۔ مگر میں نے اُنھیں کھڑکی کے قریب نہیں جانے دیا، البتہ خود کئی بار اُدھر گیا اور ہر بار میں نے دیکھا کہ تیز ہموار ہوا جنگل کے درختوں کو ایک طرف جھکا رہی ہے اور نوروز کے مکان سے کوئی نہ کوئی آنکھ کھڑکی کی طرف لگی ہوئی ہے۔

آج میں اُس کو ضرور ڈھونڈھ نکالوں گا، میں نے سوچا، چاہے اس کے لیے مجھے آدھے جنگل میں آگ جلانا پڑ جائے۔ لیکن میں آدھی رات کے بعد تک سوتا رہ گیا۔ میری آنکھ دکان کے دروازے پر دستک کی آواز سے کھلی۔ میں نے کچھ دیر تک کسی کے پکارنے کا انتظار کیا، پھر اٹھ کر کھڑکی میں سے دیکھا، بڑے کمبل میں لپٹے ہوئے نوروز کو پہچانا اور اتر کر نیچے آ گیا۔ اُس نے میرا ہاتھ آہستہ سے پکڑ کر چھوڑ دیا اور مڑ کر واپس چلا۔ میں نے دروازہ مضبوطی سے بند کیا اور کچھ فاصلہ دے کر اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

اُس کی چال میں ایک وحشیانہ ناہمواری تھی اور اگر میں نے اس سے ملنے کا تہیہ نہ کر رکھا ہوتا تو شاید مجھے اس کے ساتھ جانے میں تامّل ہوتا۔ میں نے دیکھا کہ ناہموار چال کے باوجود اس کے قدم بے آواز پڑ رہے ہیں۔ میں بھی احتیاط سے قدم رکھنے لگا اور اس احتیاط نے میری اپنی چال میں بھی ناہمواری پیدا کر دی۔ اُس وقت اگر کوئی ہم کو دیکھتا تو اسے یہ کرید ضرور ہوتی کہ یہ کون لوگ ہیں اور اس وقت باہر کیوں ہیں۔ میں نے سوچا اُس دیکھنے والے کو ہمارے بارے میں کوئی اچھا خیال نہ آتا۔ خود مجھے بھی اس وقت نوروز کے بارے میں کوئی اچھا خیال نہیں آ رہا تھا۔

دہانہ آ گیا تھا۔ مجھے اندر کی فضا کچھ کچھ روشن نظر آئی حالاں کہ ابھی صبح کے آثار نہیں تھے۔ نوروز نے مڑ کر میرا ہاتھ پکڑا اور جنگل میں داخل ہو گیا۔ کئی موڑ مُڑ کر ہم شکستہ ستونوں کی ایک قطار کے پاس سے گزرتے ہوئے ایک شش پہلو سنگی چبوترے کے سامنے ٹھہر گئے۔ چبوترے کے بیچ میں لکڑیوں کا ایک چھوٹا سا ڈھیر جل رہا تھا جس میں سے کسی دوائی روغن کی سی خوشبو نکل رہی تھی اور تھوڑا تھوڑا دھواں بھی اٹھ رہا تھا۔

نوروز نے میری طرف دیکھا۔

"دونوں ٹھیک ہیں،" میں نے اُسے بتایا، پھر کہا: "تمھارے مکان میں کچھ لوگ آ گئے ہیں۔"

"میرے کنبے والے،" اس نے کہا، "سوتیلے رشتہ دار۔"

"تمھاری تلاش میں آئے ہیں؟"

"نہیں، میرے غائب ہو جانے کا یقین ہو جانے کے بعد آئے ہیں۔"

"کیوں آئے ہیں؟"

"وہ خود بتائیں گے،" اس نے کہا، اور پوچھا: "اُن کے ساتھ بھائی بھی ہے؟"

"نہیں،" میں نے کہا، "یا شاید ہو۔ میں نے اُسے نہیں دیکھا۔"

"اور کوئی بہت بوڑھا آدمی؟"

"میں نے اُسے بھی نہیں دیکھا،" میں بولا اور دل ہی دل میں بلاسبب شرمندہ ہوا۔

نوروز چبوترے کے ایک سرے پر ٹک گیا۔ میں بھی اس سے ذرا ہٹ کر بیٹھ گیا۔ لکڑیوں کی ہلکی روشنی میں مجھ کو اس کے چہرے پر تھوڑا تھوڑا پاگل پن نظر آیا، لیکن یہ بھی معلوم ہوتا تھا کہ وہ تکلیف کی زندگی گزار رہا ہے جس کی پرچھائیاں اس کے چہرے پر کچھ کچھ دیر بعد دوڑتی تھیں اور اُس وقت اس کا پاگل پن غائب سا ہو جاتا تھا۔

"وہ ابھی دکان پر نہیں آئے؟" اس نے پُرسکون لہجے میں پوچھا۔

"آئے تھے،" میں نے کہا، "تین دن پہلے۔"

"تین دن --- نہیں، وہ دوسرے لوگ تھے،" اس نے کہا، "کچھ خریدنے آئے ہوں گے۔"

"ہاں، انھیں کچھ خریدنا تھا،" میں نے کہا، "لیکن وہ تم سے ملنا بھی چاہتے تھے۔"

میں نے اُن نامانوس آوازوں کی پوری روداد بیان کر دی، اُسی طرح تفصیل کے ساتھ جس طرح بچی کے غائب ہونے کی روداد بیان کی تھی۔ نوروز سر جھکائے سب کچھ سنتا رہا اور اس کے بعد بھی بہت دیر تک سر جھکائے بیٹھا رہا یہاں تک کہ رات آخر ہونے لگی۔ میں اُس کے بولنے کا انتظار کر رہا تھا لیکن وہ معلوم نہیں کیا سوچ رہا تھا۔ چبوترے پر جلتی ہوئی لکڑیوں سے تیز خوشبو آئی اور میں نے اُدھر دیکھا۔ اُن میں سے گاڑھا گاڑھا دھواں اٹھ رہا تھا۔ پھر ہلکی آواز کے ساتھ دھواں پھٹا اور شعلے بلند ہوئے۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ہم کسی اُجاڑ عبادت خانے میں بیٹھے ہیں۔ شعلے ایک طرف جھکے اور اوپر پتوں کی تیز سرسراہٹ سنائی

دی۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اونچے درختوں کی چوٹیاں اس طرح جھونکے کھا رہی تھیں کہ مجھ کو بار بار اُن کے درمیان سے آسمان کی بڑھتی ہوئی نیلاہٹ نظر آ جاتی تھی۔ دیر کے بعد میں نے نوروز کی طرف دیکھا۔ وہ اُسی طرح بیٹھا ہوا تھا اور چبوترے پر جلتی ہوئی لکڑیوں کی روشنی پھیکی پڑتی جا رہی تھی۔

"نوروز!" میں نے اسے دھیرے سے پکارا۔

"وہ دوسرے لوگ ہیں،" اس نے کہا، "دور سے آئے ہیں۔ بُرے لوگ نہیں ہیں۔ وہ کھنڈروں کے لیے آئے ہیں۔"

"وہ تم سے کیوں ملنا چاہتے تھے؟"

"انھیں کھنڈروں کے بارے میں کچھ معلوم ہوا ہے۔ اب وہ اَور کچھ -- شاید سب کچھ -- معلوم کرنا چاہتے ہیں۔"

"لیکن وہ تم سے کیوں ملنا چاہتے تھے؟"

"اُنھیں اُس نسل کے بارے میں بھی کچھ معلوم ہوا ہے جس نے یہ کھنڈر --- جس نے وہ عمارتیں بنائی تھیں جن کے یہ کھنڈر ہیں۔"

"لیکن وہ تم سے کیوں ملنا چاہتے تھے؟" میں نے پھر پوچھا۔ مجھے اس کے سوا اس وقت کوئی سوال یاد نہیں آ رہا تھا۔

"وہ دونوں اُسی نسل سے ہیں،" نوروز آہستہ سے بولا، "تم نے ان کی آنکھیں نہیں دیکھیں؟"

مجھے اُن تصویری آنکھوں کی جلتی بُجھتی روشنیاں یاد آئیں۔ پھر کچھ اَور سوال یاد آ گئے۔

"اُن کی ماں کون تھی، نوروز؟"

"اُس کی آنکھیں بھی ایسی ہی تھیں،" اس نے سرگوشی کی۔

"وہ کون تھی؟"

"نہیں ہے،" اس نے کہا اور اس کے لہجے میں وحشت آ گئی، "بتا چکا ہوں۔"

"وہ تمھاری کون تھی؟"

"یہ بھی بتا چکا ہوں۔"

پھر اس نے میری طرف بڑی ہمدردی کے ساتھ دیکھا اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ

دیا۔

"نہیں ہے،" اس نے پھر کہا، "اُس کے سب لوگ بھی کب کے ختم ہو چکے۔ صرف وہ رہ گئی ہیں جو تمھارے پاس ہیں۔"

"تمھارے کنبے والے کیوں آئے ہیں؟"

"شاید وہ کھنڈروں والے اُن کے پاس پہنچ گئے۔"

"اُن کے پاس۔۔۔" میں کچھ کہتے کہتے رُک گیا۔

نوروز نے بہت غور سے میرا جائزہ لیا۔ صبح کی بڑھتی ہوئی روشنی میں اب وہ صاف نظر آرہا تھا۔ ہیئت اُس کی بالکل پاگلوں کی سی تھی لیکن اس روشنی میں، اوپر کی طرف نگاہیں اٹھائے ہوئے، وہ پاگل سے زیادہ کسی وحشی قوم کا ولی معلوم ہوتا تھا اور اس نے ولیوں ہی کے سے انداز میں کہا:

"سب کچھ جھیلنا چاہیے،" پھر اُس کی آنکھوں میں وحشت اور آواز میں غرّاہٹ آ گئی، "اس لیے کہ سب کچھ جھیلنا پڑتا ہے۔"

پھر وہ بہت تھکا ہوا معلوم ہونے لگا۔ مجھے شبہ ہوا کہ وہ کئی راتوں سے جاگ رہا ہے، تاہم میں نے پوچھا:

"تمھارے کنبے والے۔۔۔ تم اُن سے ملو گے؟"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"اُن سے مجھ کو باتیں کرنا ہوں گی؟"

نوروز چپ رہا۔

"اُن کو تمھارے بارے میں بتا دوں؟"

وہ اسی طرح خاموش بیٹھا رہا۔ میں نے آہستہ سے پکارا:

"نوروز!"

وہ پھر بھی کچھ نہیں بولا۔

میں اٹھ کر اُس کے پاس آ کھڑا ہوا۔ وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ اُس نے اپنا جملہ دُہرایا، لیکن اس بار کسی وحشت کے بغیر، ولیوں کے لہجے میں:

"سب کچھ جھیلنا پڑتا ہے۔"

پھر وہ مڑا اور مجھے وہم بھی نہیں ہوا کہ میں نے اُس کی آواز آخری بار سنی ہے۔ اس

نے کمبل میں خود کو ٹھیک لپیٹا اور بالکل ہموار چال سے اُس طرف چلا گیا جدھر شاید جنگل کا دوسرا نکاس تھا۔

اُس کے غائب ہو جانے کے بعد میں بھی مڑا اور جنگل سے باہر آ گیا۔

۶

واپس پہنچنے کے تھوڑی ہی دیر بعد، حالاں کہ ابھی بہت سویرا تھا، مجھے بتا دیا گیا کہ نوروز کے کنبے والے آ گئے ہیں اور اُس کی دکان، مکان اور دوسری چیزوں کے تصفیے کے لیے قصبے کے خاص لوگوں کی ایک بیٹھک میں مجھ کو بھی شریک ہونا ہے۔ کئی راتوں سے میں پوری نیند نہیں سویا تھا اور اس وقت مجھے نوروز کے آخری جملے کے سوا وہ گفتگو بھی ٹھیک سے یاد نہیں تھی جو کچھ دیر پہلے اس کے ساتھ جنگل میں ہوئی تھی، اس لیے اس اطلاع نے مجھ پر کوئی خاص اثر نہیں کیا اور وہاں جانے سے پہلے کا سارا وقت میں نے بچّیوں کے کاموں اور اُنھیں کچھ کچھ ہنسانے میں گزار دیا۔

o o o

"ہم نے نوروز کے ملنے کی امّید چھوڑ دی ہے،" مہربان آدمی نے مجھ سے کہا۔

"وہ اب نہیں ملے گا،" میں نے یقین کے لہجے میں کہا اور دل میں بھی اس بات کا پورا یقین کیا۔

"ان لوگوں کو بھی امّید نہیں ہے،" اُس نے نوروز کے کنبے والوں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

ہم نوروز کے مکان کی پُشت پر جمع تھے اور وہ سب مکان کی دیوار سے لگ کر بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھ کو اُن کی تعداد کا اندازہ نہیں ہوا لیکن اُن میں نوروز کا بھائی بھی تھا۔ میں نے اُسے دیر تک دیکھا۔ اُس کے چہرے پر سوکھے ہوئے زخموں کے نشان تھے۔ دو مضبوط آدمی اُس کو دونوں طرف سے پکڑے ہوئے تھے، پھر بھی اُس کے اندر کوئی چیز زور کرتی تھی جو اُن دونوں آدمیوں کو بار بار ہلا دیتی تھی۔

جنون کی طاقت، میں نے سوچا، اور مہربان نے مجھے اُس کی طرف دیکھتے دیکھ کر کہا:

"یہ انھیں لوگوں کی نگرانی میں ہے، اور وہ بھی،" اُس نے ان لوگوں کے بالکل بیچ میں دیوار سے ذرا آگے بڑھ کر بیٹھے ہوئے ایک شخص کی طرف اشارہ کیا۔

وہ ایک بہت بوڑھا آدمی تھا جس کے سارے دانت اور سر کے بال غائب تھے؛ بھنویں بھی نہیں تھیں۔ اس کی آنکھیں اس طرح بجھی ہوئی تھیں کہ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ اندھا ہے یا دیکھ سکتا ہے۔ وہ انگلیوں پر کچھ گنے جا رہا تھا، بیچ بیچ میں ایک ہاتھ کی انگلی سے دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی پر کچھ لکھتا بھی تھا اور لکھنے سے پہلے آسمان کی طرف ضرور دیکھتا تھا۔ سر سے پیر تک وہ جھرّیوں کا بنا ہوا معلوم ہوتا تھا اور اگرچہ میں اُسے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا، پھر بھی مجھے یقین نہ آتا تھا کہ آدمی اتنا بوڑھا ہو سکتا ہے۔

"یہ ایک پُرانا نوروز ہے،" مہربان کی آواز آئی، "دو پُشت پہلے کا۔"

مجھے تعجب سا ہوا کہ وہ کسی سہارے کے بغیر بیٹھا ہوا ہے۔ جنون کی طاقت، میں نے پھر سوچا۔

"اور اگر یہ کھویا ہوا نوروز مل جائے تو اس کی بھی نگرانی یہی لوگ کریں گے،" مہربان نے کہا، "اور اِنھیں کو کرنا بھی چاہیے۔"

"ظاہر ہے،" میں نے کہا۔

مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ اُن کی طرف سے ساری گفتگو اُسی کو کرنا ہے، اس لیے میں اُسی کی طرف دیکھتا رہا۔ کنبے والوں میں سے ایک نے بڑھ کر اُس سے کچھ سرگوشی کی۔ اس نے جواب میں سر ہلایا اور مجھ سے بولا:

"اب سوال نوروز کی بیٹیوں کا ہے۔"

"یہ کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ وہ نوروز کی بیٹیاں ہیں؟" میں نے کہا۔

"ان کا کوئی دعوے دار سامنے نہیں آیا ہے۔"

اس کا جواب میرے ہونٹوں تک آتے آتے رُک گیا۔ مہربان نے مجھے خاموش دیکھ کر کہا:

"آخر وہ کسی کی تو کوئی ہوں گی؟"

"وہ نوروز کی دکان کا مال ہیں،" میں نے کہا۔

"اور نوروز کی دکان کس کا مال ہے؟" میرے اندازے کے برخلاف کنبے والوں میں سے کوئی بول اٹھا۔

"خیر،" مہربان نے اُس بولنے والے کو آنکھ سے کچھ اشارہ کیا، پھر مجھے بتایا: "اِن لوگوں نے دکان ختم کر دینے کا فیصلہ کیا ہے، اور یہ فیصلہ کرنا بھی اب انھیں کا حق ہے۔"

"ظاہر ہے،" میں نے پھر کہا۔

"اب ان بچیوں کا فیصلہ کرنا ہے، نوروز۔"

"میرا نام ساسان ہے،" میں نے کہا۔

"تمھارا خاندانی نام،" وہ زرا اُداس ہو کر بولا، "مجھے معلوم ہے۔ خیر، اب ان کا فیصلہ۔۔۔"

"ان کا فیصلہ کرنا بھی کنبے والوں ہی کا حق ہے،" میں نے کہا۔

"تم نے اُن کو بڑی اچھی طرح رکھا۔ یہ سب تمھارا احسان مانتے ہیں۔"

"ان کی مہربانی ہے۔"

اب معلوم ہوتا تھا اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ بات کو کس طرح آگے بڑھائے۔ خود مجھے، شاید جاگنے کی وجہ سے، اکتاہٹ سی محسوس ہو رہی تھی، اور وہ مجھ پر مہربان بھی بہت تھا، اس لیے میں نے کہا:

"وہ کچھ دن کے لیے مجھے اس امّید پر دی گئی تھیں کہ نوروز واپس آ جائے گا۔ اب اُن پر اُس کے کنبے والوں کا حق ہے، اور آئندہ انھیں پالنا ان کا فرض بھی ہے۔ وہ چاہیں تو ابھی انھیں لے جائیں۔" مجھے تعجب بھی نہیں ہوا کہ یہ بات میں نے اتنی سہولت سے کہہ دی۔ "لیکن وہ میرے سوا کسی آدمی کو دیکھنے کی عادی نہیں ہیں،" میں نے یہ بات بھی اُتنی ہی سہولت سے کہہ دی۔ "اگر انھیں میرے ساتھ باہر نکلنے دیا گیا ہوتا۔۔۔" تب میرے لہجے میں شاید کچھ آزردگی آ گئی۔

مہربان آدمی نے بڑھ کر مجھ کو چمٹا لیا۔

"عادی ہو جائیں گی،" وہ بولا، "ابھی بہت چھوٹی ہیں۔ آخر وہ تمھاری بھی عادی ہو گئیں کہ نہیں؟"

میں نے خاموشی کے ساتھ خود کو اس کی گرفت سے چھڑایا اور وہ بولا:

"ہمارا خیال ہے پہلے اُن کو نوروز کے مکان میں رکھا جائے، پھر۔۔۔"

"لیکن کم سے کم دو دن تک کوئی اَور اُن کے قریب نہ جائے۔"

"بالکل۔ یہ لوگ دوسری جگہ رہ لیں گے۔ تم جس طرح کہو گے اُسی طرح ہو گا،" اس نے کہا اور ایک بار پھر مجھے چمٹانے کی کوشش کی، لیکن میں وہاں سے چلا آیا۔

دکان کے اندر سے اور اوپر اپنے ٹھکانے سے میں نے کئی پھیروں میں اُن کے کھیلنے

کی چیزیں اور اُن کی ضرورت کا سامان نوروز کے مکان میں پہنچایا۔ اس میں مجھے توقع سے زیادہ دیر لگ گئی، شاید اس لیے کہ میں ہر پھیرے میں نوروز کے مکان کا جائزہ بھی لیتا تھا۔ یہ پورا پتھر کا بنا ہوا اور بہت مضبوط تھا۔ دکان اور میرے ٹھکانے کی دیواریں اور چھتیں اس کے مقابلے میں بوسیدہ ہو چکی تھیں اور زیادہ دن چلنے والی معلوم نہیں ہوتی تھیں۔ میں نے سوچا کہ مجھے شروع ہی سے انھیں اس مکان میں رکھنا چاہیے تھا۔ پھر میں جا کر اُن کو بھی لے آیا۔

جیسا کہ میرا خیال تھا، وہ اس نئی جگہ کو اور ایک ساتھ اتنی ساری چیزوں کو دیکھ کر خوش ہو گئیں اور کھیل میں لگ کر انھیں پتا بھی نہیں چلا کہ میں دروازہ بھیڑ کر واپس جا رہا ہوں۔

o o o

بڑی آندھی بھی اُسی دن آئی۔ قصبے کے کچھ لوگوں کو کئی دن سے اس کے آنے کا اندیشہ ہو رہا تھا۔ وہ موسموں کے ماہر تھے اور آسمان کی رنگت اور ہواؤں کی کیفیت دیکھ کر معمولی آندھیوں کے آنے کا وقت بھی بتا سکتے تھے۔ دو تین دن سے میں بھی دیکھ رہا تھا کہ آسمان کے ہلکے گھرے ہوتے ہوئے گدلے رنگ میں سورج کبھی مدھم پیلا دکھائی دیتا ہے، کبھی چاند کی طرح سفید؛ اور ہوا چلتے چلتے رک جاتی ہے، پھر جیسے چونک کر تیزی سے چلنے لگتی ہے اور آسمان کا نیلاپن واپس آ جاتا ہے؛ پھر ہوا رک رک کر چلتی ہے جیسے ٹھوکریں کھا رہی ہو، اور آسمان گدلا جاتا ہے۔ لیکن مجھے نہیں معلوم تھا، نہ کسی نے مجھے بتایا، کہ یہ بڑی آندھی کے آثار ہیں۔

نوروز کے مکان کا دروازہ بھیڑ کر آہستہ آہستہ چلتا ہوا میں سڑک کے موڑ تک آ گیا تھا۔ میں نے جنگل کے دہانے کے پاس ایک نئی وضع کی گاڑی کھڑی دیکھی جس پر سے کچھ سامان اتارا جا رہا تھا۔ سامان میں چھوٹے چھوٹے خیموں اور عام ضرورت کی چیزوں کے علاوہ زمین اور عمارتوں کی پیمائش کے آلات بھی تھے۔ کسی قریبی قصبے کے دو آدمی سامان اتارنے والے مزدوروں کو ہدایتیں دیتے جا رہے تھے۔ میں دل چسپی کے بغیر یہ سب دیکھتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا ہوا میں کتنی دور نکل آیا ہوں۔ آخر میرے پاؤں جواب دینے لگے تب مجھے احساس ہوا کہ میں دوسرے قصبے کی سرحد تک آ پہنچا ہوں اور سورج ڈوبنے کا وقت قریب آ رہا ہے۔ ہوا رکی ہوئی تھی اور کچھ فضا کے حبس اور کچھ اِس وجہ سے کہ میں بہت دیر سے رکے بغیر چل رہا تھا، مجھے گرمی لگنے لگی۔ میں پلٹ پڑا اور

تیزی سے قدم بڑھاتا اپنے قصبے کی طرف چلا، لیکن تھوڑی ہی دیر میں مجھ کو پیر اٹھانا مشکل ہو گیا۔ میں سڑک کے کنارے کی جنگلی گھاس پر بیٹھ گیا اور شاید بیٹھے ہی بیٹھے سو جاتا، لیکن نیند کی پہلی جھپکی آتے آتے اچانک مجھ کو ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے مجھے ایک طرف دھکا دے دیا ہو۔ میں نے چونک کر آنکھ کھولی۔ آس پاس کوئی نہیں تھا۔ خواب، میں نے سوچا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی دور بڑھا ہوں گا کہ پھر کسی نے مجھے آہستہ سے ایک طرف ہٹا دیا۔ اُس وقت مجھے احساس ہوا کہ ہوا چلتے چلتے جھٹکے کھا رہی ہے۔ اچانک اُس کی رفتار بہت تیز، پھر اور تیز ہو گئی۔ میں پیروں پر زور دیے بغیر آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ اب مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ میں آندھی کی زد میں ہوں اور یہ عام آندھی نہیں ہے۔ جنگل کا دہانہ، پھر وہاں سے میرا ٹھکانا بہت دور نہیں تھا، لیکن ایک بار ہوا نے رخ بدلا اور میرے قدم راستے سے ہٹ گئے۔ پھر ہوا نے کئی رخ بدلے، گرد بھی اڑنے لگی اور مجھے آنکھیں کھلی رکھنا دشوار ہو گیا۔ مجھے نہیں معلوم میں کتنی سمتوں میں کتنی دور ہوا کے ساتھ چلتا رہا۔ کبھی کبھی ہوا کے جھکڑ نیچے اتر کر اس قوت سے اوپر اٹھتے کہ میرے پیروں کو زمین پکڑے رہنا دشوار ہو جاتا۔ معلوم ہوتا تھا میرے بچپن کے وہ خواب کہ میں پرندوں کی طرح اڑ رہا ہوں، آج ہمیشہ کے لیے پورے ہو جائیں گے، لیکن اُسی وقت ہوا کچھ دھیمی ہوئی، مجھے جنگل کی آوازیں سنائی دیں، کچھ شاخیں چرچرائیں اور میری ناک میں دوائی روغن کی کچی خوشبو آنے لگی۔ پھر ہوا نے رخ بدلا اور خوشبو غائب ہو گئی۔

میری پیٹھ کسی سخت چیز سے جا لگی اور میں نے دیکھا کہ میں وہاں پہنچ گیا ہوں جہاں سڑک سے کچھ فاصلے پر جنگلی گھاس کے ایک چھوٹے سے نشیب کے بعد سپاٹ چوٹیوں والی خشک پہاڑیوں کا نیچا سلسلہ شروع ہوا تھا۔ میرے سامنے سڑک تھی جس کے متوازی جنگل کے بیرونی درختوں کی رخنوں دار دیوار جھوم رہی تھی اور عنقریب گرنے والی معلوم ہوتی تھی۔ میری تھکن غائب ہو گئی اور میں تیزی سے ایک پہاڑی پر چڑھتا چلا گیا۔ آس پاس کی قدرے اونچی پہاڑیوں نے یہاں ہوا کا زور کم کر دیا تھا اور میں جس پہاڑی پر تھا اس کی چوٹی بیچ سے دھنسے ہوئے چبوترے کی طرح تھی۔ وہاں بیٹھ کر میں نے خود کو آندھی سے محفوظ محسوس کیا اور اب ایک تماشائی کی طرح سڑک کو اور جنگل کو دیکھنے لگا۔

دو چھوٹے خیمے سڑک پر لوٹتے ہوئے گزرے۔ اُن کی طنابوں میں پیمائش کے آلات پھنسے ہوئے تھے۔ کچھ دور جا کر ایک خیمے کو سڑک کے کنارے کسی چیز نے اُلجھا لیا، دوسرا خیمہ

تھوڑا بھولا، ایک بڑے بگولے میں آ کر ناچتا ہوا اوپر اٹھا اور معلوم نہیں کہاں غائب ہو گیا۔ پھر میں نے دیکھا کہ وہ گاڑی جو مجھے جنگل کے دہانے پر نظر آئی تھی، بیچ سڑک پر اپنے آپ چلتی ہوئی آ رہی ہے۔ میرے سامنے پہنچ کر وہ دو تین بار ٹھٹھکی، جیسے راستا یاد کر رہی ہو، اس نے اپنی جگہ کئی چکّر کاٹے، پھر اُسی طرف واپس چلی جدھر سے آ رہی تھی۔ اُسی وقت ہوا کا ایک جھکڑ نیچے اترا، گاڑی سڑک کے ایک کنارے کی طرف مڑی، پھر دوسرے کنارے کی طرف لپکی، پھر الٹ گئی اور لُڑھکنیاں کھاتی ہوئی نشیب میں جا گری۔ اس کا صرف ایک پہیا سڑک پر کمھار کے چاک کی طرح گھومتا ہوا رہ گیا۔، پھر وہ بھی کہیں غائب ہو گیا۔

اب میں نے جنگل کی طرف دیکھا۔ اس رخ سے اور اتنی اونچائی سے میں نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا، لیکن یہاں سے بھی اس کی باہری ہیئت کا اندازہ نہیں کر سکا اس لیے کہ اس وقت اس کی کسی چیز کو قرار نہیں تھا۔ درختوں کی چھتریاں کبھی چپٹی ہو کر سبز جھنڈوں کی طرح لہرانے لگتیں، کبھی چھوٹے چھوٹے، آپس میں ٹکراتے ہوئے گچھوں میں بٹ جاتیں۔ اونچی جھاڑیاں اس طرح لیٹ لیٹ جاتیں کہ درختوں کی رخنوں دار دیوار کے پیچھے کھنڈر صاف نظر آنے لگتے۔ کبھی یہ معلوم ہوتا کہ ہوا پاگل ہو گئی ہے یا بچّوں سے کھیل رہی ہے، اور کبھی یہ کہ کئی ہوائیں ہیں جن میں جنگل کے درختوں کے لیے چھینا جھپٹی ہو رہی ہے۔ ہوا نے دَم بھر کو رُک کر نیچے سے اوپر کی طرف زور باندھا۔ اب ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سارے جنگل کے رونگٹے کھڑے ہو گئے ہیں۔ یہ ابتدا تھی۔ اس کے بعد کبھی یہ معلوم ہوتا تھا کہ آسمان کسی پُھنکارتے ہوئے اژدہے کی طرح پورے جنگل کو اپنی سانس سے کھینچ کر نگل لینا چاہتا ہے، کبھی یہ کہ درخت کھنڈروں کو عقابوں کی طرح پنجے میں دبوچ کر اڑنے ہی والے ہیں۔ لیکن کھنڈر اپنی جگہ سے نہیں ہلے، البتہ پتلے تنوں اور گھنی چھتریوں والے کئی درخت اکھڑ کر اپنی جڑوں کی مٹّی اڑاتے ہوئے دور دور جا گرے۔ ہوا کی ایک رَو میری طرف آئی۔ جڑوں کی کچھ مٹّی میرے منھ پر پڑی اور میری ناک میں پھر دوائی روغن کی سی خوشبو آئی۔

آوازیں بہت طرح کی تھیں، مگر ان سب پر ہوا کے سنسنانے کی آواز حاوی تھی اور یہی آواز سنتے سنتے مجھ پر نیند یا شاید بے ہوشی طاری ہونے لگی۔ بالکل غافل ہونے سے پہلے مجھ کو دور پر قصبے کے مکانوں کے گرنے کی آوازیں سنائی دیں اور میرے ذہن میں ایک ڈوبتا ہوا سوال اُبھرا کہ میں اس پہاڑی پر کس طرح پہنچ گیا اور یہاں کیا کر رہا ہوں۔

۷

میری آنکھ دھوپ کی تپش سے کھلی۔ کچھ دیر میں دماغ کی دھند صاف ہوئی اور مجھے سب کچھ یاد آنے لگا۔ میرے سامنے دور تک پھیلے ہوئے کھنڈر تھے جن کو کہیں کہیں سبزے نے ڈھانپ لیا تھا۔ بیچ بیچ میں اکّادکّا چھوٹے درخت ساکت کھڑے تھے اور ہمواری کے ساتھ بہتی ہوئی نرم ہوا ان کی شاخوں سے بے آواز گزر رہی تھی۔ میں کچھ دیر تک کھنڈروں کو دیکھتا رہا۔ اتنی دور سے پتّھر کے شکستہ کھمبوں اور پُرانے درختوں کے آدھے ادھورے تنوں میں فرق کرنا مشکل تھا۔

اگر یہ عمارتیں سالم ہوتیں، میں نے سوچا، تو بڑی تباہی مچتی۔ پھر میں پہاڑی سے نیچے اتر آیا۔ قصبے تک پہنچنے میں مجھے دیر نہیں لگی۔ سڑک کے آخری موڑ پر پہنچ کر میں نے دیکھا، جنگل کا دہانہ غائب ہو چکا تھا لیکن سامنے دور پر نوروز کی دکان منھ کھولے نظر آ رہی تھی۔ پھر بھی میں نے اُدھر جانے سے پہلے قصبے کا ایک چکّر لگایا اور لوگوں سے باتیں کیں۔ درختوں اور مکانوں کو نقصان بہت ہوا تھا مگر جانیں، چند مویشیوں کے سوا، سب کی محفوظ رہی تھیں اس لیے کہ لوگ تیار تھے اور یہ علاقہ ہمیشہ سے آندھیوں کی گزرگاہ میں تھا۔ اس وقت قریب قریب سب لوگ ٹوٹے پھوٹے مکانوں کی فی الوقتی مرمّت اور راستوں کی صفائی میں لگے ہوئے تھے۔ میں صرف سیر دیکھتا ہوا واپس لوٹا۔ نوروز کے مکان پر آندھی کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا بلکہ اُس کا دروازہ بھی جس طرح میں بھیڑ کر گیا تھا اُسی طرح بھِڑا ہوا تھا۔ پھر میں نوروز کی دکان کے سامنے پہنچا۔ اس کا دروازہ ہوا کے جھونکوں سے اکھڑ گیا تھا، مگر وہ جھونکے معلوم نہیں کس طرح کے تھے کہ دروازہ دکان کے اندر کی طرف گرنے کے بجائے باہر پڑا ہوا تھا۔ پھر میں نے اپنے ٹھکانے کو دیکھا۔

وہ موجود تھا، لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی نے اُسے اٹھا کر اچھی طرح جھنجھوڑنے کے بعد واپس رکھ دیا ہو۔ اب وہ دکان کے سر پر کسی بدوضع کلاہ کی طرح دھرا ہوا نظر آ رہا تھا اور رہنے کے قابل نہیں رہ گیا تھا۔ میں نے یاد کرنے کی کوشش کی کہ وہاں کیا کیا تھا۔ اُسی وقت مجھے اپنی پیٹھ پر کسی ہتھیلی کا لمس محسوس ہوا۔

''نقصان تو ہر طرف ہوا ہے، ساسان،'' مہربان میرے پہلو میں کھڑا کہہ رہا تھا۔ ''غنیمت ہے کہ جانیں بچ گئیں۔''

اس نے رک کر مجھ کو دیکھا، پھر بولا:

"اور یہ بھی غنیمت ہوا کہ وہ لوگ آندھی سے پہلے ہی یہاں سے چلے گئے تھے۔"

میں نے نوروز کے مکان کے بھڑے ہوئے دروازے کو دیکھا، پھر مہربان کو۔

"اُن کا علاقہ آندھیوں کے راستے میں نہیں ہے،" اس نے کہا، "اس لیے وہ ڈر بھی رہے تھے۔ اُنھیں تیز ہواؤں کی عادت نہیں ہے۔ وہ تو اَور پہلے نکل جاتے، لیکن اُس پُرانے نوروز کی وجہ سے انھیں کچھ دیر ہوئی۔ وہ جانا نہیں چاہتا تھا، کہتا تھا بڑی آندھی دیکھوں گا۔ اور، تم جانتے ہو ساسان، پاگل کو کسی بات پر راضی کرنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔"

"اس میں خود بھی کچھ کچھ پاگل بننا پڑتا ہے،" میں نے کہا، پھر پوچھا: "انھوں نے اُسے کس طرح راضی کیا؟"

"پتا نہیں۔ اُسے الگ لے گئے تھے،" وہ بولا۔ "پھر کچھ دیر یہاں کی بےوقوف عورتوں نے لگوائی۔"

مجھے قصبے میں عورتوں کی موجودگی کا کوئی خاص احساس نہیں تھا، اس لیے میں نے زرا تجسس سے پوچھا:

"عورتوں نے کیوں؟"

"اُنھوں نے تمھاری--- انھوں نے بچّیوں کو دیکھا تو ہنگامہ کرنے لگیں کہ ہم انھیں نہیں جانے دیں گے۔ اور یہ عورتیں تو، تم جانتے ہو؛ روناپیٹنا ہونے لگا۔ تم تھے نہیں اور--- بس یوں سمجھ لو کہ آندھی سے پہلے ایک چھوٹا سا بھونچال آگیا تھا۔"

"میں اُس وقت باہر تھا،" میں نے کہا۔

"ہاں، ہم تمھیں بلانے آئے تھے۔"

وہ بہت دیر تک میرے چہرے کو دیکھتا رہا، پھر ہاتھ پکڑ کر مجھے دکان کے اندر لے آیا۔ یہاں آندھی کا کوئی اثر نظر نہیں آتا تھا۔ باہر جو گرد ابھی تک اڑ رہی تھی وہ بھی یہاں نہیں پہنچی تھی۔ معلوم نہیں وہ کیسی ہوا تھی، میں نے سوچا، یا معلوم نہیں یہ کیسی دکان ہے۔ پھر میں مہربان کی طرف مڑا۔ اُس نے دونوں کاندھوں سے دبا کر مجھ کو تخت پر بٹھایا اور خود بھی میرے قریب بیٹھ گیا۔

"اپنے یہاں وہ اُن دونوں کو تھوڑے ہی دن میں بہلا لیں گے،" اُس نے کہنا شروع کیا۔ "آخر وہ دو پاگلوں کو سنبھالے ہوئے ہیں، اُن کے لیے دو بچّوں کو سنبھالنا کون مشکل ہے۔ انھوں نے تو یہیں اُن کو بہلانے کی کوشش کی تھی مگر جب انھیں پتا چلا---"

وہ رکا۔ ابھی تک وہ مجھ کو صرف بتا رہا تھا لیکن اب اس نے مجھ سے زرا آزردگی کے ساتھ پوچھا:

"ساسان، تم نے اُنھیں بولنا بھی نہیں سکھایا؟"

"وہ بولتی ہیں،" میں نے بھی زرا آزردگی کے ساتھ کہا۔

"تمھارے نام کے سوا اور کچھ نہیں۔"

میں چپ رہا۔

"اُنھیں تو چیزوں کے نام تک نہیں آتے۔ خیر، وہ لوگ سکھا دیں گے،" اس نے مجھے تسلی دینے کے انداز میں کہا۔

اس کے بعد وہ کچھ دیر تک خالی مرتبانوں، ٹوکریوں اور اِدھر اُدھر پڑی ہوئی دوسری چیزوں کو دیکھتا رہا، پھر اس کی نظریں کچے فرش پر دوڑیں اور وہ اچانک اٹھ کھڑا ہوا۔

"آؤ، باہر چلیں۔"

"دکان اُن لوگوں نے چھوڑ دی ہے، تمھارے لیے،" اس نے کہا۔ "وہ تمھارا احسان مانتے ہیں۔ اوپر کا حصّہ بھی ہم لوگ ٹھیک کرا دیں گے۔ کم سے کم تمھارے رہنے بھر کا ہو جائے گا۔"

"وہاں میرے کاغذ بھی تھے،" میں نے کہا۔

"وہ کھڑکی کے باہر اڑ رہے تھے،" اس نے جواب دیا، "سب چُن لیے گئے ہیں۔ میرے پاس رکھے ہیں۔"

وہ کچھ دیر تک دکان کے کھلے ہوئے منھ کو دیکھتا رہا، پھر بولا:

"دکان میں کچھ مال نہیں ہے، لیکن جو کچھ بھی ہے تمھارا ہے۔ اب وہ صرف یہ چاہتے ہیں---"

"اب کیا چاہتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"کہ جب تک وہ دونوں تم کو بالکل بھول نہ جائیں تم وہاں، اُن کے پاس، نہ جاؤ۔"

میں خاموش رہا۔ وہ کچھ دیر تک میرے بولنے کا انتظار کرتا رہا، پھر اچانک اُس پر اُداسی کا دورہ سا پڑ گیا۔

"اچھا، میں پھر آؤں گا،" اس نے تھکی ہوئی آواز میں کہا، "ابھی کام بہت ہے، آدمی کم پڑ رہے ہیں۔ تمھارے کاغذ لیتا آؤں گا۔"

وہ واپسی کے لیے مڑا اور جاتے جاتے بولا:

"ابھی وہ بہت چھوٹی ہیں۔ کچھ دن میں سب بھول بھال جائیں گی۔ اس کے بعد، اُن لوگوں نے وعدہ کیا ہے، وہ خود آدمی بھیج کر تمھیں بلوائیں گے۔"

۸

وہ سب کچھ بھول چکی ہوں گی، کاغذوں سے تنگ کر کبھی کبھی میں سر اٹھاتا ہوں اور سوچتا ہوں، لیکن اب تک وہاں سے نہ کوئی آدمی آیا ہے نہ کوئی خبر۔

پھر میں کاغذوں پر جُھک جاتا ہوں۔

(بہ شکریہ سوغات بنگلور شمارہ ۴)

اسد محمد خاں

~~رُکے ہوئے ساون~~ مُرجیاں اور مور

لاجی بائی اسیر گڑھ والی نے تقسیم کے فوراً بعد یہاں آ کر نیپیئر روڈ کا یہ فلیٹ بسا لیا تھا۔

لاجی بائی اپنی ایک نوچی اور ایک لے پالک لڑکے کے ساتھ بمبئی کے بیلارڈ پیئر سے جہاز پر سوار ہوئی تھی اور جہاز سے اُتر کے یہاں کیماڑی کے مِیول مینشن میں موتی سیٹھ شکار پوری کے فلیٹ میں پندرہ روز ٹھہری تھی۔

وہ ایسے ہی نہیں چل پڑی تھی، بڑا مال لائی تھی۔ اسی لیے موتی سیٹھ کے مشورے سے اس نے نیپیئر روڈ پر چوراہے کا یہ فلیٹ خرید لیا۔ پھر ایک شاگرد سے چار شاگردیں ہو گئیں اور وہ جم کے اپنی بیٹھک چلانے لگی۔ گلابی شیڈ والی یہ لائٹیں، پنکھے، صوفہ سیٹ، قالین، مخمل والے گاؤ تکیے -- جو اَب کجلائے ہوئے، میلے میلے سے لگتے ہیں -- لاجی نے اُسی زمانے میں خریدے تھے۔

رنڈیوں، ڈیرے دار نیوں کے بارے میں افواہیں نہیں اُڑا کرتیں۔ اسکینڈل، افواہیں تو شریف زادیوں کا کھیدا اڈانے کے لیے پھیلائی جاتی ہیں۔ مگر عجیب بات تھی، لاجی بائی کے بارے میں جاپانی روڈ پر اور شہر میں طرح طرح کی باتیں اُڑی ہوئی تھیں۔

کوئی کہتا تھا اس کا اصل نام لِیلا ہے، کوئی کہتا تھا نہیں، لیلیٰ ہے اور یہ اسیر گڑھ کے مہاراج کی درباری گائکا تھی۔ کوئی کہتا تھا ناجی نا، مہاراج نے بس ڈال رکھا تھا؛ اسے گانا وانا تو آتا نہیں، پنڈت کوکا کا شمیری کے سب شاستر پڑھے بیٹھی تھی، سمجھو علمِ مسہری کی مُنتہی تھی یہ لیلا بائی، اسی لیے تو مہاراج نے ---

یہ آخری بات دل کو لگتی تھی، کیوں کہ گانے والی آواز تو لاجی کی کبھی کسی نے سنی نہ تھی۔ خیر خواہوں نے مشہور کر دیا تھا کہ نوعمری میں کویل کی طرح کوکتی تھی لاجی بائی، مگر دشمنوں نے سیندور کھلا دیا، بس بیٹھ گئی ہمیشہ کے لیے۔ خود لاجی بائی نے یہ بات کبھی مان کے نہ دی کہ اسے سیندور کھلایا گیا تھا: نہ کبھی اس نے یہ کہا کہ اسے سیندور نہیں کھلایا گیا تھا۔

پتا نہیں کس سَن میں ایک بہت قریب کے آدمی نے، جو اَب زندہ بھی نہیں، لاجی بائی سے گانے کی فرمائش کی تھی تو لاجی نے کہا تھا کہ ڈپٹی صاحب (قریب کا آدمی ڈی ایس پی ریٹائر ہوا تھا)، . . . . کہا تھا: "ڈپٹی صاحب، ہم ایک کے لیے گاتے تھے یا ایک لاکھ کے لیے۔ اب نہ وہ ایک رہا نہ ایک لاکھ۔ اب کیا گائیں۔ ہمارے تو بول بھی یہاں سمجھ نہ آن گے کسی کو۔"

مگر یہ سب چالاکی کی باتیں تھیں۔

لاجی بائی کو گانے بجانے میں کیا ملتا جو چار مسہریاں چلانے سے یافت ہو جاتی ہوگی۔

گل بدن، لاجو، بیلا اور یاسمین -- دو چار برس بعد لڑکیاں بدل جاتی تھیں مگر چاروں نام یہی رہتے تھے۔ اُنھیں واجبی سا گانا سکھا دیا جاتا ہو گا تاکہ مُجروں کی آڑ میں سب چلتا رہے۔

مختصر یہ کہ لاجی بائی کی چار "شاگردیں" تھیں اور وہ ایک لڑکا جس کا اوپر ذکر آیا ہے۔ سب اُسے "لاجی والا" کہتے تھے۔

o o o

سب مجھے لاجی والا جاوید کہتے تھے۔

ہم لوگ جب یہاں آئے تھے اور لاجی صاحب نے یہ فلیٹ خریدا تھا، اُس وقت بہت ہوا تو میں سولہ سال کا ہوں گا۔

فلیٹ پر آنے والوں سے مَیں بات نہیں کر سکتا تھا۔ کوئی مجھ سے کام کے لیے بھی نہیں کہہ سکتا تھا۔ نہ ہی مجھے کسی سے کچھ لینے کی اجازت تھی۔ لاجی صاحب اس معاملے میں بہت سخت تھیں۔

پھر مجھے لوگوں میں بیٹھنے کا ڈھنگ آیا، بات کرنے کی تمیز آ گئی۔ ویسے میل جول مَیں نے کم ہی رکھا۔

بس ایک مظہر علی خاں تھے، بینک افسر، جن سے میری دوستی سی ہو گئی تھی۔ کبھی

کبھی میں اُن کے دفتر چلا جاتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ مظہر علی خاں کوٹھے پر آتے ضرور تھے مگر تماش بین نہیں تھے۔ لاجی صاحب کے "پرستار" تھے وہ۔ اُن کی عمر اُس وقت چوبیس پچیس سال ہو گی۔

میں یہ قصہ اپنی یا لاجی صاحب کی وجہ سے نہیں، مظہر علی خاں کی وجہ سے سنا رہا ہوں۔ بڑے دلیر آدمی تھے؛ پتا نہیں کہاں ہوں گے اب۔

مجھے یاد ہے پہلی بار وہ فلیٹ میں آئے تو دوپہر کا وقت تھا۔ خبر نہیں کیسے فلیٹ کا دروازہ کھلا رہ گیا تھا۔ لاجی صاحب لاوَنج میں بڑے تخت پر گاوتکیہ اور ٹیبل فین لگائے، ململ کی چادر گیلی کر کے پیروں پر ڈالے آرام سے پڑی کچھ گنگنا رہی تھیں کہ ایک خوب صورت جوان، سفید قمیص پر سُرخ عنابی ٹائی باندھے، سرج کی کالی پتلون اور چمچماتے ہوئے بوٹ پہنے فلیٹ کے دروازے پر طبلہ سا بجا کے ہیلو کہتا ہوا گھُس آیا۔

لاجی بولیں: "کیا وحشت ہے؟ کہاں گھُسے آ رہے ہو میاں؟"

یہ "میاں" مظہر علی خاں تھے۔ انھوں نے بڑھ کر لاجی صاحب کے پیر چھُوے۔ لاجی نے پیر سمیٹ لیے۔ وہ آنکھیں پھاڑے خاں صاحب کو دیکھے جا رہی تھیں۔

مظہر خاں ہنستی ہوئی آواز میں بولے: "بہت دن سے آپ کے درشن کرنا چاہتا تھا۔ آپ موسیقی کی تاج دار ہیں، بادشاہ ہیں اس فن کی۔"

لاجی کی تیوریاں چڑھی ہوئی تھیں۔ بولیں: "برخوردار، غلط جگہ آ گئے ہو۔۔۔ وہ ادھر نہیں رہتیں۔"

خاں صاحب ہنس کر بولے: "ہمارے لیے تو آپ ہی ملکۂ موسیقی ہیں۔ اس علاقے میں تو بس آپ ہی کا حکم چلتا ہے، باقی سب آپ کی رعایا ہیں۔"

اس خوشامدانہ جھوٹ اور ڈھٹائی پر لاجی ایک دم ہنس پڑیں۔ وہ ہنسیں تو مظہر علی خاں خود بھی ہنسنے لگے۔ بولے: "میڈم، اِسی مہینے سامنے بینک میں اسسٹنٹ مینیجر ہو کر آیا ہوں۔ اس وقت آپ کا اکاوَنٹ مل جائے تو بہت اچھا ہے۔ کھاتا کھُلوا لیجیے میری برانچ میں۔"

لاجی صاحب انھیں دلچسپی سے دیکھتے ہوئے اب گاوتکیے سے ٹک گئی تھیں۔ ہنس کے کہنے لگیں: "برخوردار، ایسی کیا مصیبت پڑ گئی ہے جو اکونٹ کے لیے کوٹھے جھانکنا شروع کر دیے؟"

بولے: "ایک حرام الدّہر افسر ٹکر گیا ہے۔ کہتا ہے اسسٹنٹ سے پکّا مینیجر اُس وقت تک نہیں بننے دوں گا جب تک اتنی رقم کے اتنے اتنے کھاتے نہیں کھلواؤ گے۔"

"پھر؟ کوئی کھاتا کھولا بھی یا ایسے ہی؟"

مظہر علی خاں کہنے لگے: "میں تو آپ کے سوا یہاں کسی کو جانتا نہیں۔ اور میرا مینیجر، وہ بالکل ہی گیا گزرا۔ دَبّو آدمی ہے۔ وہ تو آپ کو بھی نہیں جانتا۔ اتنا نیک ہے۔ صبح پونے نو بجے گاڑی سے اتر کے بینک میں گھس جاتا ہے، پھر پونے پانچ بجے اندر سے نکل کے گاڑی میں۔۔۔ اور چالیس کی اسپیڈ سے اُڑتا ہوا اس علاقے سے باہر۔"

لاجی صاحب نے کہا: "اے سبحان اللہ!"

مظہر خاں بولے: "تو پھر بسم اللہ کیجیے۔۔۔ بچّیوں کو بھی بلوا لیجیے۔ میں کھاتوں کے بارے میں اُنھیں بھی سمجھا دوں گا۔"

چوبیس پچّیس برس کے ان خاں صاحب نے "بچّیوں" کا ذکر جس طرح کیا تھا اس سے لاجی بس نہال ہو گئیں۔ بہت دیر تک منھ پر ہاتھ رکھے ہنسی روکنے کی کوشش کرتی رہیں، پھر ایک دم ہنسی میں جیسے پھوٹ پڑیں۔

مظہر علی خاں معصوم شکل بنائے کبھی لاجی کو کبھی مجھے دیکھتے رہے۔ لاجی ہنسے جا رہی تھیں تو خاں صاحب مجھ سے بولے: "بھیّا، ذرا بلا لو سب کو۔۔۔ ٹائم کم ہے۔"

میں نے لاجی کی طرف دیکھا۔ انھوں نے ہنستے ہنستے ہاں میں سر ہلا کے مجھے لڑکیوں کو بلانے کا کہہ دیا۔

مظہر علی خاں ہنستی ہوئی لاجی کو سمجھانے لگے: "میڈم، ہنسی کی بات بھی ہے اور نہیں بھی ہے۔ دیکھیے نا، گنتی کے دن ہیں اور لاکھوں روپے کے اکاؤنٹ کھولنا ہیں۔ آپ ہی بتائیے، میں گھٹنوں اور پیروں کو ہاتھ نہ لگاؤں تو اور کیا کروں؟"

فرصت کا وقت تھا۔ لڑکیوں نے لاجی صاحب کی ہنسی کی آواز سن لی تھی۔ انھوں نے لاؤنج میں جمع ہونا شروع کر دیا تو خاں صاحب ایک ایک کو سمجھا کر بچت اور بینکاری کے فائدے بتانے لگے کہ دیکھیے، انسان کتنا غیر محفوظ ہوتا ہے، اور عورتیں تو آپ جانتی ہیں بہت ہی زیادہ غیر محفوظ ہوتی ہیں۔۔۔ خاص طور پر وہ خواتین جنھیں اپنے پیشے میں چمکنے کے لیے بہت کم ٹائم ملتا ہے، جیسے آپ لوگ۔۔۔

"خواتین" اور "پیشے" کے لفظ سن کے تو لاجی کے ساتھ سبھی نے ہنسنا شروع کر دیا

تھا۔

خاں صاحب کی تقریر چل رہی تھی۔ کہہ رہے تھے: "آپ لوگوں کے لیے تو بینک اکاؤنٹ رکھنا اور پیسے بچانا بہت ضروری ہے۔ تاکہ برسات کے دنوں میں جب --- جبکہ سایہ بھی ساتھ چھوڑ جاتا ہے --- سمجھ رہی ہیں نا آپ؟ جب قدردان، نیازمند، پیسا کوڑی خرچ کرنے والے، ناز اٹھانے والے نہیں رہتے تو ایک بینک اکاؤنٹ ہی ہوتا ہے جو سہارا بنتا ہے ---"

لڑکیوں میں سے کچھ ابھی تک منھ پر ہاتھ رکھے ہنسے جا رہی تھیں۔ خاں صاحب ذرا دیر کو رکے ہوں گے کہ گل بدن ایسے شروع ہو گئی جیسے مشاعرے میں داد دے رہی ہو: "واہ بھائی جان! واہ سبحان اللہ! بہت اچھی تقریر کرتے ہو!"

خاں صاحب نے بھی مشاعرے کے شاعر کی طرح چار انگلیاں سیدھی کر کے اُن پر انگوٹھا ٹکایا، پیشانی سے لگا کر آداب عرض کیا اور اسی رفتار میں پھر چل پڑے۔

گل بدن پیچھا چھوڑنے والی کب تھی، سب سے کہنے لگی: "یہ بہت ڈھیٹ، بہت پکا ہے۔ کوٹھوں پہ بہت آنا جانا رہا ہے اس کا --- سارنگی بجاتا تھا پہلے۔"

لاجی صاحب کی ہنسی رک گئی تھی، انھوں نے گل بدن کو گھورنا شروع کر دیا تھا۔

مگر مظہر علی خاں نے گل بدن کے فقرے کے جواب میں خود اپنے گالوں پر طمانچے لگائے۔ بولے: "توبہ کرو بائی توبہ --- سارنگی بڑا مشکل ساز ہے۔ گنی، گن وان لوگوں کا کام ہے سارنگی بجانا ---"

گل بدن بے سُرا بول گئی۔ لڑکیوں کی طرف دیکھ کے کہنے لگی: "تو پھر کوٹھوں کے لیے گاہک گھیر کے لاتا ہوگا۔"

لڑکیاں سب سُٹ ہو گئیں۔ ہر ایک کو احساس تھا کہ گل بدن اوچھا بول گئی ہے۔ لاجی صاحب تو جیسے پیلی پڑ گئیں۔ مظہر علی خاں کا گورا چِٹّا رنگ ایک دم سُرخ ہو گیا تھا۔ مگر انھوں نے کھنکھار کر سر جھٹکا، ہونٹوں پر زبان پھرا کر اور گل بدن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہنے لگے: "نہیں بائی جی! اب ایسے بھی گئے گزرے نہیں ہیں ہم --- قصہ یہ ہے کہ بزرگوں نے اپنے وقتوں میں، اللہ بخشے، بڑی رنڈی بازیاں کی تھیں، تو وہ بے خوفی ہے خون میں۔"

گل بدن کھسیا کے لاجواب ہو گئی۔ لاجی صاحب نے ہاتھ بڑھا کر مظہر علی خاں کا شانہ

تھپک دیا۔ "برخوردار، کچھ خیال مت کرنا۔ پاگل ہے یہ سُسری!"

خاں صاحب کچھ دیر بیٹھ کے، لاجی سے وعدہ لے کے، کہ وہ اکاؤنٹ کھلوانے کا سوچیں گی، چلے گئے۔

ان کے جانے کے بعد لاجی نے دھیرے سے کہا تھا: "کیا لڑکا ہے بھئی۔۔۔ مالک خوش رکھے!"

دو چار بار مظہر میاں پھر آئے۔ لاجی صاحب نے کشمیر مِلک اینڈ لسّی شاپ کے مالک کو کھلوا دیا تھا، اُس نے اور بالٹی فلٹر بیچنے والے ٹِین ماسٹر نے سب سے پہلے خاں صاحب کے حساب میں کھاتا کھلوایا، پھر سگریٹ کا ہول سیل والا گجراتی بھائی بھی دھیرے دھیرے لائن پر آ گیا۔

مظہر علی خاں ان سب اکاؤنٹوں کے لیے لاجی صاحب کا شکریہ ادا کرنے آئے تو کرسی پر بیٹھتے ہی انھوں نے اپنا بریف کیس کھولا اور چپٹا سا ایک ڈبّا نکالا۔ وہ شہر کی سب سے بڑھیا دکان سے لاجی کی پسند کی مٹھائی لائے تھے۔ یہ ڈبّا انھوں نے ہاتھوں پر رکھ کر لاجی کی طرف بڑھا دیا۔

لاجی نے پوچھا: "یہ کس لیے؟"

کہنے لگے: "سوچ لیا تھا لیلاجی کا منھ میٹھا کراؤں گا۔"

"مگر کیوں برخوردار؟ ٹین ماسٹر اور کشمیر مِلک والے نے کھاتا کھول لیا کیا اِس واسطے؟"

خاں صاحب بولے: "نہیں لیلاجی، کھاتے واتے تو کھلتے رہتے ہیں۔۔۔ وہ سب نہیں۔"

"تو پھر؟" لاجی نے کہا، "پہیلیاں کیوں بُجھواتا ہے برخوردار؟ ہاں بھلا؟"

"دیکھیے، اس طرح ہے،" مظہر میاں نے مٹھائی کا ڈبّا کرسی پر رکھ دیا، خود تخت پر لاجی صاحب کے برابر آ بیٹھے۔

"اس طرح ہے میڈم، کہ میں۔۔۔ اُس روز جو میں آپ کے فلیٹ میں گھُس آیا تھا اور چپڑ چپڑ باتیں کرتا تھا تو یہ مت سمجھیے کہ بونگی مارتا تھا۔ مجھے اُس روز بھی خبر تھی کہ آپ کون ہیں۔ صرف خبر ہی نہیں، اُس وقت تک میرے پاس آپ کے پانچ گراموفون رکارڈ آ چکے تھے۔ چھٹا، جس کی بہت دن سے تلاش تھی، کل ملا ہے۔ لیلاجی! میں نے سوچ لیا تھا، وہ رکارڈ

جس دن میرے ہاتھ لگ جائے گا تو آپ کا منہ میٹھا کراؤں گا۔ وہ آپ کے آنے کے بعد نکالا تھا کمپنی نے۔ آپ کے پاس بھی نہیں ہو گا۔ وہی الہیا بلاول کہ۔۔۔ دیاری کہاں گئے وہ لوگ۔۔۔"

لاجی بس مظہر علی خاں کی طرف دیکھے جا رہی تھیں۔ خاں صاحب نے ابھی بولنا ختم بھی نہ کیا تھا کہ لاجی نے جیسے نیند میں دُہرایا: "دیاری کہاں گئے۔۔۔" پھر جیسے پوچھنے لگیں: "الہیا بلاول؟ نایک صمدُو کی الہیا؟"

مظہر میاں نے سر ہلایا۔ "جی، وہی۔"

لاجی صاحب نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا آہستہ سے پوچھا: "کون ہو تم؟ کیسے جانتے ہو مجھے؟"

"میں؟ میں نے بتایا تو تھا، بینک میں نوکر ہوں، آپ کی اسی سڑک پر جو بینک ہے۔۔۔ اور میڈم، آپ کو کیسے جانتا ہوں؟ تو آپ کو لیلاجی، آپ کو تو بہت سے لوگ جانتے ہیں۔ ہزاروں، شاید لاکھوں۔۔۔ سن بتّیس کے بعد کجریاں کس نے گائی ہیں آپ کے سوا کون ہے۔ کس نے گائی ہوں گی؟ لیلابائی اسیر گڑھ والی کی طرح کون گا سکتا تھا؟۔۔۔ ہر اتوار کو صبح سے شام تک سنتا ہوں آپ کے رکارڈ۔ اسیر گڑھ کے نئے نویلے جنگل ہونکتے ہیں آپ کے سُروں میں، اور مور، لیلاجی، گڑھی کی بُرجیوں پر بیٹھے ہوئے مور اور مورنیاں بولتی ہیں۔ میں نے وہ آوازیں نہیں سنیں۔۔۔ مگر ایک جانکار نے، ایک خوب سُنے ہوئے نے مجھے سُنا دی ہیں پہچان کرائی ہے۔ لیلابائی، میڈم، خدا جانتا ہے، مجھے موسیقی کی سمجھ اتنی نہیں ہے، مگر آپ کی گائی کجریوں کے ایک ایک نوٹ کی شکل کاغذ پر بنا کے دکھا سکتا ہوں۔"

لاجی صاحب سختی سے اپنے منہ پر ہاتھ جمائے بیٹھی مظہر میاں کی باتیں سن رہی تھیں۔ انھوں نے لیلابائی اسیر گڑھ والی کہا تو لاجی نے چہرے پر ایک بار ہاتھ پھیر کر بے آواز دُہرایا: "لی لا!"

فلیٹ میں سناٹا تھا۔ میں دیوار سے ٹکا سب سن رہا تھا۔

یوں لگ رہا تھا جیسے لاؤنج میں، سامنے، کسی گزرے زمانے کی میّت رکھی ہے۔

مظہر علی خاں نے لاجی صاحب کے آنسو دیکھ لیے تھے۔ وہ اٹھے۔ انھوں نے بریف کیس اٹھا لیا۔

لاجی صاحب زانو پر کہنی ٹکائے، مہندی لگی اپنی گول مٹول ہتھیلی پر ٹھوڑی رکھے بُت بنی بیٹھی تھیں۔

اپنا بریف کیس ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں جُھلاتے ہوئے خاں صاحب نے اشارے سے لاجی کے بُت کو سلام کیا اور فلیٹ کے دروازے کی طرف بڑھے۔

لاجی صاحب نے دھیرے سے کہا: "ٹھیرو!" خاں صاحب رک گئے۔ لاجی نے کہا: "پھر آنا!"

مظہر علی خاں نے کہا: "جی میڈم، آؤں گا۔ رکارڈ اور باجا بھی لاؤں گا۔"

"نہیں! وہ مت لانا۔"

"جی اچھا۔" اور مظہر میاں اُس روز پنجوں کے بل چلتے ہوئے فلیٹ کی دہلیز پار کر گئے۔

بالکل ایسے جیسے کوئی اپنے پیارے کی موت پر خاموشی سے پُرسا دے کے نکل جاتا ہے،

مصطفیٰ ارباب

سندھی سے ترجمہ: بادل

حادثہ

میں جو
چند لمحے پہلے تھا
اب نہیں ہوں
جو میں ابھی ہوں
ہو سکتا ہے آنے والے لمحوں میں
وہ نہ رہوں
خیال ذہن میں تیزی سے چلتے ہیں
کبھی کبھی ایک خیال
تیز رفتاری کی وجہ سے
دوسرے خیال کو مار دیتا ہے
حادثے
ذہن میں بھی ہوتے ہیں

دور اندیشی

ہمارے آباواجداد نے
تجربے کی خاطر
(یا بُھول میں)
بھوک کی جو فصل بوئی تھی
برسوں بعد
وہ پک کر تیار ہو چکی ہے
اُن کے تجربے کی کامیابی کی وجہ سے
ہم اُن کی بوئی ہوئی فصل کے عادی ہو کر
اسے کھا رہے ہیں
آنے والی نسل کا مستقبل محفوظ کرنے کے لیے
ہم نے اپنے کھیتوں میں
دُگنی بھوک بو دی ہے

سب کچھ سمجھتے ہوے بھی

اندھیرا بڑھتا جا رہا ہے
یا آنکھیں دیکھنے کی قوّت گنواتی جا رہی ہیں
لفظ گونگے ہو گئے ہیں
یا ہم بہرے ہو گئے ہیں
آنسو آنکھوں میں جم گئے ہیں
یا ہم رونا بھول چکے ہیں
دل غم محسوس نہیں کرتا
یا ہمارے پاس دل ہے ہی نہیں

لیڈر تقریریں کر رہے ہیں
یا الفاظ کے برسٹ چلا رہے ہیں
شاعر گیت لکھ رہے ہیں
یا رو رہے ہیں
کہانی کار کہانیاں لکھ رہے ہیں
یا خوف کے ہول سیلر ہو گئے ہیں
فاصلے بڑھ گئے ہیں
یا ہم ایک ہی جگہ پر قدم رکھ اٹھا رہے ہیں
ہم نے ماضی بیچا ہے
یا مستقبل گروی رکھا ہے
سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی
کچھ سمجھ میں نہیں آتا

رانگ نمبر

تم جاننا چاہتی ہو
محبّت کیسی ہوتی ہے
میں محبّت کے فن سے کورا
ایک چھوٹا آدمی ہوں
محبّت تو مجھ سے
خطا کی طرح
اچانک ہو گئی ہے
مجھے کچھ پتا نہیں
محبّت کا ذائقہ کیسا ہوتا ہے
ہاں

تم محبت سے پوچھ سکتی ہو
میں اُسے کیسا لگا

اعزاز

وہ تنہائی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے
اکثر اس کا دل چاہتا ہے
اس کا بھی ایک چھوٹا سا گھر ہو
جس میں ننھے بولوں کی مہک پھیلی ہو
گھر واپسی میں کبھی دیر ہو جائے
تو کوئی اس کے انتظار میں جاگ رہا ہو
شام کے اداس پہر میں
گھر کا ڈرائنگ روم
دوستوں کے قہقہوں کا منتظر ہو
چائے کے گھونٹ اور سگریٹ کے دھویں میں
زندگی کے سب عذاب روپوش ہو جائیں
وہ کسی عام آدمی کی طرح
بہت کچھ کرنا چاہتا ہے
مگر کچھ بھی نہیں کرسکتا
لوگوں نے اسے دیوتا بنا دیا ہے

اضافہ

اور پھر ایک دن
شہر کے سب اندھوں نے

اتحاد کے درس پر عمل کرتے ہوئے
مجھے ڈھونڈ نکالا
انھوں نے میری آنکھیں نکال پھینکیں
اندھے سرُور نے مجھے بھی اپنے گھیرے میں لے لیا
اب ہم سب
کسی دوسرے
آنکھوں والے
کی تلاش میں ہیں

کوشش

بہت دیر ہوئی
دن چرس پی کر
کسی کھائی میں اتر گیا ہے
چھوٹے چھوٹے لوگ
اپنے بڑے بڑے غموں کو تکیوں میں بھر کر
سو گئے ہیں
ان کی آنکھوں میں
آنسوؤں کی جگہ خواب اتر آئے ہیں
میں ڈرتا ہوں
خوابوں سے سجی میٹھی نیند کو
بیداری کہیں قتل نہ کردے
جب تک رات رہے گی
لوگوں کے تھکے ہوئے وجود
نیند کے راگ میں کھوئے رہیں گے

میں رات کو طویل کرنے کی کوشش میں
اس کے سینے میں دھڑکنے لگتا ہوں

وِزِٹِنگ کارڈ

میں آہستہ آہستہ
دیکھنے
سننے
رونے اور
محسوس کرنے
کی صلاحیت کھوتا جا رہا ہوں
شاید یہ موت کا وِزِٹِنگ کارڈ ہے

تمھارے جانے کے بعد

تمھارے جانے کے بعد
رات کے آخری پہر
چاند نے کہا: میں اداس ہوں
ایک ستارے نے ٹوٹتے ہوئے کہا: میں اداس ہوں
ہوا نے دیواروں سے سر ٹکراتے ہوئے کہا: میں اداس ہوں
بہار نے پیلے پھولوں میں تبدیل ہوتے ہوئے کہا:
میں اداس ہوں
شام نے رات میں ڈھلتے ہوئے کہا: میں اداس ہوں
میں نے اونچی آواز میں ان سب سے کہا: میں اداس نہیں ہوں
اور رو پڑا

تُو کون ہے؟

یہ کون ہے
اس کے نقش جانے پہچانے لگتے ہیں
ہو سکتا ہے یہ کسی سفر میں مجھے ملا ہو
یا میں نے اسے کسی پارک میں گھومتے دیکھا ہو
کبھی کسی راستے پر
میں نے اس کا گرا ہوا سامان اسے اٹھا کر دیا ہو
میں یاد کرنے کی کوشش کرتا ہوں
مگر کچھ یاد نہیں آتا
تنگ آ کر میں اُسی سے پوچھتا ہوں:
تو کون ہے
آئینے میں گھورتے ہوئے انسان

نظم

کیا یہ خنجر تیز ہے؟
اس نے پوچھا
اور جیب سے رقم نکال کر
اس کی قیمت ادا کی
اس نے ہاتھ پھیر کر خنجر کی تیزی دیکھی
اور آزمائش کے لیے
اُسے دکان دار کے پیٹ میں داخل کر دیا

احتجاج

اس نے بیچ بازار میں
ننگی عورتوں کو
لاٹھی کے اشارے پر پریڈ کرتے دیکھا
تو اسے ایک جھٹکا لگا

اس نے کمرے کی کھڑکی کے باہر
درخت پر
پرندوں کے جوڑے کے بجائے
اکیلا اداس پنچھی دیکھا
تو اسے ایک جھٹکا لگا

اس نے بچّوں کے چہرے پر
مسکراہٹ کے بجائے
صدیوں جتنی سنجیدگی دیکھی
تو اسے ایک جھٹکا لگا

اس نے اب تک جو کچھ دیکھا تھا
اس کے سائے اپنے دل پر لے کر
ٹھوکر مار کر
پاؤں کے نیچے سے اسٹول گرایا
تو اسے آخری جھٹکا لگا

نظم

اس نے سوکھے ہوئے پھولوں کو دیکھا
تو ایک کہانی لکھی
اس نے پیڑوں کو کٹتے دیکھا
تو ایک کہانی لکھی
اس نے پرندوں کو شاخوں کے بجائے
دسترخوان پر دیکھا
تو ایک کہانی لکھی
وہ کہانیاں لکھتے لکھتے مر گیا
کسی نے اس پر کہانی نہیں لکھی

نظم

آسمان سے گری ہوئی بات
پہاڑ کی چوٹی کے علاوہ
کچھ اور جگہوں پر بھی موصول ہوئی
ماہرین کی کمیٹیاں
صدیوں سے
اسے سمجھنے کی کوشش کر رہی ہیں
آسمان سے گری ہوئی بات
موسم کی خرابی کی وجہ سے
کہیں بھی مکمل صورت میں موصول نہیں ہوئی

مزدور

وزن اٹھا اٹھا کر وہ تھک گیا
اس کے پھیپھڑے آکسیجن کے لمبے لمبے کش لینے لگے
اس نے کچھ دیر آرام کرنے کے لیے
دیوار سے پیٹھ لگالی
اس کی آنکھیں
ناراض محبوبہ کی کھڑکی کی طرح
بند ہوئیں
تو ایک لمحے کے لیے
وہ سارا وزن جو اس نے زندگی بھر
قسطوں میں اٹھایا تھا
ایک ہی وقت میں اس کے سر پر آ پڑا
عینی شاہدوں نے ڈاکٹر کی رپورٹ کو تعجب سے سنا
اُس کی موت گردن ٹوٹنے سے ہوئی تھی

آرا مشین کا کاریگر

صبح سے شام تک لکڑیاں چیرنا
اس کا برسوں کا معمول ہے
اس کا جسم لکڑی کے بُرادے میں
دفن ہونے لگا ہے
اسے روٹی بھی بُرادے کی بنی ہوئی لگتی ہے
اس کے ہاتھ بیوی کو
سوکھے درخت کی طرح محسوس کرتے ہیں

لکڑیوں کے درمیان رہتے رہتے
وہ خود کو بھی لکڑی کا آدمی سمجھنے لگتا ہے
وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ
اس کا یہ خیال مضبوط ہوتا جاتا ہے
اور ایک دن
آرا مشین بھی اس سے متفق ہو جاتی ہے

نظم

شاعر ایک نظم لکھتا ہے
نظم ایک سپاہی کو ملتی ہے
اور تلوار بن جاتی ہے
نظم ایک لڑکی کے پاس پہنچتی ہے
اور عشق میں تبدیل ہو جاتی ہے
نظم ایک مرتے ہوئے آدمی کے پاس پہنچتی ہے
اور زندگی بن جاتی ہے
نظم ایک نقاد کے پاس پہنچتی ہے
اور اپنی غلطی تسلیم کرتے ہوئے
خودکشی کر لیتی ہے

باف ڈے

کل، باف ڈے ہے
سورج صبح چھ بجے طلوع ہو گا

سورج صبح چھ بجے طلوع ہو گا
موسمیاتی ادارے نے خوشگوار موسم کی پیش گوئی کی ہے
کل ایک ثقافتی طائفہ
شہر کے میدان میں اپنے فن کا مظاہرہ کرے گا
پارلیمنٹ میں ایک اہم بِل پر
غیر اہم بحث ہو گی
ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں
مرغیوں کی پرورش کے بارے میں سیمینار ہو گا
کل ہاف ڈے ہے
اسکول اور دوسرے ادارے جلدی بند ہو جائیں گے
اور ٹھیک بارہ بجے
مجھے پھانسی دے دی جائے گی

مصطفیٰ ارباب

مصطفیٰ ارباب ۱۹۶۴ میں سندھ کے ضلع سانگھڑ میں پیدا ہوئے۔ اب بہت عرصے سے میر پور خاص میں مقیم ہیں۔ سندھی کے علاوہ اردو میں بھی نظمیں لکھتے ہیں۔

سیمون دُ بووار

انگریزی سے ترجمہ: محمد عمر میمن

ایک محبّت کی کہانی (۲)

ناول "دی مینڈیرنز" کے آٹھویں باب کا ایک پارہ

اور پھر خدا خدا کر کے مئی آ ہی گیا۔ وہاں، شکاگو میں، مَیں اپنے کو بارِ دگر ایک ایسی عورت کے جسم میں دریافت کر سکوں گی جسے عشق ہو، جس سے عشق کیا جا رہا ہو۔ یقین نہیں آ رہا تھا۔ یقین تو جہاز میں سوار ہونے کے بعد بھی نہیں آ رہا تھا۔ جہاز کا بے کو تھا، شکستوں سے چُور ایک سال خوردہ سا کریٹ تھا جو ایتھنز سے آ رہا تھا اور بہت کم بلندی پر پرواز کر رہا تھا۔ یہ یونانی بیوپاریوں سے کھچاکھچ بھرا ہوا تھا جو قسمت آزمانے امریکا جا رہے تھے۔ رہی مَیں، تو مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہاں کیا آزمانے جا رہی تھی۔ میرے دل میں کوئی جیتی جاگتی تصویر نہیں تھی، اور نہ جسم میں کوئی خو[illegible]ش۔ میں وہ دستانہ پوش مسافر نہیں تھی جس کا لوئس منتظر تھا: میرا کوئی منتظر نہیں تھا۔ "میں جانتی تھی: میں اب دوبارہ کبھی اُسے نہیں دیکھ سکوں گی،" جب جہاز راستے سے پلٹ کر دوبارہ سمندر کے اوپر آ گیا تو میں نے سوچا۔ جہاز کا ایک انجن بے کار ہو گیا تھا اور ہم شینن واپس لوٹ رہے تھے۔ ایک مصنوعی گاؤں میں، جس میں کھلونوں جیسے گھر تھے، میں نے دو دن نیچے گھاٹ کو دیکھنے میں گزار دیے۔ شام کو میں آئرش وسکی پیتی اور دن کو سبز اور سُرمئی رنگ کے بے حد اُداس کر دینے والے مضافاتی علاقے میں چہل قدمی کرتی۔ جب جہاز ایزورز کے ہوائی اڈّے پر اترا تو اس کا ایک ٹائر پھٹ گیا، چناں چہ ہمیں چوبیس گھنٹوں کے لیے ایک انتظار گاہ میں قید کر دیا گیا جس میں پھول دار سوتی پردے ٹنگے تھے۔ گینڈر سے روانہ ہونے کے بعد جہاز ایک طوفان میں جا پھنسا، اور اس سے نکلنے کی

جستجو میں پائلٹ نے جہاز کا رخ نووا اسکوشا کی طرف کر دیا۔ مجھے محسوس ہونے لگا کہ ساری کرۂ زمین کے گرد چکر لگانے اور سرد مُرغ کھانے ہی میں بیت جائے گی۔ ہم نے ایک تاریک سی خلیج کے اوپر پرواز کی جس پر روشنی کے مینار کی شعاع پڑ رہی تھی۔ جہاز ایک بار پھر نیچے کی طرف اترنے لگا۔ ایک اور اُتارپٹری، ایک اور انتظار گاہ۔ ہاں، مجھے یہ سزا سنا دی گئی تھی کہ ایک اُتارپٹری سے دوسری میں ماری ماری پھرتی رہوں، میرا سر شوروغل سے بھرا ہو، اور میرے پیروں کے پاس نیلے رنگ کا شب بسری کا تھیلا پڑا ہو۔

اور پھر، یک بارگی وہ ــ لوئس ــ مجھے نظر آیا۔ ہم نے طے کر رکھا تھا کہ وہ اپنے فلیٹ پر میرا انتظار کرے گا، لیکن وہ وہاں سامنے بھیڑ میں کسٹم ایریا کے دروازے پر نظریں گاڑے کھڑا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس نے کلف لگے کالر کی قمیص پہنی ہوئی تھی اور سنہری فریم کی عینک لگا رکھی تھی۔ لیکن اس سے بھی زیادہ حیرت کی بات یہ تھی کہ میں نے اسے دیکھا اور کچھ بھی تو محسوس نہیں کیا۔ انتظار کا وہ پورا سال، وہ تمام پچھتاوے، وہ ملال، وہ طویل بحری سفر ــ اور شاید یہ بھی کہ مجھے جلد ہی معلوم ہونے والا تھا کہ مجھے اب اس سے محبت نہیں رہی۔ اور وہ؟ کیا اسے اب بھی مجھ سے محبت ہے؟ میں چاہتی تھی کہ دوڑ کر اس کے پاس پہنچ جاؤں، لیکن کسٹم کا عملہ کسی خاص جلدی میں نہیں تھا۔ یونانی بیوپاریوں کے سوٹ کیس جالی کے کام اور گوٹا کناری کی اشیا سے بھرے ہوئے تھے، اور کسٹم والے آپس میں ہنسی مذاق کرتے ہوئے ہر چیز کی قیمت کا فرداً فرداً تخمینہ لگا رہے تھے۔ خدا خدا کر کے ان سے جان چھٹی تو لوئس وہاں موجود نہ تھا۔ میں ٹیکسی میں جا بیٹھی اور ڈرائیور کو پتا بتانا چاہتی تھی کہ نمبر ہی یاد نہ آیا۔ میرے کان بھنبھنا رہے تھے اور وہ آواز، جو میرے سر میں مسلسل جاری تھی، ذرا کم ہونے پر آمادہ نہ ہوئی۔ مگر آخر کار مجھے یاد آ ہی گیا: ۱۲۱۱۔ ٹیکسی چل پڑی؛ ایک شاہراہ سے دوسری شاہراہ پر: نیوں سائنز، مزید نیوں سائنز۔ مجھے اس شہر میں اپنا راستا تلاش کرتے نہیں بنتا تھا، تاہم مجھے یہ اندازہ ضرور ہو گیا کہ مسافت اتنی لمبی نہیں ہونی چاہیے تھی۔ شاید ڈرائیور کسی اندھی گلی میں لے جا کر میرا گلا گھونٹنے والا ہے۔ میں جس موڈ میں تھی اُس میں یہ احتمال لوئس کو دوبارہ دیکھنے سے کہیں زیادہ یقینی تھا۔

ڈرائیور نے ٹیکسی موڑی اور بولا: "۱۲۱۱ نمبر کی کوئی جگہ نہیں۔"

"بالکل ہے۔ میں مکان اچھی طرح پہچانتی ہوں۔"

"ہو سکتا ہے نمبر بدل گئے ہوں،" ڈرائیور نے کہا۔ "ہم لوٹ کر سڑک کے اگلے

سرے پر چلتے ہیں۔"

وہ سڑک کے سہارے سہارے، بالکل فٹ پاتھ سے لگ کر، آہستہ آہستہ ٹیکسی چلانے لگا۔ مجھے بعضے بعضے نکڑ، خالی مربعے اور پٹریاں کچھ کچھ پہچان میں آنے لگیں؛ لیکن خالی مربعے اور پٹریاں تو ہمیشہ ایک جیسی لگتی ہیں۔ ایک گودی، ایک بالائی پُل جانا پہچانا لگا۔ معلوم ہوتا تھا وہ سب چیزیں تھیں اَب بھی وہیں، بس ان کی جگہ بدل گئی تھی۔ کیا پاگل پن ہے! میں نے سوچا، آپ چلتے بنتے ہیں، اپنے سے کہتے ہیں: "میں ضرور واپس آؤں گا،" کیوں کہ ہمیشہ کے لیے چلا جانا آسان نہیں۔ لیکن آپ اپنے سے جھوٹ بول رہے ہوتے ہیں: آپ لوٹ کر نہیں آتے۔ سال گزر جاتا ہے، واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں، کوئی چیز اپنی پرانی حالت پر قائم نہیں رہتی۔ آج لوئس کلف لگے کالر کی قمیص پہنے تھا، اور میں نے اسے دیکھا تھا، پھر بھی میرے دل کی دھڑکن تیز نہیں ہوئی تھی۔ اور اب اس کا گھر بھک سے اڑ کر ہوا میں غائب ہو گیا تھا۔ میں نے اپنے کو زور سے جھنجھوڑا۔ لاحول ولا، صرف فون کرنے ہی کی تو دیر ہے، میں نے خود سے کہا۔ لیکن فون نمبر کیا ہے؟ وہ میں بھول چکی تھی۔ یکایک مجھے وہ سرخ اشتہار نظر آیا: "شِلتز بیئر،" اور بورڈ پر گاؤدیوں کی طرح مسکراتے ہوئے وہ چہرے۔

"بس بس، یہیں روک دو!" میں نے چلا کر کہا۔ "یہ رہا!"

"لیکن یہ تو ۱۱۱۲ ہے،" ڈرائیور بولا۔

"ہاں بھئی، ۱۱۱۲۔ بالکل!"

میں قلانچ بھر کر ٹیکسی سے نکلی اور ایک کھڑکی کے روشن چوکھٹے میں مجھے کسی کا آگے کو جھکا ہوا سایہ نظر آیا۔ وہ منتظر تھا، میرا منتظر؛ پھر وہ سایہ تیزی سے نیچے اترنے لگا۔ یہ لوئس ہی تھا۔ اس نے نہ کلف لگے کالر کی قمیص پہنی ہوئی تھی اور نہ سنہری فریم کی عینک لگا رکھی تھی، مگر اس کے سر پر بیس بال کیپ ضرور منڈھی ہوئی تھی۔ اس کی بانہوں نے میرا دم گھونٹ دیا۔ "این!"

"لوئس!"

"آخر ہم مل ہی گئے! کتنا لمبا انتظار تھا! کتنی لمبی مدّت!"

"ہاں، بڑی لمبی مدّت! برداشت سے باہر!"

اتنا مجھے معلوم ہے کہ وہ مجھے گود میں اٹھا کر اوپر نہیں لایا تھا، اور یہ مجھے یاد نہیں کہ میں نے اپنی ربڑ جیسی ٹانگوں سے سیڑھیاں طے کی ہوں۔ لیکن مانو نہ مانو، ہوا یہی کہ ہم وہاں

موجود تھے، زرد کچن کے بیچوں بیچ، ایک دوسرے سے ہم آغوش۔ اسٹوو، لائنو لیم، میکسیکن کمبل -- ہر شے موجود تھی، ٹھیک اپنی جگہ پر۔

میں بڑبڑائی: "یہ ٹوپی کیوں چڑھا رکھی ہے؟"

"بس یوں ہی۔ گھر میں پڑی ہوئی تھی۔" اس نے ٹوپی اتار کر میز پر ڈال دی۔

"مجھے ایرپورٹ پر تمھارا ہم زاد نظر آیا تھا۔ وہ چشمہ لگاتا ہے اور کلف لگے کالر کی قمیص پہنتا ہے۔ میں اس سے ڈر گئی تھی۔ مجھے لگا تم ہی ہو، اور مجھے اپنے اندر کسی جذبے کی ہلچل محسوس نہیں ہوئی۔"

"ڈر تو میں بھی گیا تھا۔ گھنٹا بھر ہوا دو آدمی باہر ایک عورت کو اٹھائے گزرتے دکھائی دیے۔ وہ بے ہوش تھی یا مردہ، اور مجھے خیال آیا کہیں تمھیں نہ ہو۔"

"لیکن اب، یہ تم ہو، سچ مچ کے، اور یہ میں ہوں، سچ مچ کی!"

لوئس نے بڑی شدّت سے مجھے بھینچ لیا اور پھر گرفت ڈھیلی کر دی۔ "تھکی ہوئی ہو؟ پیاس لگی ہے؟ بھوک لگی ہے؟"

"نہیں۔"

میں دوبارہ اس سے لپٹ گئی۔ میرے ہونٹ اتنے بوجھل، اتنے شل ہو چکے تھے کہ الفاظ ادا کرنے سے قاصر تھے۔ میں نے انھیں اس کے منھ سے چپکا دیا۔ اس نے مجھے گود میں اٹھا لیا اور لا کر بستر پر ڈال دیا۔ "این! میں ہر رات تمھارا انتظار کرتا رہا ہوں۔"

میں نے پھر آنکھیں موند لیں: ایک مرد کا بدن، اپنے سارے اعتماد، اپنی ساری شہوت سے بوجھل، مجھے پھر سے دبائے ہوے تھا۔ وہ لوئس ہی تھا۔ نہیں، وہ بدلا نہیں تھا، نہ میں بدلی تھی، اور نہ ہماری محبّت۔ میں چلی ضرور گئی تھی، لیکن لوٹ بھی تو آئی تھی؛ مجھے دوبارہ اپنی جگہ مل گئی تھی، اور اپنے سے رہائی۔

اگلا دن ہم نے سامان باندھنے اور ہم جسم ہونے میں گزارا -- ایک بے حد طویل دن جو ٹھیک اگلی صبح تک جاری رہا۔ ریل گاڑی میں ہم گال سے گال ملا کر سوئے۔ میں ابھی پوری طرح بیدار نہیں ہونے پائی تھی کہ اوہایو میں پُشتے سے بندھا ہوا ایک اسٹیمر نظر آیا جس کے دونوں پہلوؤں میں ایک ایک پہیا لگا ہوا تھا، وہی اسٹیمر جس کا تذکرہ لوئس نے اپنے خطوں میں کیا تھا۔ میں نے اس کے بارے میں اتنا سوچا تھا -- لیکن اس پر یقین کیے بغیر -- کہ اب جبکہ وہ بالکل سامنے تھا، مجھے اپنی آنکھوں پر مشکل ہی سے اعتبار آ رہا تھا۔ مگر وہ بالکل

حقیقی تھا- میں اس پر جا چڑھی- جذبے کے جوش میں میں نے اس کیبن کا معائنہ کیا جو ہماری تھی- شکاگو میں میں لوئس کے اپارٹمنٹ میں رہتی تھی، لیکن یہ ہماری کیبن تھی، ہم دونوں کی- اس بات نے واقعی ہمیں ایک بیاہتا جوڑا بنا دیا تھا- اب مجھے یقین آگیا تھا کہ جا کر لوٹ آنا ممکن ہے، اور میں ہر سال واپس آیا کروں گی- ہر سال ہماری چاہت ایک ایسی رات سے گزرے گی جو قطبِ شمالی کی رات سے درازتر ہو گی؛ اور پھر، ایک دن، مسرّت آفتاب کی طرح طلوع ہو گی، آفتاب جو اگلے تین چار ماہ کے لیے غروب ہونا بھول جائے گا- شب کی گہرائیوں سے ہم اُس دن کا انتظار کریں گے، ساتھ ساتھ انتظار کریں گے- غیر حاضری مزید جدائی کا باعث نہیں ہو گی؛ ہم سدا کے لیے ایک ہو چکے ہیں-

"اسٹیمر چلنے ہی والا ہے- جلدی آؤ،" لوئس نے کہا- وہ بھاگتا ہوا سیڑھیاں چڑھ گیا اور میں اس کے پیچھے پیچھے چلی- وہ ریلنگ پر جھک گیا؛ اس کا سر اِدھر سے اُدھر گردش کر رہا تھا-

"دیکھو، کتنا حسین منظر ہے-- آسمان اور زمین پانی میں ایک ہو رہے ہیں-"

ایک وسیع، ستاروں بھرے آسمان کے نیچے، سِنسِناٹی کی روشنیاں جگمگا رہی تھیں، اور ہم جیسے دہکتی ہوئی لہروں پر ہمواری سے بہے جا رہے تھے- ہم بیٹھ گئے اور دیر تک نیون سائنز کو بتدریج مدھم ہو کر غائب ہوتا دیکھتے رہے- لوئس مجھے اپنے سے چمٹائے ہوئے تھا-

"ذرا سوچو کہ میں ان سب باتوں کا کبھی قائل ہی نہیں تھا،" اس نے کہا-

"کن باتوں کا؟"

"چاہنے اور چاہے جانے کا-"

"تو کس بات کے قائل تھے؟"

"سر چھپانے کے لیے ایک چھت، باقاعدگی سے کھانا کھانا، کبھی کبھار کسی عورت کو گھر لے آنا-- ماموںیت- میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ آدمی اس سے زیادہ مانگنے کا حق رکھتا ہے- میں تو سوچا کرتا تھا کہ ہر آدمی تنہا ہی زندگی بسر کرتا ہے، ہمیشہ- لیکن اب دیکھ لو، تم یہاں موجود ہو-"

ہمارے سر کے اوپر ایک لاؤڈ سپیکر پر زور زور سے گانے بج رہے تھے، مسافر بنگو کھیل رہے تھے- وہ سب کے سب اتنے سِن رسیدہ تھے کہ مجھے اپنی عمر گھٹ کر آدھی لگنے لگی- میں بیس برس کی تھی، اپنی پہلی محبّت کے تجربے سے گزر رہی تھی، اور یہ میرا پہلا سفر تھا-

لوئس نے میرے بال، میری آنکھیں، میرا منھ چوم لیا۔
"نیچے چلیں، کیا خیال ہے؟"
"تمھیں پتا ہے میں نہ کبھی نہیں کہتی۔"
"لیکن مجھے تمھارے منھ سے ہاں سننا بہت بھاتا ہے۔ تم اتنے مزے سے کہتی ہو!"
"ہاں،" میں نے کہا، "ہاں۔"

کتنے لطف کی بات ہو کہ آدمی کو صرف ہاں ہی کہنا پڑے! میری زندگی تارتار تھی، میری جِلد اپنی اوّلیں تازگی کھو چکی تھی؛ اس کے باوجود میں اس مرد کو، جس سے مجھے عشق تھا، مسرّت پہنچا رہی تھی -- کس غضب کی مسرّت!

دریاے اوہایو اور دریاے مِس سِپی کے آخر تک جانے میں ہمیں چھ دن لگے۔ ہر توقف گاہ پر ہم دوسرے مسافروں سے دامن بچا کر بھاگ کھڑے ہوتے اور گرم اور تاریک شہروں میں اوٹ پٹانگ گھومتے پھرتے۔ بقیہ وقت عرشے پر دھوپ میں بسر کر، باتیں کرتے، پڑھتے، یا کچھ نہ کرتے اور محض سگریٹ پھونکتے۔ ہر روز سبزے اور پانی کا وہی ایک سا منظر ہوتا، اور انجن اور پانی کا وہی شور، لیکن یہ سب ہمیں یوں ہی پسند تھا -- ایک واحد صبح، جو ایک صبح سے دوسری صبح تک مسلسل پیدا ہو رہی ہو؛ ایک واحد شام، ایک شام سے دوسری شام تک۔

بےشک، مسرّت اگر کچھ ہے تو بس یہی ہے۔ ہمیں ہر چیز بھلی لگ رہی تھی۔ اور جب اسٹیمر چھوڑنے کا وقت آیا تو ہم اس پر بھی خوش تھے۔ ہم دونوں کو اس سے پہلے بھی نیو آرلینز جانے کا اتفاق ہوا تھا، تاہم یہ لوئس کے اور میرے لیے ایک جیسا شہر نہیں تھا۔ اُس نے مجھے وہ محلّے دکھائے جہاں پندرہ سال پہلے وہ صابن کی ٹکیوں کا خوانچہ لگایا کرتا تھا، وہ پُشتے دکھائے جہاں وہ چُرائے ہوئے کیلوں سے پیٹ کی آگ بجھایا کرتا تھا، اور بازارِ حسن کے علاقے کی وہ تنگ سی گلیاں جن سے وہ دھڑکتے دل اور خالی جیب کے ساتھ گزر جایا کرتا تھا۔ کبھی کبھی تو ایسا لگتا کہ وہ زبوں حالی، غم و غصّے اور نا آسودہ خواہشوں کے تشدّد کے ان ایّام کی واقعی کمی محسوس کر رہا ہو۔ لیکن جب میں اُسے فرنچ کوارٹر گھمانے لے گئی، جب وہ وہاں کے شراب خانوں اور کھلے احاطوں (patios) سے، کسی سیّاح کی طرح اِترا اِترا کر گزرا تو بڑا محظوظ ہوتا دکھائی دیا، جیسے اپنی قسمت کے ساتھ اچھی چال چل رہا ہو۔

اُسے ہوائی جہاز میں سفر کرنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا تھا: پرواز کے دوران وہ تمام

وقت کھڑکی سے ناک لگائے بیٹھا رہا اور بادلوں کو دیکھ دیکھ ہنسا کیا۔ میں بھی کافی محظوظ ہو رہی تھی۔ کیسی زبردست تبدیلی تھی! جب دور اُفتادہ ستارے آسمان میں رقص کرنے لگیں، جب زمین اپنا چولا بدل لے، تو لگتا ہے جیسے آدمی خود اپنی کینچلی بدل رہا ہو۔ یوکتان کی حیثیت میرے لیے اَیٹلس پر خفی حروف میں چھپے ہوئے ایک بے حقیقت لفظ سے زیادہ کچھ نہ تھی۔ میرا اس مقام سے کوئی بندھن نہیں تھا، حتیٰ کہ مجھے اس کی ادنیٰ سی خواہش بھی نہ تھی، اور نہ اس جگہ کا کوئی پیکر ہی میرے ذہن میں موجود تھا: اور اب، اچانک، میں اسے خود اپنی آنکھ سے دریافت کر رہی تھی۔ جہاز نے نیچے آنا شروع کیا، تیزی سے زمین کی طرف بڑھا، اور نیچے، آسمان کے ایک سِرے سے دوسرے سِرے تک پھیلی ہوئی سبز مخمل کی وہ زمین مجھے نظر آئی جس پر بادلوں کی پرچھائیں نے سیاہ جھیلوں کی شکل اختیار کر رکھی تھی۔

ہم نے ایک ناہموار سڑک پر سفر کیا جو نیلے سنچری پلانٹ کے مرغزاروں کے بیچ سے ہو کر گزرتی تھی جن کے اوپر وقفے وقفے سے گرم سیر علاقے کے کسی سپاٹ سر والے درخت کی شہ زور سُرخی اچانک پھٹ پڑتی تھی۔ ہم ایک گلی سے ہو کر گزرے جس کے دونوں طرف بھوسے اور گارے کی دیواروں اور گھاس پھوس کے چھپّروں والے چھوٹے چھوٹے گھر تھے۔ سورج بہت بڑا اور گرم لگ رہا تھا۔ ہم نے اپنے سوٹ کیس ہوٹل کی لابی ہی میں چھوڑ دیے جو لابی سے زیادہ سبزے سے بُری طرح بھرا ہوا کوئی پودا گھر لگتی تھی جس میں ایک طرف گلابی فلیمنگو ایک ٹانگ پر کھڑے محوِ خواب تھے۔ ہم باہر نکل آئے۔ سفید چوکوں میں، دھوپ سے چمچماتے پیڑوں کی چھاؤں تلے لوگ سفید لباس اور تنکوں کے بنے ہیٹ پہنے، سپنے دیکھ رہے تھے۔ میں آسمان کو پہچان گئی، اور تولیدو اور آولا کی خاموشی کو بھی۔ اٹلانٹک کے اِس پار اسپین سے دوبارہ ملاقات ہو جانے پر میرے ہوش حواس اتنے گم نہیں ہو رہے تھے جتنے خود سے یہ اعتراف کرنے پر کہ میں یوکتان میں ہوں۔

''چلو، ان میں سے کوئی ٹٹّو گاڑی کرائے پر لے لیں،'' لوئس نے کہا۔

چوک کے ایک طرف، سیدھی پُشت کی نشستوں والی سیاہ ٹٹّو گاڑیوں کی قطار کھڑی ہوئی تھی۔ لوئس نے ایک کوچ بان کو بیدار کیا، اور ہم تنگ سی نشست پر جا بیٹھے۔ لوئس ہنسنے لگا۔

''بیٹھ تو گئے، پر اب جائیں کہاں؟ تم ہی بتاؤ۔''

''اس سے کہو اِدھر اُدھر تھوڑی سی سیر کرائے، پھر ڈاک خانے لے چلے۔ مجھے کچھ

خطوں کا انتظار ہے۔"

جنوبی کیلیفورنیا میں لوئس نے ہسپانوی زبان کے چند لفظ سیکھ لیے تھے۔ اس نے کوچ بان کے سامنے ایک چھوٹی سی تقریر کر ڈالی اور ٹٹو آہستہ آہستہ چل پڑا۔ ہم شاہراہوں پر سے گزرے جو بیک وقت پُر تکلف اور خستہ حال نظر آئیں۔ اَن گھڑ کاسٹیلین طرز پر بنی حویلیوں کو بارش اور افلاس گھُن کی طرح چاٹ گئے تھے۔ زنگ آلود، آہنی پھاٹکوں کے پیچھے باغوں میں مجسّمے سڑ گل رہے تھے۔ شان دار پھول -- سُرخ، اُودے اور نیلے -- نیم برہنہ درختوں کے دامن میں مُرجھا رہے تھے؛ اور بڑے بڑے کالے پرندے، دیواروں کے اوپر قطار میں بیٹھے، جیسے مشاہدے میں مصروف تھے۔ ہر طرف موت کی بُو پھیلی ہوئی تھی۔ چناں چہ جب ہم اِنڈینز کے بازار کے خاتے پر پہنچ گئے تو میں نے اطمینان کا سانس لیا؛ یہاں دھوپ کھائے ہوئے کینوس کی چھتوں کے نیچے خلقت کا اُمڈتا ہوا ہجوم زندگی کی حرارت سے پوری طرح معمور تھا۔

"میں بس ایک منٹ میں آئی،" میں نے لوئس سے کہا۔

وہ زینے پر بیٹھ گیا اور میں ڈاک خانے میں داخل ہوئی۔ رابرٹ کا خط آیا تھا؛ میں نے تیزی سے لفافہ چاک کیا۔ وہ اپنی کتاب کے آخری پروف دیکھ رہا تھا اور "وجی لینس" کے لیے ایک سیاسی مضمون لکھ رہا تھا۔ بہت خوب! اس کے بارے میں زیادہ متفکّر نہ ہونے کا جو فیصلہ میں نے کیا تھا وہ بالکل درست تھا۔ سیاست اور لکھنے لکھانے پر اپنی بےاعتمادی کے باوجود وہ ان سے کنارہ کشی پر بھی تیار نہ تھا۔ لکھا تھا کہ ان دنوں پیرس میں موسم بےرونق ہے۔ میں نے خط اپنے پرس میں رکھا اور باہر نکل آئی۔ پیرس کتنی دور تھا! اور یہاں آسمان کتنا نیلا تھا! میں نے لوئس کا بازو تھام لیا۔ "سب کچھ ٹھیک ہے۔"

ہم کینوس کے سائبانوں کے نیچے راستا بناتے ہوئے چلنے لگے۔ پھل، مچھلی، چپلیں اور سوتی کپڑے بک رہے تھے؛ عورتیں کشیدہ کاری کے لمبے لمبے ملبوس پہنے تھیں۔ ان کی رہ رہ کر چمکتی ہوئی چوٹیاں اور پُرسکون چہرے مجھے بڑے اچھے لگے۔ انڈین بچے، بشیبی باہر کیے، ہنس رہے تھے۔ ہم ایک کیفے میں جا بیٹھے جہاں سمندر کی مخصوص بُو پھیلی ہوئی تھی، اور بیرے نے ہماری پیپے سے بنی میز پر سیاہ جھاگ دار بیئر لا کر رکھ دی۔ وہاں صرف مرد ہی تھے، اور سب کے سب جوان؛ وہ خوش گپیاں کر رہے تھے اور ہنس رہے تھے۔

"یہ انڈین لوگ، یہ بڑے خوش نظر آرہے ہیں،" میں نے کہا۔

لوئس نے کندھے اُچکائے۔ "یہ کہہ دینا بہت آسان ہے۔ کسی چمکیلے دن، جب آدمی شکاگو میں اطالیہ کوچک سے سیر کرتا ہوا گزرے، تو وہاں بھی لوگ بڑے خوش نظر آتے ہیں۔"

"اس میں شک نہیں،" میں نے کہا۔ "غور سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔"

"میں تمھارا انتظار کرتے ہوئے یہی سوچ رہا تھا،" لوئس بولا۔ "ہمارے لیے ہر چیز چھٹی کا لطف رکھتی ہے، کیوں کہ سیاحت نام ہی چھٹی منانے کا ہے۔ لیکن یہ لوگ یقیناً چھٹی نہیں منا رہے ہیں۔" اس نے زیتون کی گٹھلی منھ سے باہر تھوکی۔ "جب آدمی اس طرح گھومتا پھرتا ہے، سیاح کی طرح، تو اصل حقیقت اس سے پوشیدہ رہتی ہے۔"

میں لوئس کی طرف دیکھ کر مسکرا دی۔ "چلو یہاں ایک چھوٹا سا مکان خرید لیں۔ جھولن کھٹولے پر سویا کریں گے، میں تمھارے لیے تورتیا پکایا کروں گی، اور ہم انڈین لوگوں کی زبان بولنا سیکھ لیں گے۔"

"اور کیا چاہیے!" لوئس بولا۔

"آہ!" میں نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "کاش آدمی کو کئی زندگیاں مل سکتی ہوتیں!"

لوئس نے مجھے گھور کر دیکھا۔ "تم کچھ ایسے گھاٹے میں تو نہیں ہو،" اس نے مسکرا کر کہا۔

"کیا مطلب؟"

"تم نے اپنے لیے باقاعدہ دو زندگیاں حاصل کر لی ہیں۔ کم از کم مجھے تو یہی لگتا ہے۔"

لہو اُمڈ کر میرے رخساروں میں آ گیا۔ لوئس کی آواز میں عداوت کا رنگ نہیں تھا، لیکن اس میں لگاوٹ کا رنگ بھی نہیں تھا۔ کیا اس کی وجہ پیرس سے آنے والے خط تو نہیں؟ مجھے فوراً اندازہ ہو گیا کہ ہمارے مسائل کے بارے میں اکیلی میں ہی متفکر نہیں ہوں، اپنے مخصوص انداز میں وہ بھی ان کے بارے میں غور فکر کرتا رہا ہے۔ میں اپنے سے کہہ رہی تھی: "میں لوٹ آئی، میں ہمیشہ لوٹ آیا کروں گی۔" لیکن ممکن ہے وہ خود سے کہہ رہا ہو: "وہ ہمیشہ یہاں سے لوٹ جایا کرے گی۔" میں اُسے کیا جواب دے سکتی ہوں؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

میں نے تڑپ کر کہا: "ہم کبھی ایک دوسرے کے دشمن نہیں ہوں گے، یا ہوں گے؟"

"دشمن؟ کیا کوئی تمھارا بھی دشمن ہو سکتا ہے؟"

وہ بالکل بھونچکا نظر آ رہا تھا۔ وہ لفظ جو میں نے بلا سوچے سمجھے بک دیے تھے، واقعی احمقانہ تھے۔ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے مسکرا رہا تھا، اور میں اس کی طرف دیکھ کر مسکرا دی۔ اچانک ایک خوف نے مجھے گھیر لیا: کیا کسی دن مجھے اس بات کی سزا ملے گی کہ اپنی پوری زندگی بدلے میں دیے بغیر میں نے محبّت کرنے کی جسارت کیسے کی؟

ہوٹل میں فلیمنگو کے دو پودوں کے درمیان ہم نے کھانا کھایا۔ میریدا میں ٹورسٹ ایجنسی نے ہماری دیکھ بھال کے لیے جس پستہ قد میکسیکن کو لگا دیا تھا، لوئس بڑی بے صبری سے اُس کی بات سن رہا تھا۔ اور میں بالکل نہیں سن رہی تھی۔ میں ابھی تک اسی اُدھیڑبُن میں تھی کہ لوئس کے دماغ میں کس قسم کے خیالات آ جا رہے ہیں۔ ہم مستقبل کے بارے میں کبھی بات نہیں کرتے تھے، لوئس اس کے بارے میں مجھ سے کبھی کوئی سوال نہیں کرتا تھا؛ بہتر ہوتا کہ میں خود ہی اس سے سوال کر لیتی۔ لیکن پارسال میں نے اسے سب کچھ بتا ہی دیا تھا۔ دوسرے یہ کہ لفظوں کا استعمال خطرے سے خالی نہیں ہوتا؛ اس میں چیزوں کے گڈمڈ ہو جانے کا خطرہ لاحق رہتا ہے۔ ضرورت اس کی تھی کہ وقتِ موجود میں جی کر ہم اپنی محبّت کا تجربہ کریں؛ آئندہ جب یہ استوار ہو چکی ہو گی، تو اس پر بات چیت کرنے کا بھی وقت نکل آئے گا۔

"مادام بس میں چی چین ایتزا (Chichen Itza) نہیں جا سکتیں،" میکسیکن نے کہا۔ وہ میری طرف دیکھ کر بڑی کشادگی سے مسکرایا۔ "کار آپ کے تصرّف میں رہے گی۔ آپ دونوں پورا دن خرابات کی سیر کر سکیں گے، اور ڈرائیور گائیڈ کا کام بھی دے گا۔"

"ہمیں گائیڈ وائیڈ پسند نہیں، اور پیدل چلنا اچھا لگتا ہے،" لوئس نے کہا۔

"ایجنسی کے گاہکوں کے لیے ہوٹل مایا نے رعایتی نرخ مقرّر کر رکھا ہے۔"

"ہم وکٹوریا میں ٹھہریں گے،" میں نے کہا۔

ہماری خاموشی کے مقابلے میں وہ ایک مختصر سی افسردہ مسکراہٹ کے ساتھ تعظیماً جھکا۔ "آپ کا دن خاصی تکلیف میں گزرے گا۔"

حقیقت یہ ہے کہ جو بس ہمیں اگلی شام چی چین ایتزا لے گئی، کافی آرام دہ نکلی، اور جب ہوٹل مایا کے باغیچے کے پاس سے گزرتے ہوئے امریکی آوازوں کی غوغا ہمارے کانوں میں پڑی تو ہم نے اپنی ہٹ دھرمی پر خاصا فخر محسوس کیا۔ "ملاحظہ ہو!" لوئس نے مجھ سے کہا۔

"میں اتنی دور، میکسیکو، امریکیوں کے دیدار کے لیے تو نہیں آیا ہوں!"

اس نے ایک مختصر سا سفری تھیلا اٹھا رکھا تھا، اور ہم کیچڑ بھری سڑک پر ٹٹول ٹٹول کر آگے بڑھ رہے تھے۔ پیڑ پودوں سے موٹی موٹی بوندیں ٹپک رہی تھیں، جس کے باعث آسمان ہماری نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ ہر طرف گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا، اور پھپھوندی، سڑتی گلتی پتّیوں اور مرتے ہوئے پھولوں کی بھاری بدبو نے میرا سر چکرا دیا۔ تاریکی میں چمکتی آنکھوں والی غیر مرئی بلّیاں اوپر نیچے کودتی پھر رہی تھیں۔ میں نے اُن بے جسم پُتلیوں کی طرف اشارہ کیا: "یہ کیا ہے؟"

"جگنو۔ ہمارے ہاں اِلی نوئے میں بھی ہوتے ہیں۔ لالٹین میں پانچ سات پکڑ کے بند کر دو اور پھر دیکھو: ان سے اتنی روشنی نکلتی ہے کہ آدمی کتاب پڑھ سکتا ہے۔"

"اس وقت اس سے بڑی مدد ملتی!" میں نے کہا۔ "مجھے تو کچھ دکھائی نہیں دے رہا۔ تمھیں یقین ہے کہ یہاں دوسرا ہوٹل بھی ہے؟"

"سو فیصد۔"

لیکن اپنی حد تک مجھے شک ہو چلا تھا۔ ایک مکان تک دکھائی نہیں دے رہا تھا، نہ کوئی انسانی آواز سنائی دے رہی تھی۔ آخرکار ہسپانوی بولتی ہوئی آوازیں کان میں پڑیں؛ ایک دیوار تھوڑی تھوڑی نظر آنے لگی۔ لیکن کہیں ایک بتّی کا بھی وجود نہیں تھا۔ لوئس نے دھکیل کر ایک پھاٹک کھولا، لیکن ہمیں اندر جانے کی ہمّت نہیں ہوئی۔ سوَر غرّا رہے تھے، مرغیاں کڑکڑا رہی تھیں، اور کہیں آس پاس بینڈک اپنا کورس الاپ رہے تھے۔

"ڈاکوؤں کا اڈّا لگ رہا ہے،" میں بڑبڑائی۔

لوئس نے زور سے آواز دے کر پوچھا: "یہ ہوٹل ہے؟"

کچھ جنبش سی ہوئی، ایک موم بتّی کانپی، پھر بھک سے روشنیاں جل اُٹھیں۔ ہم کسی سرائے کے صحن میں تھے۔ ایک آدمی ہماری طرف دیکھتے ہوئے شائستگی سے مسکرا رہا تھا۔ اس نے ہسپانوی میں کچھ کہا۔ "معذرت کر رہا ہے۔ فیوز اُڑ گیا تھا،" لوئس نے بتایا۔ "اس کے پاس جگہ ہے۔"

کمرے کے سامنے صحن تھا اور پیچھے جنگل۔ کمرہ بے سازوسامان نظر آتا تھا، لیکن سفید مُچھر دانی کے اندر بچھی ہوئی چادریں بے حد اُجلی اور بے داغ تھیں۔ رات کے کھانے میں ہمیں تورتِیا ملیں، جو ہمارے دانتوں سے چپک گئیں، اور اودے رنگ کی پھلیوں کے بیج، اور

ایک ہڈیوں کا پنجر مرغ، جس کے شور بے سے میرا حلق جلنے لگا۔ ڈرائنگ روم کو تہواروں کے موقعوں پر میلوں ٹھیلوں میں نظر آنے والی سجاوٹوں اور رنگین لِتھوگراف تصویروں سے سجایا گیا تھا۔ ایک کیلنڈر میں، بال وپَر کا لباس پہنے نیم برہنہ انڈین لوگ کسی قدیم اسٹیڈیم میں باسکٹ بال کھیل رہے تھے۔ صحن میں میکسیکن سوّروں اور مرغیوں کے درمیان پڑی بنچ پر کوئی بیٹھا گٹار بجا رہا تھا۔

"شکاگو کتنا دور لگتا ہے!" میں نے کہا۔ "اور پیرس بھی! ہر چیز کتنی دور لگتی ہے!"

"ہاں، سفر تو ہم اب شروع کر رہے ہیں،" لوئس جوش میں آکر بولا۔

میں نے اس کا ہاتھ دبایا۔ اس لمحے مجھے بالکل یقین تھا کہ اس کے دماغ میں کیا ہے: گٹار کی آواز، بینڈکوں کا کورَس، اور میں۔ گٹار اور بینڈکوں کی آواز میں بھی سن رہی تھی، اور میں خود بلاشرکتِ غیرے اُس کی تھی۔ اس کے لیے، میرے لیے -- ہمارے لیے -- ہمارے سوا کسی اَور چیز کا وجود نہ تھا۔

بینڈکوں کا کورَس رات بھر ہمارے کمرے میں در آتا رہا؛ صبح ہم ہزاروں پرندوں کی چہچہاہٹ کے درمیان بیدار ہوے۔ جب ہم اُس احاطے میں داخل ہوے جس کے اندر قدیم شہر واقع تھا تو وہاں ہمارے سوا کوئی اَور موجود نہیں تھا۔ لوئس معبدوں کی طرف دوڑ پڑا، اور میں دھیرے دھیرے اس کے پیچھے چلنے لگی۔ یوکتان پہنچنے پر مجھے بڑی حیرت ہوئی تھی، مگر یہاں پہنچ کر تو میں بالکل بھونچکا رہ گئی۔ آثارِ قدیمہ کا تصوّر میرے لیے اب تک صرف بحیرۂ روم کے علاقے سے وابستہ رہا تھا۔ ایکروپولس اور فورَم میں میں نے بغیر کسی حیرت کے اپنے ماضی پر غور کیا تھا؛ لیکن کوئی چیز ایسی نہیں تھی جو میری زندگی کو چی چین ایتزا سے منسلک کرتی ہو۔ ہفتہ بھر پہلے تک خون میں نہائے ہوے پتھروں کے اس بھاری جیومیٹریکل مکّے کا نام تک مجھے نہیں معلوم تھا؛ لیکن اب، اب وہ بالکل میرے سامنے تھا: گراں ڈیل، سماعت سے محروم، ریاضیاتی اعتبار سے اپنی حیرت انگیز طور پر باقاعدہ تعمیر کے بوجھ اور اپنی متشدّدانہ سنگ تراشی سے زمین کا سینہ کچلتا ہوا۔ عبادت گاہیں، قربان گاہیں، وہ اسٹیڈیم جس کی تصویر کیلنڈر پر بنی تھی، ہزاروں ستونوں والا بازار، دیگر متناسب عبادت گاہیں اور ان کی باولی مُنبت کاری۔ میں نے لوئس کو ڈھونڈا تو اسے سب سے بلند اہرام کی چوٹی پر پایا۔ وہ ہاتھ لہرا رہا تھا؛ بالکل ذرا سا لگ رہا تھا۔ زینہ سخت ڈھلواں تھا، اور میں اپنے پیروں کی طرف دیکھے بغیر، صرف لوئس پر نظر جمائے اس پر چڑھتی چلی گئی۔

"ہم کہاں ہیں؟"

"میں خود اسی اُدھیڑ بُن میں ہوں۔"

احاطے کی دیوار سے آگے حدِ نظر تک جنگل پھیلا ہوا تھا۔ سبز وسعت میں کہیں کہیں گرم سیر علاقے کے سُرخ درختوں میں کا کوئی کوئی درخت ناگہاں پھٹا پڑتا تھا۔ دور دور تک کہیں کسی کھیت کا نام نشان نہیں تھا۔

"تو آخر یہ اپنی مکئی کہاں اُگاتے ہیں؟"

"تو کیا اسکول میں تمھیں کچھ بھی نہیں پڑھایا گیا؟" لوئس خودپسندی سے بولا۔ "کاشت کے وقت جنگل کے ایک قطعے کو آگ لگا کر صاف کر لیتے ہیں۔ فصل کٹنے کے بعد درخت پھر سے اُگ آتے ہیں۔ تاراجی کے سارے نشان چُھپ جاتے ہیں۔"

"تمھیں کیسے معلوم ہے؟"

"بس ہے!"

میں ہنسنے لگی۔ "بالکل جھوٹ! یہ سب تم نے کسی کتاب میں پڑھا ہے، اور ممکن ہے کل رات ہی پڑھا ہو، جب میں سو رہی تھی۔ ورنہ کل بس ہی میں نہ بتا دیتے۔"

وہ ٹوٹ کر رہ گیا۔ "کیسی عجیب بات ہے،" اس نے کہا، "تم چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی میرا جھوٹ سچ تاڑ جاتی ہو۔ تم نے بالکل ٹھیک کہا، رات ہوٹل میں ایک کتاب میرے ہاتھ لگ گئی تھی، اور میں تم پر رعب جمانا چاہتا تھا۔"

"تو جماؤ! اَور کیا کیا دریافت کیا؟"

"یہ کہ مکئی کے پودے خود بہ خود بڑے ہوتے رہتے ہیں۔ کسانوں کو سال میں چند ہفتوں سے زیادہ کام کرنے کی حاجت نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے پاس اتنی بہت سی عبادت گاہیں بنانے کے لیے وقت ہی وقت ہوتا ہے۔" پھر اس نے ایک ناگاہ تشدّد کے ساتھ اضافہ کیا: "ذرا ان کی زندگی کا تصوّر تو کرو: تورتیا کھانا اور بھاری پتھر ڈھونا، جلتے ہوئے سورج کے نیچے، کھانا کھانا اور پسینے میں شرابور ہونا، شرابور ہونا اور کھانا کھانا، ہر روز۔ دیکھا جائے تو انسانوں کا قربانی کے لیے استعمال کسی بھی طرح اِس زندگی کا بدترین پہلو نہیں تھا۔ کتنے آدمیوں کو بھینٹ چڑھایا ہوگا؟ گنتی کے چند! اب ذرا ان لاکھوں بدبختوں کا تصوّر کرو جنھیں کاہنوں اور جنگی سپاہیوں نے باقاعدہ باربردار جانوروں میں تبدیل کر دیا تھا۔ اور کس لیے؟ صرف احمقانہ خودنمائی کے لیے نا؟"

اس نے غصّے سے ان اہراموں کی طرف دیکھا جو اگلے وقتوں میں سورج کے رخ سر اونچا کیے کھڑے ہوں گے، لیکن آج ہمیں زمین کو اپنے بوجھ تلے کچلتے ہوئے لگ رہے تھے۔ میں اس غصّے میں اس کی شریک نہیں تھی، شاید اس لیے کہ پیٹ بھرنے کے واسطے مجھے کبھی شدید مشقت نہیں اٹھانی پڑی تھی، اور شاید اس لیے بھی کہ یہ آلام بہت قدیم تھے۔ مگر میں اس قابل بھی نہیں تھی کہ بغیر کسی ذہنی پس و پیش کے اس مُردہ حسن کے گیان دھیان میں ڈوب جاؤں، جیسا کہ اب سے دس سال پہلے میرے لیے ممکن تھا۔ وہ تہذیب جس نے اَن گنت انسانی جانوں کو عمارتی پتھر جمع کرنے کے اپنے کھیل کی بھینٹ چڑھا دیا تھا، کب کی نیست و نابود ہو چکی تھی۔ مجھے اس کا بانجھ پن اس کی سفّاکی سے کہیں زیادہ گراں گزرا۔ بس گنے چُنے ماہرینِ آثارِ قدیمہ اور جمال پرستوں کو ہنوز ان قدیم یادگاروں میں دلچسپی رہ گئی تھی جن کی تصویریں سیّاح یوں بے سوچے سمجھے اتارتے پھرتے تھے۔

"اب نیچے نہ اُتریں؟" میں نے پوچھا۔

"کیسے اتریں گے؟"

میں نے نیچے نظر ڈالی تو یوں لگا جیسے چبوترے تک بلند ہوتی ہوئی چاروں دیواریں مکمل طور پر عمودی ہوں۔ ایک دیوار پر روشنی اور سائے کی دھاریاں پڑی ہوئی تھیں اور اس پر پیر دھرنے کا خیال بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لوئس ہنس پڑا۔ "تو کیا میں نے تمھیں کبھی نہیں بتایا کہ زمین سے چھ فٹ اوپر پہنچتے ہی مجھے چکّر آنے لگتے ہیں۔ میں سوچے سمجھے بغیر چڑھ گیا، اب نیچے اترنا میرے بس کا روگ نہیں۔"

"مگر اترنا تو تمھیں پڑے گا ہی!"

لوئس چبوترے کے وسط میں سمٹ گیا۔ "ناممکن!" وہ پھر مسکرایا۔ "دس سال ہوئے، لاس اینجلس میں میں بھوکوں مر رہا تھا۔ پھر نوکری ملی ۔۔ ایک فیکٹری کی چمنی کے بالائی حصّے پر پلاسٹر چڑھانے کی۔ مجھے ایک ٹوکری میں بٹھا کر بلند کیا گیا، اور میں اگلے تین گھنٹے اس ٹوکری میں دم بخود بیٹھا رہا؛ قسم لے لو جو ذرا جنبش کی ہو۔ آخر تنگ آ کر مجھے اتارا گیا، اور میں خالی جیب لیے وہاں سے چل دیا۔ دو دن سے ایک لقمہ بھی نہیں کھایا تھا، یہ صرف تمھاری اطلاع کے لیے!"

"عجیب بات ہے کہ تمھیں چکّر آنے لگتے ہیں،" میں نے کہا۔ "تم نے زندگی میں کیا کچھ نہیں جھیلا، کیا کچھ نہیں دیکھا۔ میرا خیال نہیں تھا کہ تم اتنے پھسپھسے نکلو گے۔" "میں چل

کر زینے کی طرف گئی۔ "ایک پورا امریکی کنبہ نیچے کھڑا اوپر آنے کی تیاری کر رہا ہے۔ چلو نیچے اتریں۔"

"تمھیں ڈر نہیں لگ رہا؟"

"بالکل لگ رہا ہے۔"

"اچھا، تو پہلے مجھے جانے دو،" لوئس نے کہا۔

ہاتھوں میں ہاتھ دیے، ہم زینے سے آڑے آڑے چل کر اترے۔ جب نیچے پہنچے تو پسینے میں شرابور تھے۔ ایک گائیڈ سیاحوں کو مایا روح کے اسرار کے بارے میں بتا رہا تھا۔

"سیاحت کیسی پُرلطف چیز ہے!" میں بڑبڑائی۔

"ہاں، بالکل!" لوئس نے کہا۔ اس نے مجھے تیز چلنے پر اکسایا۔ "چلو واپس چل کر کچھ پییں گے۔"

سخت گرم سہ پہر تھی؛ اسے ہم نے اپنے کمرے کے دروازے کے سامنے پڑے جھولن کھٹولوں میں اونگھتے ہوئے گزارا۔ پھر یک لخت، کسی ناگزیر حرکت کے دباو سے، تجسس نے میرا سر جنگل کی طرف موڑ دیا۔

"میں جنگلوں کی سیر کرنا چاہتی ہوں،" میں نے کہا۔

"کیوں نہیں؟" اس نے جواب دیا۔

ہم جنگل کی اتھاہ اور رسیلی ہوئی خاموشی میں داخل ہو گئے۔ یہیں کسی سیاح کا وجود نہ تھا۔ سرخ چیونٹیوں کی فوجیں کندھوں پر گھاس کی نوکیلی پتیاں اٹھائے غیر مرئی قلعوں کی طرف مارچ کرتی چلی جا رہی تھیں۔ ہمارا سابقہ تتلیوں کے قافلوں سے بھی پڑا جو ہمارے قدموں کی آہٹ پاتے ہی گلابی، نیلے، سبز اور زرد رنگ بن کر اڑ گئے۔ بڑ کی داڑھیوں میں مقید پانی کو جنبش ہوئی اور وہ بڑے بڑے قطرے بن کر ہمارے اوپر ٹپکنے لگا۔ وقفے وقفے سے کسی راستے کی انتہا پر کوئی پُراسرار ٹیلا اُبھر کر بصارت پر حاوی ہو جاتا: پتھریلی کوکھ میں لپٹا ہوا کسی معبد یا رج محل کا کھنڈر۔ بعض معبد یا محل تھوڑے بہت کھُدے ہوئے بھی تھے لیکن اب گھاس نے انھیں ڈھانپ لیا تھا۔

"ایسا لگتا ہے جیسے یہاں پہلے کبھی کوئی نہیں آیا،" میں نے کہا۔

"ہاں،" لوئس لاتعلقی سے بولا۔

"وہاں دیکھو، راستے کے آخر پر۔ کوئی بہت بڑا معبد ہے۔"

"ہاں، "لوئس نے دوبارہ کہا۔
یہ ایک بہت بڑا معبد تھا۔ سنہری چھپکلیاں پتھروں میں دبی خود کو حرارت پہنچا رہی تھیں۔ ایک اژدہے کو چھوڑ کر، جو دانت نکالے ہنس رہا تھا، باقی مجسّمے ٹوٹی پھوٹی حالت میں تھے۔ میں نے اشارے سے لوئس کو وہ اژدہا دکھایا، لیکن اس کا چہرہ بے تاثر رہا۔
"وہ اژدہا نظر آرہا ہے؟" میں نے پوچھا۔
"آرہا ہے، "اس نے جواب دیا۔
اچانک اس نے اژدہے کے منہ پر لات ماری۔
"یہ کیا کر رہے ہو؟"
"لات مار رہا ہوں۔"
"کیوں؟"
"اس کا دیکھنے کا انداز مجھے اچھا نہیں لگ رہا۔"
لوئس ایک چٹان پر بیٹھ گیا۔ میں نے پوچھا: "معبد کا احاطہ نہیں دیکھنا چاہتے؟"
"تم دیکھ آؤ۔ میں یہیں بیٹھ کر انتظار کروں گا۔"
میں معبد میں گھومتی پھری، لیکن اوپری دل سے۔ مجھے صرف پتھر ہی دکھائی دے رہے تھے جو ایک کے اوپر ایک ڈھیر کر دیے گئے تھے، اور جن کا کوئی مقصد دکھائی نہیں دیتا تھا۔ جب میں لوٹ کر آئی تو لوئس نے اپنی جگہ سے جنبش تک نہیں کی؛ اس کا چہرہ یوں خالی نظر آرہا تھا جیسے وہ اپنے آپ سے جاتا رہا ہو۔
"خوب سیر کر لی؟" اس نے پوچھا۔
"واپس چلنا چاہتے ہو؟"
"اگر تمھاری طبیعت سیر ہو گئی ہو تو۔"
"ہاں، بالکل سیر ہو گئی ہے، "میں نے کہا۔ "چلو واپس چلیں۔"
اندھیرا ہو چلا تھا۔ شام کے پہلے پہلے جگنو نظر آنے لگے تھے۔ میں نے مضطرب ہو کر خود سے کہا کہ اب، بہر حال، میں لوئس سے پوری طرح تو واقف نہیں ہوں۔ وہ اتنا بے ساختہ اور بے لاگ تھا کہ میں اسے پیچیدگی سے بالکل خالی سمجھ بیٹھی تھی۔ لیکن پیچیدگی سے خالی کون ہوتا ہے؟ جس لمحے اس نے مجسّمے کو ٹھوکر ماری تھی، تب کہاں خوش گوار لگ رہا تھا! اور سر چکرانے کے وہ دورے، وہ کس بات کے غمّاز تھے؟ ہم چپ چاپ چلتے رہے۔ وہ کیا سوچ رہا

ہے؟

"کیا سوچ رہے ہو؟"

"اپنے شکاگو والے فلیٹ کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ میں بتی جلتی چھوڑ آیا ہوں۔ سڑک پر گزرنے والے سوچ رہے ہوں گے کہ گھر میں کوئی ہے۔ لیکن وہاں کوئی نہیں ہے۔"

اس کی آواز میں ایک طرح کی اُداسی تھی۔

"تمہیں یہاں ہونے پر افسوس ہے؟"

لوئس نے چھوٹا سا قہقہہ لگایا۔ "تو کیا میں واقعی یہاں ہوں؟ یہ بھی خوب رہی۔ تم بالکل بچوں کی طرح ہو۔ تمہیں ہر چیز حقیقی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن میرے لیے یہ سب کسی خواب کی طرح ہے۔ کسی اور کے دیکھے ہوئے خواب کی طرح۔"

"مگر اس کے باوجود، تم سچ مچ یہاں ہو۔ اور میں بھی۔"

لوئس نے کچھ جواب نہیں دیا۔ ہم جنگل سے باہر نکل آئے۔ تاریکی اب پوری طرح پھیل چکی تھی۔ آسمان پر قدیم ستاروں کے جھُرمٹ نئے ستاروں کے درمیان بڑی بے ترتیبی سے پھیلے ہوئے تھے۔ سرائے کی روشنیاں نظر آتے ہی لوئس مسکرا دیا۔ "پہنچ گئے! لگ رہا تھا کہ کھو گیا ہوں۔"

"کھو گئے ہو؟"

"وہ سارے کھنڈر کس قدر قدیم ہیں! ضرورت سے زیادہ قدیم۔"

"کھو جانے کا احساس مجھے تو اچھا لگتا ہے،" میں نے کہا۔

"مجھے اچھا نہیں لگتا۔ میں کچھ زیادہ ہی دیر تک کھویا رہا۔ لگ رہا تھا اب کبھی اپنے کو نہیں پا سکوں گا۔ میں اس تجربے سے کسی قیمت پر دوبارہ گزرنے کو تیار نہیں۔"

اس کی آواز میں سرکشی کی گمک سی تھی جس سے مجھے ہلکا سا خوف آ گیا۔ "بھی کبھی آدمی کو گم ہونا ہی پڑتا ہے،" میں نے کہا۔ "" اگر آدمی کبھی جوا نہ کھیلے تو اسے کبھی کچھ حاصل بھی نہیں ہو سکتا۔"

"ایسا جوا کھیلنے سے بہتر ہے کہ مجھے کچھ حاصل نہ ہو،" لوئس فیصلہ کن لہجے میں بولا۔

میں اس کی بات سمجھ گئی۔ ذرا سی ناموریت کی خاطر اُسے اتنے مصائب کا سامنا کرنا پڑا تھا کہ اب وہ ہر قیمت پر اس کی حفاظت کا تہیہ کیے ہوئے ہے۔ مگر مجھ سے محبت کر کے اس

نے کس قدر ناعاقبت اندیشی کا ثبوت دیا تھا! کیا وہ آگے چل کر اس پر پچھتانے والا ہے؟

"کیا تم نے اژدہے کو اسی لیے لات رسید کی تھی کہ خود کو گم محسوس کر رہے تھے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں، مجھے وہ جانور ہی ناپسند تھا۔"

"تم اُس وقت واقعی بڑے کمینے لگ رہے تھے۔"

"کمینہ ہی جو ٹھہرا، اسی لیے،" اس نے کہا۔

"میرے لیے تو نہیں!"

وہ مسکرا دیا۔ "تمھارے ساتھ کمینگی کرنا آسان نہیں۔ ایک دفعہ کوشش کی تھی۔ پچھلے سال، اور تم فوراً آنسو بہانے بیٹھ گئی تھیں۔"

ہم اپنے کمرے میں پہنچے، اور میں نے پوچھا: "لوئس، تم مجھے کسی بات کا الزام تو نہیں دیتے نا؟"

"مثلاً کس بات کا؟"

"میں کیا جانوں۔ ہر بات کا، کسی بھی بات کا نہیں۔ دو زندگیاں گزارنے کا۔"

"اگر تمھاری صرف ایک ہی زندگی ہوتی تو پھر یہاں کہاں ہوتیں،" لوئس نے کہا۔

میں نے اسے بڑی تشویش کی نظر سے دیکھا۔ "کیا تم مجھے اس کے لیے مجرم سمجھتے ہو؟"

"نہیں،" اس نے جواب دیا۔ "میں تمھیں اس کے لیے مجرم نہیں سمجھتا۔" اس نے مجھے اپنی آغوش میں کھینچ لیا۔ "میں تمھارے قریب آنا چاہتا ہوں۔"

اس نے مچھردانی ایک طرف سرکا کر مجھے بستر پر گرا دیا۔ جس وقت ہم برہنہ تھے۔۔ ہمارے بدن ایک دوسرے سے چمٹے ہوئے تھے، وہ مسرّت سے بولا: "یہ ہمارا حسین ترین سفر ہے۔"

دمک اس کے چہرے پر لوٹ آئی تھی۔ اب وہ خود کو کھویا ہوا محسوس نہیں کر رہا تھا۔ جو راحت ہم نے ایک دوسرے کی آغوش میں پائی، وہ ہر چیز پر غالب آجانے والی تھی۔

سیر و سفر، دنیا بھر میں مارے مارے پھرنا، تاکہ آنکھ سے وہ سب دیکھ لیا جائے جو اَب موجود نہیں ہے، جس سے آدمی کا کچھ واسطہ نہیں ۔۔ یہ بلاشبہ خاصا مشکوک مشغلہ ہے۔ اس

بات پر لوئس کا اور میرا اتفاق تھا، تاہم یہ بات ہمیں جی بھر کر لطف اندوز ہونے سے باز نہ رکھ سکی۔ اتوار کا دن تھا جب ہم اوش مال (Uxmal) دیکھنے گئے۔ معبدوں کے سائے میں ...ین لوگ پکنک کے توشہ دان کھول رہے تھے۔ لمبے اسکرٹ پہنے عورتوں کی ایک ٹولی کے پیچھے پیچھے، زنجیر کی دستی روک کو مضبوطی سے تھام کر، ہم شکستہ سیڑھیوں والے ایک طویل زینے پر چڑھے۔ دو دن بعد ہم مینھ سے بھرے جنگلوں کے اوپر پرواز کر رہے تھے۔ جہاز آسمان میں خوب اوپر چڑھ گیا اور نیچے آتا ہوا نہیں لگا، بلکہ خود زمین ہم سے ملنے کے لیے اوپر آ رہی تھی۔ اس کے وسیع ہرے پن کے درمیان ایک نیلی جھیل اور ایک مسطح شہر پھیلا ہوا ...جس کے بلاکوں کی باقاعدگی گراف پیپر کی یاد دلاتی تھی -- گواٹے مالا سٹی، جس کی سڑکوں کی خشک غربت میں پھیلے ہوئے پستہ قد مکان، خلقت سے بھرے کھچا کھچ بھرے بازار، قطاروں میں ننگے پاؤں کھڑے کسان، شاہانہ چیتھڑوں میں ملبوس، سروں پر پھولوں اور پھلوں سے بھری ٹوکریاں اٹھائے ہوئے۔ انٹیگوا میں واقع ہوٹل کے باغیچے میں سرخ، اودے اور نیلے پھول ڈھیر کی صورت درختوں کے تنوں پر گر رہے تھے اور دیواریں ان سے ڈھک ...ئی تھیں۔ بڑے زور کی بارش ہو رہی تھی -- گنجان گرم بارش -- اور زنجیر سے بندھا ایک ...تا ہنستا ہوا اپنے بسیرے پر چڑھ اتر رہا تھا۔ آتیتلان نامی جھیل کے کنارے ہم ایک بنگلے میں ...وئے جو کارنیشن پھولوں کے گچھوں سے اٹا ہوا تھا۔ کشتی کے ذریعے ہم سان تیاگو پہنچے، ...ہاں پیشانی کے گرد سرخ پٹیاں باندھے عورتیں، سر سے کندھوں تک اُستوائی خودوں میں ...نے ہوئے بچوں کو جھکولے دے رہی تھیں۔ جمعرات کے روز ہم چی چی کاستینانگو (Chichicastinango) کے بازار کے بیچوں بیچ بس سے اترے۔ چوک خیموں اور خوانچہ ...والوں سے اٹا پڑا تھا۔ کشیدہ کاری کے شلوکوں اور رنگ برنگے سایوں میں ملبوس عورتیں اناج، آٹا، روٹی، سوکھے سُکڑے پھل، مریل مرغیاں، مٹی کے برتن، بٹوے، پیٹیاں، چپل، اور ...ایک اور رنگے ہوئے شیشوں جیسے رنگوں والے کپڑوں کے تھان بیچ رہی تھیں۔ یہ کپڑے اتنے دل آویز تھے کہ لوئس ان سے لذت اندوز ہونے کی خاطر انھیں چھوئے بغیر نہ ...رہ سکا۔

"یہ شہابی رنگ کا کپڑا خریدو گی؟" اس نے پوچھا، "یا پھر یہ سبز رنگ کا جس پر چھوٹی چھوٹی چڑیاں بنی ہوئی ہیں؟"

"ذرا رک جاؤ،" میں نے کہا۔ "پہلے سب چیزیں دیکھ تو لیں۔"

ان سارے عجائب میں سب سے شان دار وہ بے آستین قبائیں تھیں جو بعض دہقانوں نے پہنی ہوئی تھیں۔ میں نے لوئس کو ایسی ہی ایک قبا دکھائی جس پر پرانے وقتوں کی کشیدہ کاری کا کام تھا، جس میں نہایت شوخ نیلا رنگ ماندے ماندے سے سرخ ور سنہری رنگوں میں بڑی سج کے ساتھ گھُل مل رہا تھا۔

"اگر بکاؤ ہوتا تو بس یہی خریدتی۔"

لوئس نے انڈین بُڑھیا کا جائزہ لیا جس کی لمبی لمبی چُٹیاں تھیں۔ "کیا پتا بیچ ہی دے!"

"میں تو پوچھنے کی جرأت نہیں کر سکتی۔ اور پوچھوں بھی تو کس زبان میں؟"

ہم بازار میں گھومتے رہے۔ عورتیں تورتیا کا آٹا اپنی ہتھیلیوں پر گوندھ رہی تھیں، زرد آبگوشت سے بھرے برتن آگ پر اُبلتے ہوئے سُوں سُوں کر رہے تھے، کنبے کھانا کھانے میں مصروف تھے۔ چوک کے پہلو میں سفید رنگ کے دو گرجے تھے جن تک پہنچنے کے لیے زینے چڑھ کر جانا پڑتا تھا۔ سیڑھیوں پر چند آدمی، جو کسی مختصر، لطیف اور عاشقانہ غنائی تمثیل کے بُل فائٹروں کا سا لباس پہنے ہوئے تھے، لوبان کی دُھونی کے برتن جھُلاتے جا رہے تھے۔ دھوئیں کے دبیز بادل میں سے ہو کر، جس نے میرے عبادت گزار بچپن کی یاد تازہ کر دی، ہم بڑے والے گرجا کو جانے والا زینہ چڑھنے لگے۔

"کیا خیال ہے، ہمیں اندر آنے دیں گے؟" میں نے پوچھا۔

"ہمارا کیا بگاڑ لیں گے؟" لوئس بولا۔

سو ہم اندر داخل ہو گئے، اور لوبان کی بھاری مہک نے میرا حلق جکڑ کے رکھ دیا۔ وہاں نہ پیوز (pews) تھے نہ کسی اَور قسم کی نشستیں، بلکہ بیٹھنے کی سرے سے کوئی جگہ ہی نہیں تھی۔ پتھر کی سِلوں کا فرش ٹمٹماتی، لو دیتی گلابی موم بتیوں کی پھول کیاری لگ رہا تھا۔ انڈین لوگ منھ ہی منھ میں دعائیں پڑھتے ایک دوسرے کی طرف مکئی کے بھٹے بڑھا رہے تھے۔ سامنے آلٹر پر کمخواب اور پھولوں سے ڈھنپی ہوئی ایک حنوط شدہ میت رکھی تھی۔ آلٹر کے مقابل، طرح طرح کے پارچوں اور زیورات سے لدے پھندے، بہت بڑے اور لہولہان یسوع مسیح تھے جن کے چہرے پر شدید کرب کا تاثر تھا۔

"کاش معلوم ہو سکتا کہ یہ لوگ کیا بڑبڑا رہے ہیں،" لوئس بولا۔

وہ کھردرے اور گٹھے پڑے ہوئے پیروں والے ایک بوڑھے آدمی کی طرف دیکھ رہا تھا

جو پنے سامنے گھٹنوں کے بل جھکی ہوئی عورتوں کو دعاے برکت دے رہا تھا۔ میں نے لوئس کا بازو پکڑ کر کھینچا۔ "چلو باہر چلیں۔ اتنی بہت سے لوبان سے میرا سر دُکھنے لگا ہے۔"

جب ہم باہر نکل آئے تو لوئس نے مجھ سے کہا: "مجھے تو یہ انڈین لوگ بالکل خوش نہیں لگ رہے۔ انھوں نے بھڑکیلے کپڑے ضرور پہن رکھے ہیں، لیکن اندر سے اتنے شادماں نہیں ہیں۔"

ہم نے پیٹیاں، چپّل اور پارچے خریدے۔ وہ بُڑھیا جس نے شان دار بے آستین قبا پہن رکھی تھی، ہنوز وہاں موجود تھی، لیکن میری ہمّت نہیں پڑتی کہ اسے مخاطب کروں۔ چوک کی وہ جگہ جو بیک وقت کینٹے اور کھانے پینے کی چیزوں کی دکان تھی، اس میں کچھ انڈین مرد میز کے گرد بیٹھے شراب پی رہے تھے؛ ان کی گھر والیاں ان کے قدموں میں بیٹھی تھیں۔ ہم نے تکیلا (tequila) کا آرڈر دیا، جو ہمیں نمک اور چھوٹے چھوٹے سبز لیموؤں کے ساتھ پیش کی گئی۔ دو جوان انڈین کچھ لڑکھڑا رہے تھے، کچھ ساتھ ساتھ رقص کر رہے تھے؛ وہ لطف اندوزی کی صلاحیت سے اس درجہ کورے تھے کہ میرا دل بھر آیا۔ باہر دکان دار اپنی گشتی دکانیں بڑھانے میں لگے ہوے تھے؛ انھوں نے اپنے مٹّی کے برتن اپنی پیٹھوں پر تلے اوپر، پیچیدہ عمارتوں کی شکل میں جما لیے تھے۔ ان کی پیشانیاں اُن چرمی پٹّیوں کے زور سے تنی ہوئی تھیں جن کے ذریعے انھوں نے اپنے بوجھ کو سہارا دیا ہوا تھا۔ اور وہ اسی طرح، کسی کتّے کی سی تیز اور سبک رفتار سے وہاں سے چل دیے۔

"ذرا دیکھو تو سہی،" لوئس نے کہا۔ "اپنے کو بار برداری کا جانور سمجھتے ہیں۔"

"اتنے نادار ہیں کہ اس کام کے لیے گدھے نہیں رکھ سکتے۔"

"ایسا ہی لگتا ہے،" وہ بولا۔ "لیکن اپنی ناداری پر کیسے قانع ہیں؛ ان کی اِسی بات سے مجھ کوفت ہوتی ہے۔ کیا خیال ہے، ہوٹل واپس نہ چلیں؟"

"ہاں چلو۔"

ہم ہوٹل لوٹ آئے۔ وہ مجھے دروازے پر چھوڑ کر یہ کہتا ہوا واپس چل دیا: "سگریٹ خریدنا بھول گیا۔ تم چلو، میں بس ابھی آیا۔"

آتش دان میں آگ بھڑک رہی تھی؛ دھوپ میں نہایا ہوا وہ چھوٹا سا شہر، فرانس کے بلند ترین گاؤں کے مقابلے میں، کہیں زیادہ اونچائی پر واقع تھا، چناں چہ راتیں کافی خنک ہو سکتی تھیں۔ میں شعلوں کے سامنے لیٹ گئی اور لکڑی کے چیپ کی سوہنی سُگندھ سُوں سُوں کر

کے اپنے اندر اتارنے لگی۔ مجھے گلابی پلاسٹر کی دیواروں والا اور قالین بچھا یہ کمرہ بہت اچھا لگا۔ میں لوئس کے بارے میں سوچنے لگی؛ میں تھوڑی سی تنہائی اور لوئس کے بارے میں سوچنے کا موقع پا کر خوش تھی۔ ظاہر ہے لوئس پر چیزوں کی دل آویزی کا اثر نہیں ہوتا تھا۔ اس سے غرض نہیں کہ آپ اسے کیا دکھائیں ۔۔ معبد، مناظر، پینٹھ بازار ۔۔ وہ فوراً ان کے آرپار دیکھ لیتا تھا، اور صرف انسانوں پر اس کی نظر جمتی تھی۔ پھر، آدمی کو کیسا ہونا چاہیے، اس کے بارے میں بھی اس کا اپنا مخصوص نظریہ تھا: وہ جو اپنے کو چیزوں کے رحم و کرم پر نہ چھوڑ دے، جس میں خواہشات موج زن ہوں، اور جو ان کو آسودہ کرنے کی خاطر لڑنے مرنے کو تیار ہو۔ رہی اُس کی اپنی ذات، تو اس کے لیے بہت تھوڑا ہی کافی تھا، تاہم وہ اس بات کا شدت سے انکاری تھا کہ جس چیز پر اس کا حق نکلتا ہو اس سے اسے فریب دے کر محروم کر دیا جائے۔ اس کے ناولوں میں نرمی اور سفاکی کا عجیب امتزاج ملتا تھا، کیوں کہ اسے ایسے ظلم رسیدوں سے جو اپنی حالت پر ضرورت سے زیادہ صبر کر کے بیٹھ رہیں، تقریباً اتنی ہی شدید نفرت تھی جتنی ان پر ظلم کرنے والوں سے۔ اپنی ہم دردی اس نے اُن کے لیے وقف کر رکھی تھی جنھوں نے کم از کم فرار کی کوشش تو کی ہو ۔۔ ادب میں، آرٹ میں، منشیات میں، اور بد ترین یہ کہ جرائم میں، گو کہ قابلِ ترجیح طور پر مسرّت میں۔ اور اگر وہ صحیح معنوں میں کسی کا گرویدہ تھا تو وہ عظیم انقلابی ہی تھے۔ سیاست کے داو پیچ سے وہ اتنا ہی نابلد تھا جتنی میں، تاہم بڑے جذباتی سے انداز میں اُسے اسٹالن، ماوزے تنگ اور ٹیٹو سے عقیدت تھی۔ امریکی اشتراکیوں کو وہ سادہ لوح اور رقیق القلب سمجھتا تھا، تاہم میرا خیال ہے کہ اگر وہ فرانس میں ہوتا تو خود بھی اشتراکی ہوتا، یا کم از کم ہونے کی کوشش ضرور کرتا۔ میں نے سر موڑ کر دروازے کی طرف دیکھا۔ اُسے آنے میں اتنی دیر کیوں ہو رہی ہے؟ میں بے چین ہونے ہی والی تھی کہ آخر کار وہ لوٹ آیا، بغل میں ایک پیکٹ دبائے ہوئے۔

"کیا کر رہے تھے؟" میں نے پوچھا۔

"ایک خاص مشن پر گیا ہوا تھا۔"

"کس نے بھیجا تھا؟"

"خود میں نے۔"

"تو پورا کر آئے؟"

"اور کیا!"

اس نے پیکٹ میری طرف اُچھال دیا۔ میں نے اُتاولے پن سے کاغذ پھاڑا۔ میری آنکھیں جاندار نیلاہٹ سے بھر گئیں۔ وہی بے آستین قبا تھی!

''بڑی گندی ہو رہی ہے،'' لوئس نے کہا۔

میں نے کشیدہ کاری کے متلوّن، مگر بڑے سوچے سمجھے، ڈِزائن پر بڑے اشتیاق سے انگلیاں پھیریں۔ ''بے حد شان دار ہے۔ کیسے مل گئی؟''

''ڈیسک کلرک کو ساتھ لے گیا تھا۔ سارا بھاؤتاؤ اُسی نے کیا۔ بُڑھیا تو اپنے گودڑ کو بیچنے کی بات ہی سننے کی روادار نہیں تھی، لیکن جب ہم نے اس کے عوض ایک نئی قبا خرید کر دینے کی پیش کش کی تو راضی ہو گئی۔ بلکہ اس نے تو مجھے کچھ ایسے دیکھا جیسے نرا چغد ہوں۔ بعد میں کلرک کو شراب پلانی پڑی، لیکن اتنے پر وہ کہاں میری جان چھوڑنے والا ہے۔ وہ نیویارک جا کر ڈھیروں پیسہ بنانا چاہتا ہے۔''

میں نے لوئس کی گردن میں بانہیں ڈال دیں۔ ''تم میرا اتنا خیال کیوں رکھتے ہو؟''

''کہاں رکھتا ہوں؟ تم سے کہہ ہی چکا ہوں، میں بڑا خودغرض ہوں۔ بات یہ ہے کہ تم میری ذات کا ایک جُز بن چکی ہو۔'' اس نے مجھے زور سے چمٹا لیا۔ ''تم سے محبّت کرنے میں بڑی مٹھاس ہے۔''

آہ، ان لمحوں میں، جب محبّت کی گدازی سے ہمارا دم گھُٹا جا رہا تھا، ہمارے بدن کتنے کار آمد نکلے! میں نے خود کو لوئس کے بدن کے ساتھ دبایا۔ اس کا بدن بیک وقت اتنا مانوس اور اتنا غلبہ آور کیسے ہو سکتا ہے؟ اچانک اس کی حرارت میری جلد کو جُھلساتی ہوئی میری ہڈیوں تک اُتر گئی۔ چٹختے شعلوں کے سامنے ہم قالین میں دھنس گئے۔

''این! تم جانتی ہو، جانتی ہو نا، میں تم سے کتنا پیار کرتا ہوں؟ اس کے باوجود کہ میں تم سے اس پیار کا بار بار ذکر نہیں کرتا، تم ضرور جانتی ہو، ہے نا؟''

''جانتی ہوں۔ اور تم بھی جانتے ہو، جانتے ہو نا؟''

''ہاں، میں جانتا ہوں۔''

ہم نے اپنے کپڑے اتار پھینکے، اور جہاں جہاں وہ جا کر گرے انھیں وہیں پڑا رہنے دیا۔

''میں تمھیں کیوں اتنا چاہتی ہوں؟''

وہ قالین پر مجھ سے ہم جسم ہوا، اس کے بعد بستر پر بھی۔ میں دیر تک اس کے پہلو

میں پڑی رہی، میرا سر اس کے کندھے کے گڑھے پر ٹکا رہا۔

"تمھارے پہلو میں پڑے رہنے سے مجھے عشق ہے!"

"اور مجھے اس سے کہ تم میرے پہلو میں پڑی رہو۔"

تھوڑی دیر بعد لوئس نے خود کو کہنی کا سہارا لے کر اٹھایا۔ "میرے حلق میں کانٹے پڑ رہے ہیں۔ تمھارا کیا حال ہے؟"

"کچھ پینے کو مل جائے تو اچھا ہو۔"

اس نے ٹیلیفون اٹھایا اور وِسکی کے دو جام لانے کو کہا۔ میں نے جلدی سے اپنا ڈریسنگ گاؤن پہن لیا، اور اُس نے اپنی پُرانی سفید باتھ روب۔

"اس عفریت سے اب تمھیں جان چھڑا لینی چاہیے،" میں نے کہا۔

اس نے ٹیری کلاتھ کی باتھ روب مضبوطی سے اپنے گرد سمیٹ لی۔ "ہرگز نہیں! جب تک یہ خود مجھے نہ تج دے۔"

وہ بخیل بالکل نہیں تھا۔ لیکن اسے چیزوں، خاص طور پر اپنے پُرانے کپڑوں کو تج دینا سخت ناپسند تھا۔ وِسکی آ گئی، اور ہم آتش دان کے پاس جا بیٹھے۔ باہر بارش شروع ہو چکی تھی؛ بارش ہر رات ہوتی تھی۔

"مجھے بہت اچھا لگ رہا ہے،" میں نے کہا۔

"مجھے بھی،" لوئس بولا۔ اس نے اپنا بازو میرے کندھوں کے گرد ڈال دیا۔ "این!" اس نے کہا۔ "میرے ساتھ آ رہو۔"

میرا دم حلق میں اٹک گیا۔ "لوئس، تم خوب جانتے ہو کہ خود مجھے اس کی کتنی خواہش ہے۔ مجھے اس کی بڑی خواہش ہے! پر ایسا کر نہیں سکتی۔"

"کیوں؟"

"پچھلے سال تمھیں بتا تو دیا تھا کیوں۔"

میں ایک ہی گھونٹ میں جام چڑھا گئی، اور جانے پہچانے اندیشے مجھ پر غالب آ گئے -- کلب دیلیزا کے، میریدا کے، چی چین ایتزا کے، اور بہت سے دوسرے خوف جنھیں میں نے بڑی تیزی سے دبا دیا تھا۔ اسی بات کا تو مجھے اندیشہ تھا: ایک نہ ایک دن وہ مجھ سے کہے گا، میرے ساتھ آ رہو، اور مجھے انکار کرنا پڑے گا۔ پھر اس کے بعد کیا ہو گا؟ اگر میں نے لوئس کو پچھلے سال کھو دیا ہوتا تو خود کو کسی نہ کسی بہانے تسلّی دے لی ہوتی۔ لیکن اب، اب

اس سے محروم رہنا ایسا ہی تھا جیسے زندہ در گور ہونا۔

"تم شادی شدہ ہو تو کیا ہوا؟" اس نے کہا۔ "طلاق لے سکتی ہو۔ ہم شادی کیے بغیر ساتھ رہ سکتے ہیں۔" وہ میرے اوپر جھک گیا۔ "میری زندگی میں تو اگر عورت ہے تو تمھیں ہو۔"

میری آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔ "مجھے تم سے محبت ہے،" میں نے کہا۔ "تمھیں پتا ہے مجھے تم سے کتنی شدید محبت ہے۔ لیکن میں اپنی عمر کے جس دور میں ہوں، اس میں کوئی آسانی سے اپنی پوری زندگی سے دست بردار نہیں ہو جاتا۔ اس کا وقت نکل چکا ہے۔ ہم بہت تاخیر سے ملے ہیں۔"

"میرے حساب سے تو نہیں،" اس نے کہا۔

"اچھا؟" میں نے کہا۔ "اگر میں تم سے کہوں کہ پیرس آکر اپنی بقیہ زندگی گزار دو تو تم ایسا کر سکو گے؟"

"مجھے فرانسیسی بولنی نہیں آتی،" لوئس نے جھٹ سے جواب دیا۔

میں مسکرا دی۔ "تو سیکھ لینا۔ پیرس میں رہنا شکاگو میں رہنے سے زیادہ مہنگا نہیں۔ باقی رہا تمھارا ٹائپ رائٹر، تو اسے آسانی سے منتقل کیا جا سکتا ہے۔ تو پھر، کیا خیال ہے؟ چل رہے ہو؟"

لوئس کا چہرہ ایک دم تاریک ہو گیا۔ "پیرس میں لکھنے کے قابل کہاں رہوں گا!"

"ظاہر ہے!" میں نے کہا، اور شانے اُچکائے۔ "دیکھا، اجنبی ملک میں تم لکھنے کے قابل نہ رہو گے اور تمھاری زندگی کا مفہوم بھی جاتا رہے گا۔ میں ادیب تو نہیں ہوں، مگر بعض چیزیں میرے لیے اُتنی ہی اہم ہیں جتنی تمھاری کتابیں تمھارے لیے۔"

لوئس لحہ بھر کے لیے خاموش ہو رہا۔ پھر اس نے پوچھا: "لیکن تم مجھ سے محبت تو کرتی ہو، کرتی ہو نا؟"

"ہاں،" میں نے جواب دیا۔ "مرتے دم تک کرتی رہوں گی۔" میں نے اس کے ہاتھ تھام لیے۔ "لوئس، میں سال کے سال تم سے ملنے آسکتی ہوں۔ اگر سال کے سال ملنے کا یقین ہو تو پھر جدائی کہاں ہو گی، بس انتظار ہو گا۔ اور اگر محبت شدید ہو تو آدمی خوشی سے انتظار کر سکتا ہے۔"

"اگر تم بھی مجھے اُسی طرح چاہتی ہو جیسے میں تمھیں چاہتا ہوں، تو تین چوتھائی زندگی

انتظار میں گنوا دینا کون سی عقلمندی ہے؟" لوئس نے کہا۔

میں جھجکی۔ "اس لیے کہ محبت ہی سب کچھ نہیں ہے،" میں نے کہا۔ "تمہارا میری بات سمجھنا بہت ضروری ہے؛ خود تمہارے لیے بھی یہ سب کچھ نہیں ہے۔"

میری آواز لرز رہی تھی، اور میری آنکھیں لوئس سے سمجھنے کی التجا کر رہی تھیں، اور اس بات کی کہ وہ مجھ سے وہی محبت کیے جائے جو سب کچھ نہیں تھی، مگر جس کے بغیر میری بھی کوئی اہمیت نہ رہتی۔

"نہیں، محبت سب کچھ نہیں ہے۔"

اس نے مجھے تھوڑے سے تردد کے ساتھ دیکھا، اور میں نے بڑی گرم جوشی سے کہا: "میری نظر میں دوسری چیزوں کی جو اہمیت ہے، وہ تم سے میری چاہت کو کم نہیں کر دیتی۔ تم مجھے اس کا الزام مت دینا، اس کے باعث مجھ سے محبت کم نہ کر دینا۔"

لوئس نے ہولے سے میرے بالوں کو چھوا۔ "اگر محبت ہی تمہارے لیے سب کچھ ہوتی تو میں تمہیں اس قدر نہ چاہتا۔ تم تم نہ رہتیں۔"

میری آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ اگر وہ مجھے، جیسی کہ میں تھی، قبول کر رہا ہے -- میرے ماضی کے ساتھ، میری مخصوص زندگی کے ساتھ، ہر اُس چیز کے ساتھ جو اُسے مجھ سے جدا کرتی ہے -- تو ہماری مسرت بچ نکلی ہے۔

میں نے خود کو اُس کی آغوش میں گرا دیا۔ "لوئس، غضب ہوتا اگر تم یہ سب نہ سمجھ سکتے۔ مگر تم سمجھتے ہو۔ کیسے بتاؤں کہ میں کتنی خوش ہوں!"

"رو کیوں رہی ہو؟" لوئس نے پوچھا۔

"میں اتنی خوف زدہ تھی۔ تمہیں کھو کر میں زندہ نہیں رہ سکتی تھی۔"

اس نے ایک آنسو کو میرے رخسار پر مسلتے ہوئے کہا: "روؤ مت! تم روتی ہو تو میں ڈر جاتا ہوں۔"

"اس وقت تو میں خوشی کے مارے رو رہی ہوں،" میں نے کہا۔ "یہ سوچ کر کہ ہمیں خوشی میسّر ہو گی۔ جب ہمیں ایک دوسرے کا قرب حاصل ہو گا تو اتنی ڈھیر ساری مسرت جمع کر لیں گے -- کر لیں گے نا، لوئس؟ -- کہ سال بھر کے لیے کافی ہو گی۔"

"ہاں، میری ننھی سی گلواز!" لوئس نے پیار سے کہا۔ اس نے میرے بھیگے ہوئے رخسار کو چوما۔ "عجیب بات ہے، لیکن بعض وقت تم واقعی بڑی سیانی نظر آتی ہو، اور بعض

وقت کسی کم سن بچّی کی طرح۔"

"میں صرف ایک بےوقوف عورت ہوں،" میں نے کہا۔ "لیکن اگر تم مجھے چاہتے ہو تو پھر مجھے کچھ پروا نہیں۔"

"میں تمہیں چاہتا ہوں میری بےوقوف ننّھی سی گلواز،" لوئس نے کہا۔

اگلی صبح، جب ہم بس میں بیٹھے کیتسال تینانگو (Quezaltenango) جا رہے تھے، میرا دل چھلکنے کی حد تک بھرا ہوا تھا۔ مجھے اب نہ مستقبل سے خوف آرہا تھا، نہ لوئس سے، نہ لفظوں سے: مجھے کسی چیز سے خوف نہیں آرہا تھا۔ میں نے پہلی بار کھُل کر منصوبے بنانے کی جسارت کی: اگلے سال لوئس مِشیگن میں جھیل کے کنارے مکان کرائے پر لے گا اور ہم گرمیاں اس میں گزاریں گے۔ اس سے اگلے سال وہ پیرس آئے گا اور میں اُسے فرانس اور اٹلی کی سیر کراؤں گی۔۔۔ میں نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے اپنے ہاتھ میں تھام لیا اور اس نے مسکرا کر میرے منصوبوں کو قبولیت بخش دی۔ ہم گھنے جنگلوں میں سے ہو کر گزرے: گرتی ہوئی بارش اتنی سوہنی، گرم اور مہک دار تھی کہ اسے اپنے چہرے پر محسوس کرنے کی خاطر میں نے کھڑکی اوپر چڑھا لی۔ چرواہے اپنی پھونس کی قباؤں میں بےحرکت کھڑے، ہمیں گزرتا دیکھتے رہے: بالکل یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اپنی کمر پر جھونپڑیاں لادے ہوئے ہوں۔

"کیا ہم واقعی سطحِ سمندر سے بارہ ہزار فٹ کی بلندی پر ہیں؟" لوئس نے پوچھا۔

"لگتا تو کچھ ایسا ہی ہے۔"

اس نے سر ہلایا۔ "مجھے یقین نہیں آتا۔ ایسا ہوتا تو مجھے چکّر نہ آنے لگتے؟"

دور سے دیکھنے پر، گلیشیَروں جتنے بلند قامت اور گھنے درختوں سے ڈھکے ہوئے وہ مرتفع میدان مجھے ہمیشہ باور نہ آنے والی، اچنبھے کی چیز ہی لگتے تھے۔ لیکن اب میں انھیں اپنی آنکھ سے دیکھ رہی تھی، اور وہ کسی فرانسیسی مرغزار کی طرح قدرتی نظر آرہے تھے۔ حقیقت میں گواتےمالا کا کوہستانی علاقہ، اپنی خوابیدہ آتش فشاں پہاڑوں، اپنی جھیلوں، اپنی چراگاہوں، اپنے توہم پرست دہقانوں سمیت، اوورنیہ (Ouvergne) سے بےحد مشابہ تھا۔ تاہم میں اس سے اُکتا سی چلی تھی، چناں چہ دو دن بعد، جب ہم ساحل پر اتر آئے، تب مجھے اطمینان ہوا۔ اور وہ اترنا بھی کیسا اترنا تھا! پَو پھٹے ہم سبز چراگاہوں سے بل کھا کر گزرتی ہوئی سڑک پر کھڑے مارے سردی کے کپکپا رہے تھے۔ اور پھر برگ ریز پیڑ پودے، سیاہی مائل، سخت شیشے

جیسی پتیوں والی نباتات کے اُمڈ کر آتے ہوئے سیلاب میں روپوش ہو گئے۔ ترائی کی ایک چراگاہ میں، جو پالے سے ڈھکی ہوئی تھی، اَندُلسی طرز کا ایک مسکین سا گاؤں نمودار ہوا جسے بوگن ویلیا اور ہائی بسکس کے پھولوں نے کسی قدر بارونق بنا دیا تھا۔ اسٹیئرنگ ویل دو چار بار اَور گھوما اور ہم چکّردار سڑک سے چند درجے اَور نشیب میں آ گئے۔ جس وقت ہم کیلوں کے باغوں سے گزر رہے تھے، جن میں جابجا پھیلی ہوئی جھونپڑیوں کے درمیان اِنڈین لوگ ننگی چھاتیاں لیے گھومتے پھر رہے تھے، اُس وقت آسمان کوئلے کی طرح دہک رہا تھا۔ ماساتیپنانگو کا اسٹیشن کسی میلے کا میدان لگ رہا تھا: عورتیں اپنے باہر کو پھیلتے ہوئے سایوں، اپنے پُشتاروں، اپنے مرغے مرغیوں کے درمیان پٹریوں پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ فاصلے پر گھنٹی کی آواز گونجی، عملے کے لوگ چیخنے چلّانے لگے، اور ایک چھوٹی سی ریل گاڑی بھاپ کی ہَس ہَساہٹ اور دھات کی جھنجھناہٹ کے قدیم شور کے جلو میں نمودار ہوئی۔

پچھتّر میل کے اس فاصلے کو طے کرنے میں، جس نے ہمیں گواٹےمالا سِٹی سے جدا کیا، ہمیں پورے دس گھنٹے لگے۔ اگلے دن، سیاہ پہاڑوں اور ساحل کی چمکتی ہوئی لکیر کے اوپر پرواز کرتے ہوئے ایک طیّارے نے صرف پانچ گھنٹوں میں ہمیں میکسیکو سِٹی پہنچا دیا۔

"بارے ایک شہر تو آیا! سچ مچ کا شہر، جہاں کچھ ہو رہا ہے،" ٹیکسی میں لوئس نے کہا۔ پھر یہ اَور بڑھا دیا: "مجھے شہر پسند ہیں۔"

"مجھے بھی!"

ہم نے ایک ہوٹل میں جگہ رُکوائی ہوئی تھی؛ وہاں ہمارے نام آئی ہوئی ڈاک منتظر ملی۔ میں نے کمرے میں لوئس کے برابر بیٹھ کر اپنے خط پڑھے۔ اب میں اپنی پیرس کی زندگی کے بارے میں آزادی سے سوچ سکتی تھی؛ مجھے یہ اندیشہ نہیں تھا کہ اس عمل سے کسی طرح لوئس کی حق تلفی ہو گی۔ اب میں اُسے ہر بات میں شریک کر سکتی تھی، حتّی کہ اُن باتوں میں بھی جو ہمیں ایک دوسرے سے جدا کرتی تھیں۔ رابرٹ اپنے خط میں کافی خوش دل لگ رہا تھا: اس نے لکھا تھا کہ نادِین غمگین ہے لیکن ساتھ ساتھ پُرسکون بھی، اور پولا تقریباً صحت یاب ہو گئی ہے۔ سب بخیریت ہے۔

میں لوئس کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔ "کس کا خط ہے؟"

"میرے پبلشر کا۔"

"کیا لکھا ہے؟"

"میری زندگی کے کچھ خاص خاص واقعات چاہییں، کتاب کو لانچ کرنے کے لیے۔ پبلِسٹی کی ایک زبردست مہم کا اہتمام ہو رہا ہے۔"

لوئس کی آواز میں دبی دبی سی ناراضگی تھی۔ میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"اس کا مطلب ہوا تم کافی پیسہ بنا لو گے، ٹھیک ہے نا؟"

"امّید تو یہی ہے،" اس نے جواب دیا۔ پھر اس نے خط جیب میں ڈال لیا اور بولا: "مجھے فوری جواب دینا ہے۔"

"فوری کیوں؟" میں نے پوچھا۔ "چلو پہلے میکسیکو سِٹی دیکھنے چلتے ہیں۔"

لوئس ہنسنے لگا۔ "کیسی بلا کی ضدّی کھوپڑی پائی ہے! اور آنکھیں جو دیکھنے سے کبھی نہیں تھکتیں!"

وہ ہنس رہا تھا، تاہم اس کی آواز میں کوئی بات ضرور تھی جو مجھے متردّد کیے دے رہی تھی۔ "اگر باہر جانے کو تمھارا دل نہیں چاہ رہا تو یہیں اندر بیٹھے رہتے ہیں،" میں نے کہا۔

"مگر اس صورت میں تم خود کو ناخوش محسوس کرو گی،" لوئس نے کہا۔

ہم الامیدا نامی سڑک پر چل پڑے۔ فٹ پاتھ پر عورتیں تدفین کے موقعے پر استعمال ہونے والے پھولوں کی لڑیاں بُن رہی تھیں۔ ایک میّت گاہ کی پیشانی پر "الکزار" کا لفظ شادمانی سے جگمگا رہا تھا۔ ہم ایک کشادہ شاہراہ سے گزرے جہاں بہت بِھیڑ تھی، اور اس کے بعد کئی بدنام گلیوں سے بھی۔ میکسیکو سِٹی مجھے پہلی ہی نظر میں بھا گیا۔ لیکن لوئس کا دھیان کہیں اَور لگا ہوا تھا۔ مجھے اس پر حیرت نہیں ہوئی۔ کبھی تو وہ پلک جھپکتے میں کچھ کر گزرنے کا فیصلہ کر ڈالتا، لیکن اکثر ایک سوٹ کیس میں سامان رکھنے یا ایک خط لکھنے سے پہلے گھنٹوں متذبذب رہتا۔ رات کے کھانے پر میں نے تمام وقت اُسے یوں ہی اپنی سوچوں میں گم رہنے دیا۔ کمرے میں لوٹتے ہی وہ ایک سادہ کاغذ لے کر بیٹھ گیا۔ منھ آدھ کھلا، آنکھیں پتھرائی ہوئی، وہ کسی مچھلی کی طرح لگ رہا تھا۔ اس کے ایک لفظ لکھنے سے پہلے مجھے نیند آ گئی۔

"خط پورا کر لیا تھا؟" اگلی صبح میں نے پوچھا۔

"ہاں۔"

"لکھنے میں اتنی دقّت کیوں ہو رہی تھی؟"

"نہیں تو۔" وہ ہنسنے لگا۔ "بس بس، مجھے اس طرح نہ دیکھو جیسے میں تمھارے مریضوں میں سے ہوں۔ آؤ، میرے ساتھ سیر کو چلو۔"

اُس ہفتے ہم نے خوب خوب سیر کی۔ ہم بلند اہراموں کی چوٹیوں پر چڑھے اور پھولوں سے بھری ہوئی کشتیوں میں بیٹھ کر گھومے پھرے؛ شاہراہِ بالیسکو پر چہل قدمی کی، اس کے خستہ حال بازاروں میں مارے مارے پھرے، اس کی رقص گاہوں میں داخل ہوئے اور اس کے تھیئٹروں میں جہاں رنگارنگ غنائی ناٹک دکھائے جاتے تھے؛ ہم نے شہر کے مضافات میں مٹر گشت کی اور بدنام شراب خانوں میں بیٹھ کر ٹکیلا چڑھائی۔ ہمارا ارادہ ہو رہا تھا کہ میکسیکو سِٹی میں قیام کو ذرا طول دے دیں، ایک ماہ کے اندر ملک کا باقی حصّہ بھی گھوم لیں، اور پھر چند دن کے لیے شکاگو لوٹ جائیں۔

لیکن ایک سہ پہر، جب ہم قیلولے کی غرض سے اپنے کمرے میں واپس آئے، تو لوئس نے اچانک مجھ سے کہا: "جمعرات کو میرا نیویارک میں ہونا ضروری ہے۔"

میں نے اچنبھے سے اس کی طرف دیکھا۔ "نیویارک میں؟ کیوں؟"

"میرے پبلشر نے بلایا ہے۔"

"اس کی طرف سے کوئی اَور خط ملا ہے؟"

"ہاں۔ دو ہفتے کے لیے بلایا ہے۔"

"لیکن تمھارے لیے اس کی دعوت قبول کرنا ضروری تو نہیں،" میں نے کہا۔

"واہ، بالکل ہے،" لوئس نے جواب دیا۔ "ممکن فرانس میں معاملہ مختلف ہو،" اس نے اضافہ کیا، "لیکن یہاں کتاب باقاعدہ کاروبار ہے، اور اگر آدمی کی نیت اس سے کچھ کما کھانے کی ہو تو اس پر وقت بھی لگانا پڑتا ہے۔ مجھے لوگوں سے ملنا جُلنا ہو گا، دعوتوں میں شریک ہونا ہو گا، انٹرویو دینے ہوں گے۔ یہ تفریح بازی نہیں ہے، لیکن بہر حال کیا کِیا جائے، یہاں کا یہی طور طریق ہے۔"

"تم نے اُنھیں بتایا نہیں کہ جولائی تک تمھیں فرصت نہیں؟ کیا وہ یہ سب کچھ جولائی تک ملتوی نہیں کر سکتے؟"

"جولائی اچھا مہینہ نہیں ہے۔ اُنھیں اکتوبر تک انتظار کرنا پڑ جائے گا۔ اور تب تک بہت دیر ہو چکی ہو گی۔" لوئس نے بڑی بے صبری سے اضافہ کیا: "پچھلے چار سال سے میری گزراوقات پبلشروں کے سہارے ہوتی رہی ہے۔ جو رقم انھوں نے مجھ پر لگائی ہے اُس کی بازیافت کے سلسلے میں مَیں اُن کی راہ میں نہیں آؤں گا۔ دوسرے یہ کہ مجھے خود بھی تو روزگار کی ضرورت ہے تاکہ اپنی مرضی کے مطابق لکھ سکوں۔"

"میں سمجھتی ہوں،" میں نے کہا۔

میں سمجھتی تھی، لیکن اپنے پیٹ کی گہرائی میں مجھے عجیب سا خالی پن محسوس ہوا۔

لوئس ہنسنے لگا۔ "بے چاری ننھی سی گلواز! اگر بات اس کی مرضی کے مطابق نہ ہو تو اس کی حالت کیسی قابلِ رحم ہو جاتی ہے!"

میں شرم سے سُرخ ہو گئی۔ اس میں کلام نہیں کہ لوئس کو ہر وقت بس میری خوشنودی سے سروکار تھا۔ اگر ایک آدھ بار اس نے اپنے مفاد کو بھی پیشِ نظر رکھ لیا تو اس پر مجھے خود کو اتنا معتوب تو نہیں سمجھ لینا چاہیے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ میں خود غرض ہوں، تبھی تو اس کی آواز میں قدرے جارحیت تھی۔

"قصور تمھارا ہے،" میں بولی۔ "تم ضرورت سے زیادہ میری ناز برداری کرتے رہے ہو۔" میں مسکرائی۔ "نیویارک ساتھ ساتھ دیکھنے میں ضرور لطف آئے گا۔ بس اس خیال سے دھچکا سا لگا کہ ہمیں اپنا تمام منصوبہ بدلنا پڑے گا۔ پھر تم نے اس کے بارے میں بتایا بھی تو پہلے سے خبردار کیے بغیر۔"

"تو کس طرح بتاتا؟"

"میں تمھیں دوش نہیں دے رہی،" میں نے خوش دلی سے کہا۔ پھر میں نے لوئس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ "کیا انھوں نے پہلے ہی خط میں تمھیں بلا بھیجا تھا؟"

"ہاں،" لوئس نے جواب دیا۔

"تو مجھے بتایا کیوں نہیں؟"

"تمھاری ناخوشی کے خیال سے،" لوئس نے جواباً کہا۔

اس کی جھکی ہوئی نظروں سے میں پسیج گئی۔ اب جا کر پتا چلا کہ اُسے خط کا جواب لکھنے میں اتنی دقت کیوں ہو رہی تھی: وہ اس کوشش میں تھا کہ کسی طرح ہمارے میکسیکو کے سفر کو بچا سکے، اور اس میں اپنی کامیابی پر اتنا بھروسا کیے بیٹھا تھا کہ مجھے اس سلسلے میں مضطرب کرنا بے فائدہ سمجھا۔ لیکن اسے ناکامی ہوئی۔ اور اب بد قسمتی کا سامنا کرتے ہوئے مسکرانے کی کوشش کر رہا تھا، اور میرے پس و پیش پر تھوڑا سا برہم تھا۔ وہ افسردہ رہنے پر برہم رہنے کو ترجیح دیتا ہے، یہ بات میں سمجھ سکتی ہوں۔

"تم اس بارے میں مجھے بتا سکتے تھے، بالکل۔ اب میں ایسی چھوٹی موٹی بھی نہیں ہوں،" میں نے کہا اور اس کی طرف پیار بھری مسکراہٹ سے دیکھا۔ "دیکھا نا، تم واقعی میری

ضرورت سے زیادہ ناز برداری کرتے رہے ہو۔"

"ہو سکتا ہے،" لوئس نے کہا۔

مبہم سی پریشانی نے مجھے ایک بار پھر آگھیرا۔ "ہم یہ سب بدل ڈالیں گے،" میں نے کہا۔ "نیویارک پہنچنے کی دیر ہے، پھر دیکھنا میں کس طرح تمھارا فرمان بجا لاتی ہوں۔"

لوئس نے ہنستے ہوئے میری طرف دیکھا۔ "سچ مچ؟"

"ہاں، سچ مچ۔"

"تو نیویارک پہنچنے کا انتظار کیوں کیا جائے؟ ابھی سے اس پر عمل شروع کر دیتے ہیں۔" اس نے میرے کندھے جکڑ لیے۔ "چلو میرا فرمان بجا لاؤ،" اس نے قدرے گستاخی سے کہا۔

یہ پہلا موقع تھا کہ بوسے کے لیے اپنے لب پیش کرتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ "نہ" کہہ دوں۔ لیکن میں "نہ" کہنے کی عادی نہیں تھی، میں ایسا نہ کر سکی۔ اور پھر اب اتنی دیر ہو چکی تھی کہ بات کا بتنگڑ بنائے بغیر پیچھے نہیں ہٹا جا سکتا تھا۔ ٹھیک ہے، دو ایک موقعوں پر میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی "ہاں" کہہ دی تھی، لیکن میرا دل ہمیشہ رضامند رہا تھا۔ آج، بہر کیف، بات مختلف تھی۔ لوئس کے لب و لہجے میں کچھ ایسی جارحیت تھی کہ میں اپنی جگہ پر منجمد ہو کر رہ گئی۔ اس کی اداؤں اور لفظوں نے پہلے کبھی مجھے ایسا جھٹکا نہیں دیا تھا، کیوں کہ ان میں اتنی ہی بے ساختگی ہوتی تھی جتنی اس کی خواہش میں، لذت اندوزی میں، عشق میں۔ لیکن آج ان جانی پہچانی قلابازیوں میں شریک ہوتے ہوئے مجھے بے کلی سی محسوس ہوئی، کیوں کہ یہ مجھے بڑی بھدی، ناشائستہ اور بے موقع لگیں۔ پھر مجھے یہ خیال بھی رہا کہ لوئس نے "مجھے تم سے محبت ہے" کہنے کا پاس نہیں رکھا تھا۔ یہ الفاظ اس نے آخری بار کب ادا کیے تھے؟

یہ لفظ تو اس نے اس کے بعد آنے والے دنوں میں بھی ادا نہیں کیے۔ وہ صرف نیویارک ہی کا ذکر کرتا رہا۔ سن سینتالیس میں جب وہ بحری جہاز میں یوروپ جانے کے لیے روانہ ہو رہا تھا، تب ایک دن وہاں گزارا تھا، اور اب وہاں لوٹنے کا سخت آرزومند تھا۔ اسے امید تھی کہ وہاں شکاگو کے بعض پرانے دوستوں سے رابطہ ہو سکے گا، اسے بہت سی چیزوں کی امید تھی۔ لوئس کی نظر میں ماضی اور مستقبل کے مقابلے میں حال کی نسبتاً زیادہ قدر و منزلت تھی۔ میں اس کے ساتھ تھی، نیویارک بہت دور تھا؛ لیکن اس کے اعصاب پر

نیویارک ہی سوار تھا- اس بات سے میں بہت زیادہ مضطرب تو نہیں ہوئی، تاہم اس کی بشاشت نے مجھے ضرور افسردہ کر دیا- کیا اسے ہمارے مشترکہ سفر کو تج دینے پر ذرا بھی ملال نہیں؟ تازہ یادوں کی فراوانی کے سبب مجھے یہ خوف نہیں آیا کہ وہ مجھ سے بیزار ہو چکا ہے، لیکن شاید وہ مجھ سے کچھ زیادہ ہی مانوس ہو چلا ہے-

نیویارک گرمی سے بھن رہا تھا- وہ شبانہ موسلادھار بارشیں اب کہاں تھیں- آسمان سارا دن تپتا رہا- لوئس ذرا سویرے ہی ہوٹل سے چل دیا، اور میں پنکھے کی گھرگھراہٹ میں پڑی اونگھتی رہی- کچھ پڑھا، شاور سے نہائی، کچھ خط لکھے- چھ بجے میں کپڑے بدل کر لوئس کا انتظار کر رہی تھی- وہ ساڑھے سات بجے لوٹا، بے حد پُرجوش-

"میں نے فیلٹن کو ڈھونڈ نکالا!" اس نے کہا-

لوئس مجھے اس فیلٹن کے بارے میں بہت کچھ بتا چکا تھا: وہ رات کو طبلہ بجاتا تھا، دن میں ٹیکسی چلاتا تھا اور دن رات مسلسل نشہ کرتا تھا- اس کی بیوی پیشے کی تلاش میں سڑکوں پر گھومتی تھی اور خود بھی ہیروئن استعمال کرتی تھی- کسی فوری وجہ سے، جس کا تعلق ان دونوں کی صحت سے تھا، وہ شکاگو چھوڑ گئے تھے- لوئس کو ان کا درست پتا نہیں معلوم تھا- اپنے ایجنٹ اور پبلشر سے گلوخلاصی پاتے ہی لوئس ان کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا تھا اور ہزار ناکامیوں کے بعد کہیں جا کر فون پر فیلٹن تک رسائی حاصل ہوئی تھی-

"وہ ہمارا انتظار کر رہا ہے،" لوئس بولا- "ہمیں نیویارک کی سیر کرائے گا-"

میں شام تنہا لوئس کی رفاقت میں گزارنے کو ترجیح دیتی، تاہم میں نے راضی بہ رضا ہو کر کہہ دیا: "یقیناً مجھے اس سے مل کر لطف آئے گا-"

"اور وہ ہمیں بہت سی ایسی جگہیں دکھانے لے جائے گا جن کی اس کے بغیر ہمیں ہوا بھی نہ لگتی- میں شرط بدنے کو تیار ہوں، ایسی جگہیں تمہارے سائیکیٹرسٹ دوستوں نے تمھیں کبھی نہیں دکھائی ہوں گی!" لوئس نے زندہ دلی سے اضافہ کیا-

باہر فضا سخت گرم اور مرطوب تھی- اور فیلٹن کے سب سے اوپر کی منزل والے کمرے میں تو گرمی اَور بھی زیادہ تھی- وہ ایک بلند قامت، مُرجھائے ہوئے چہرے والا آدمی تھا جس نے بڑے تپاک سے ہنستے ہوئے لوئس سے ہاتھ ملایا- حاصل یہ کہ اُس نے ہمیں نیویارک بہت کچھ نہیں دکھایا- اس کی بیوی دو ایک نوجوانوں اور بیئر کینز کے کارٹنوں کی اچھی بھلی مقدار لیے آ پہنچی- وہ بیئر کے کین ایک کے بعد ایک چڑھاتے گئے اور بہت سے لوگوں

کے بارے میں باتیں کرتے رہے جن سے میں بالکل واقف نہیں تھی، جنھیں ابھی حال ہی میں جیل ہوئی تھی یا جو ابھی جیل کاٹ کر باہر آئے تھے؛ جو کسی روزگار کی تلاش میں تھے یا جنھیں روزگار مل گیا تھا۔ انھوں نے منشیات کی خوردہ فروشی کی باتیں بھی کیں اور یہ بھی کہ نیویارک میں پولیس والے کتنے میں خریدے جا سکتے ہیں۔ لوئس خوب محظوظ ہو رہا تھا۔ پھر ہم تھرڈ ایوینیو کے ایک شراب خانے میں پورک چاپس کھانے گئے۔ وہ دیر تک یہی باتیں کرتے رہے۔ صاف بات یہ ہے کہ میں سخت بور ہو گئی تھی اور کسی حد تک خود کو شکستہ دل بھی محسوس کر رہی تھی۔

اگلے چند دنوں میں بھی میری طبیعت ایسی ہی رہی۔ کم از کم ایک معاملے میں مجھے کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی تھی: نیویارک پہنچتے ہی لوئس قدرے بے لطف ہو گیا تھا۔ جس قسم کی زندگی یہاں اُس پر مسلط کی جا رہی تھی -- وہ مجلسی تقاریب، وہ اشتہار بازی -- اس سے اُسے مطلق دلچسپی نہیں تھی۔ وہ لنچ کی دعوتوں، ضیافتوں اور کاک ٹیل پارٹیوں میں بے کیف سا جاتا اور ان سے بدمزہ ہو کر لوٹتا۔ رہی میں، تو مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ اپنا کیا کروں۔ لوئس اوپری دل سے مجھے اپنے ساتھ چلنے کو ضرور کہتا، لیکن اس سال مَیں چلتے چلاتے کی دوستیاں لگانے، بلکہ اپنے پرانے شناساؤں تک سے ملنے کے موڈ میں نہیں تھی۔ میں سڑکوں پر مٹر گشت کرنے کے لیے نکل جاتی، تنہا اور بے مقصد۔ گرمی بلا کی پڑ رہی تھی، کولتار میرے قدموں کے نیچے پگھلا جا رہا تھا۔ میں ذرا سی دیر میں پسینے میں نہا جاتی، اور لوئس کی عدم موجودگی میرے اندر ایک تکلیف دہ خلا چھوڑ جاتی۔ اس صورتِ حال کا بدترین پہلو یہ تھا کہ جب ہم ساتھ ہوتے تب بھی ماحول کچھ زیادہ فرحت بخش نہ ہوتا۔ اکتا دینے والی بیٹھکوں کے بارے میں باتیں کرنے سے لوئس کو بوریت ہوتی، اور میرے پاس تو بات کرنے کو کچھ تھا ہی نہیں۔ چناں چہ ہم وقت گزاری کے لیے سنیما، یا باکسنگ کی کوئی پرائز فائٹ، یا بیس بال دیکھنے چلے جاتے، اور فیلٹن اکثر ہمارے ساتھ چلا آتا۔

"تمھیں فیلٹن کچھ زیادہ پسند نہیں آیا، ٹھیک ہے نا؟" ایک دن لوئس نے مجھ سے پوچھا۔

"بات یہ ہے کہ میرے پاس اس سے کہنے کے لیے کچھ نہیں، اور نہ اس کے پاس مجھ سے کہنے کے لیے،" میں نے جواب دیا۔ پھر میں نے متجسس نظروں سے لوئس کی طرف دیکھا۔ "یہ کیا بات ہے کہ تمھارے سارے جگری دوست یا تو جیب کترے ہیں، یا منشیات

کے عادی، یا دلّال؟"

لوئس نے شانے اُچکائے۔ "مجھے یہ لوگ، اَور لوگوں کی نسبت زیادہ دلچسپ لگتے ہیں۔"

مگر تم، منشیات استعمال کرنے کو کبھی تمھارا دل نہیں للچایا؟"

"نہیں بھئی!" وہ پھٹ سے بولا۔ "میں جیسا ہوں، تم جانتی ہی ہو: مجھے ہر خطرناک چیز سے عشق ہے -- شرط یہ ہے کہ ذرا فاصلے پر ہو۔"

وہ مذاق کر رہا تھا، تاہم بات سچ تھی۔ ہر ایسی چیز جو اعتدال سے باہر ہو، غیر معقول ہو، پُر خطر ہو، اُسے اپنا مسحور کر لیتی تھی، لیکن اس نے خود اپنی زندگی کو اعتدال اور معقولیت کے ساتھ، اور بغیر خطرات مول لیے، گزارنے کا فیصلہ کیا تھا۔ یہی تضاد تھا جو اسے اکثر بے چین اور متذبذب کر دیتا تھا، اور میں سوچنے لگی کہ کہیں یہی بات تو میرے ساتھ اس کے رویّے کی ذمے دار نہیں ہے۔ لوئس بڑی بے ساختگی اور ناعاقبت اندیشی کے ساتھ میری محبت میں گرفتار ہوا تھا: کیا اب وہ اس بات پر خود کو ملامت کرنے لگا ہے؟ بہر کیف، میرے لیے اب اس بات کو خود سے چھپائے رکھنا ممکن نہیں رہا تھا کہ پچھلے چند ہفتوں کے دوران اس میں خاصی تبدیلی آ چکی ہے۔

اُس شام جب وہ کمرے میں لوٹا تو کافی سرشار تھا۔ اس نے پوری سہ پہر ریڈیو کے واسطے ایک انٹرویو رِکارڈ کرانے میں گزاری تھی، اور میں بد سے بدتر کی توقع میں تھی۔ لیکن اس نے بڑی مسرّت سے مجھے چوما۔

"جلدی سے تیار ہو جاؤ، چلو!" اس نے کہا۔ "میں جیک مَری کے ساتھ ڈنر کھانے جا رہا ہوں، اور تم میرے ساتھ چل رہی ہو۔ وہ تم سے ملنے کا بہت مشتاق ہے، اور میں بھی تمھیں اُس سے ملانے کے لیے سخت بے تاب ہوں۔"

میں نے اپنی مایوسی چھپانے کی ذرا کوشش نہیں کی۔ "آج شام؟ لوئس، کیا ہمیں ایک شام بھی ساتھ گزارنا میسّر نہیں ہو گی؟ تنہا، صرف ایک دوسرے کے ساتھ؟"

"ہم اس سے جلدی رخصت ہو لیں گے،" لوئس نے جواب دیا۔ اُس نے اپنی جیبوں کی ساری چیزیں نکال کر ڈریسر پر رکھ دیں اور الماری میں سے اپنا نیا سُوٹ نکالا۔ "کم ہی مجھے کوئی ادیب پسند آتا ہے،" اس نے کہا۔ "اگر میں تم سے کہوں کہ مری تمھیں پسند آئے گا، تو تم میری بات کا یقین کر سکتی ہو۔"

"مجھے یقین ہے، "میں نے کہا۔
میں سنگھار میز کے سامنے بیٹھ کر بناؤ سنگھار کرنے لگی۔
"ڈنر کھلی فضا میں کھائیں گے، سینٹرل پارک میں، " لوئس نے کہا۔ "سنا ہے جگہ خوب صورت ہے، اور کھانا بھی اچھا ملتا ہے۔ کیا خیال ہے؟"
میں مسکرا دی۔ "اگر واقعی جلد فرار ہو سکیں تو بہت اچھا ہو۔"
لوئس نے تذبذب کے ساتھ میری طرف دیکھا۔ "میری دلی خواہش ہے کہ مری تمھیں پسند آجائے۔"
"وہ کیوں؟"
"کیوں کہ ہم نے کچھ منصوبے بنا رکھے ہیں!" لوئس نے زندہ دلی سے کہا۔ "لیکن شرط یہی ہے کہ وہ تمھیں پسند آجائے، ورنہ بات نہیں بننے کی۔"
میں نے سوالیہ نظروں سے لوئس کی طرف دیکھا۔
"بوسٹن کے قریب ایک چھوٹے سے قصبے میں اُس کا مکان ہے، " لوئس نے بتایا۔ "اس نے ہمیں دعوت دی ہے کہ جب تک جی چاہے ہم وہاں رہ سکتے ہیں۔ شکاگو جانے سے یہ ہزار درجے بہتر رہے گا۔ شکاگو میں یہاں سے کہیں زیادہ شدید گرمی ہو گی۔"
مجھے اپنے شکم میں ایک بار پھر ایک وسیع خالی پن کا احساس ہوا۔ "وہ خود بھی وہاں رہتا ہے؟"
"ہاں۔ اپنی بیوی اور دو بچّوں کے ساتھ۔ لیکن گھبراؤ مت، " لوئس نے کسی قدر طنزیہ لہجے میں اضافہ کیا: "ہمارا الگ کمرہ ہو گا۔"
"لیکن لوئس، میں یہ آخری مہینا دوسروں کے ساتھ نہیں گزارنا چاہتی، " میں نے کہا۔ "مجھے یہ زیادہ پسند ہے کہ صرف تمھارے ساتھ شکاگو میں رہوں، چاہے وہاں جہنمی گرمی کیوں نہ پڑ رہی ہو۔"
"اگر ہمیں ایک دوسرے سے محبّت ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ چوبیس گھنٹے ایک دوسرے سے چپکے رہیں!" لوئس رُکھائی سے بولا۔
میرے جواب دینے سے پہلے ہی وہ غسل خانے میں جا کر دروازہ بند کر چکا تھا۔
ان باتوں کا کیا مطلب ہے؟ میں سوچنے لگی۔ کیا اس کا دل مجھ سے واقعی اُوب گیا ہے؟ میں نے جالی کے کام کا بلاؤز، میکسیکو سے خریدا گیا سرسراتا ہوا اسکرٹ، اور سنہری

سینڈل پہنے۔ اس کے بعد میں کمرے کے بیچ میں کھڑی ہو گئی، بالکل گُم سُم۔ وہ اُکتا گیا ہے، یا کیا؟ میں نے کنجیوں کو، بٹوے اور کیمل مارکہ سگریٹ کے پیکٹ کو، جو اُس نے ڈریسر پر ڈال دیے تھے، چھوا۔ یہ کیا بات ہے کہ لوئس سے اتنی زیادہ محبّت کرنے کے باوجود میں اس سے متعلّق باتوں کو اس قدر کم سمجھتی ہوں؟ بکھرے ہوئے کاغذوں میں میری توجّہ ایک خط پر مرکوز ہو گئی جو اُس کے پبلشر کے سرنامے کے کاغذ پر لکھا ہوا تھا۔ میں نے اسے کھولا۔ "ڈیر لوئس بروگن، چوں کہ آپ فوری طور پر نیویارک آنے کو ترجیح دیتے ہیں، ہم تمام ضروری انتظامات موزوں طریقے پر کر دیں گے۔ جب آپ جمعرات کو تشریف لائیں۔۔۔" میں نے باقی خط گویا دُھند میں سے پڑھا؛ باقی خط سے مجھے کوئی دلچسپی بھی نہیں تھی۔ "۔۔۔ آپ فوری طور پر نیویارک آنے کو ترجیح دیتے ہیں، آپ ترجیح دیتے ہیں، آپ۔۔۔" جس رات پولا نے ضیافت کا اہتمام کیا تھا، فرش مجھے اپنے پیروں کے نیچے ڈولتا محسوس ہوا تھا۔ لیکن اِس وقت میری حالت اُس سے بدتر تھی۔ لوئس باولا نہیں تھا؛ چناں چہ میں ہی باولی تھی۔ میں ایک کرسی میں جا گری۔ یہ خط اُس نے چی چی کاستینانگو والی اُس رات کے صرف ہفتے بھر بعد لکھا تھا، وہ رات جب اُس نے کہا تھا: "مجھے تم سے محبّت ہے، میری ننھی سی باولی گلواز!" مجھے ہر بات یاد تھی: آگ کی لپٹیں، قالین، اُس کی پُرانی باتھ روب، کھڑکی سے ٹکراتی ہوئی بارش۔ اور اُس نے کہا تھا: "مجھے تم سے محبّت ہے۔" یہ ہمارے میکسیکو پہنچنے سے ایک ہفتے پہلے کی بات ہے، اور اس ہفتے کے دوران کوئی ایسی ویسی بات نہیں ہوئی تھی۔ تو پھر کیوں؟ اس نے ہمارے مشترکہ سفر کی میعاد گھٹا دینے کا فیصلہ کیوں کیا تھا؟ اس نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا تھا؟ کیوں؟

"ارے بھئی، بس بہت ہو لیا۔ یہ کیا منھ بنائے بیٹھی ہو؟" لوئس نے غسل خانے سے نکلتے ہوئے کہا۔

اس کی دانست میں میں مری کی دعوت کے سبب روٹھی ہوئی تھی؛ میں نے اس کی غلط فہمی دور نہیں کی۔ مجھ میں ایک لفظ بھی منھ سے نکالنے کی سکت نہیں رہی تھی۔ ٹیکسی میں پورا وقت ہم دونوں دانت بھینچے بیٹھے رہے۔

سینٹرل پارک کے ریستوراں میں خنکی تھی۔ یا نہ بھی رہی ہو تو سبزے اور پیڑوں، بُوٹے دار میزپوشوں، برف کے ڈلوں سے بھری چھوٹی بالٹیوں، اور عورتوں کے برہنہ شانوں نے کم از کم خنکی کا تاثر ضرور پیدا کر دیا تھا۔ میں نے اوپر تلے مارٹینی کے دو جام

چڑھائے، اور ان کی بدولت، جب مری آیا تو چند شائستہ جملے ادا کرنے کے قابل ہو سکی۔ اگر مری سے میری ملاقات اُس دور میں ہوئی ہوتی جب میں بے ارادہ دوستیوں سے لطف اندوز ہوا کرتی تھی، تو میں یقیناً خوش ہوتی۔ اس کی ہر چیز مدوّر تھی: اس کا سر، اس کا چہرہ، اس کا جسم؛ شاید یہی وجہ تھی کہ اُسے دیکھتے ہی آدمی کا جی اس سے کسی ترنے پیپے (buoy) کی طرح چمٹ جانے کو چاہتا تھا۔ اور پھر اُس کی آواز: کیسی خوش گوار آواز تھی! اسے سن کر مجھے اندازہ ہوا کہ لوئس کی آواز کتنی سرد ہو چکی ہے۔ اس نے مجھ سے رابرٹ کی کتابوں کی باتیں کی، اور ہنری کی کتابوں کی؛ لگتا تھا اُسے ہر چیز کے بارے میں علم ہے۔ اس سے بات کرنا بہت سہل تھا۔ لیکن "--- آپ فوری طور پر نیویارک آنے کو ترجیح دیتے ہیں، آپ نیویارک آنے کو ترجیح دیتے ہیں---" کسی ٹیپ کے مصرعے کی طرح مسلسل میرے دماغ پر ہتھوڑے برسائے جا رہا تھا۔ مگر یہ ایک ڈراونا خواب تھا جو میری شمولیت کے بغیر جاری رہا، جبکہ اس دوران میں نے جھینگا مچھلی کی کاک ٹیل کھائی اور ہلکے زرد رنگ کی شراب پی۔ مری نے مجھ سے پوچھا کہ فرانسیسیوں کا مارشل پلان کے بارے میں کیا خیال ہے، اور پھر سوویت یونین کے ممکنہ ردعمل کے موضوع پر لوئس سے بحث کرنے لگا۔ محسوس ہوتا تھا کہ لوئس کے مقابلے میں اُسے سیاست کی بہتر سمجھ بوجھ تھی۔ مجموعی طور پر وہ زیادہ منظّم دماغ کا آدمی تھا اور اس کا دائرۂ علم زیادہ وسیع تھا۔ لوئس یہ جان کر نہایت خوش ہو رہا تھا کہ اُس کے خیالات کی تائید ایک ایسا شخص کر رہا ہے جو بطور احسن ان کی مدافعت کی بھی صلاحیت رکھتا ہے۔ بے شک، کئی اعتبار سے لوئس کو دینے کے لیے مری کے پاس مجھ سے مقابلتاً بہت زیادہ تھا۔ میں لوئس کی اُس کو دوست بنانے کی خواہش کو سمجھ سکتی تھی؛ حتیٰ کہ میں لوئس کی مری کے گھر پورا مہینا گزارنے کی خواہش کو بھی سمجھ سکتی تھی۔ تاہم اس سے میکسیکو والی دروغ گوئی کی تشریح نہیں ہوتی تھی: اس اہم نکتے کی وضاحت نہیں ہو پاتی تھی۔

"تم لوگوں کو کہیں جانا ہو تو چلو، چھوڑ آتا ہوں،" مری نے پارکنگ لاٹ کی سمت میں جاتے ہوئے کہا۔

"نہیں شکریہ،" میں جھٹ سے بولی۔ "میرا جی پیدل چلنے کو چاہ رہا ہے۔"

"اگر تمھیں پیدل چلنے سے رغبت ہے تو تمھیں راک پورٹ ضرور آنا چاہیے،" مری نے کشادہ مسکراہٹ کے ساتھ مجھ سے کہا۔ "چہل قدمی کے واسطے وہ بے حد حسین علاقہ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جگہ تمھیں پسند آئے گی۔ اور تم دونوں کو وہاں مہمان رکھ کر مجھے بڑی

فرحت محسوس ہو گی۔"

"یہ تو بڑی اچھی بات ہے!" میں نے گرم جوشی سے کہا۔

"اگلے پیر کے بعد جس دن چاہو آجانا،" مری نے کہا۔ "اور پہلے سے اطلاع دینے کے جھنجھٹ کی بھی ضرورت نہیں۔"

وہ اپنی کار میں جا بیٹھا اور ہم پیدل پارک میں چلنے لگے۔

"میرا خیال ہے مری پوری شام ہمارے ساتھ گزارنا چاہتا تھا،" لوئس نے کہا: اس کا انداز قدرے ملامتی تھا۔

"ممکن ہے وہ یہی چاہتا ہو،" میں نے کہا۔ "لیکن میں نہیں چاہتی تھی۔"

"لیکن باتیں تو تم دونوں خوب گھُل مل کر کر رہے تھے،" لوئس نے کہا۔

"میرے خیال میں وہ بڑا نفیس آدمی ہے،" میں نے کہا۔ "لیکن میں ایک چیز کے بارے میں تم سے بات کرنا چاہتی ہوں۔"

لوئس کے چہرے پر تاریکی اُمڈ آئی۔ "اب یہ ایسی اہم تو کیا ہو گی!"

"بالکل ہے،" میں نے سبزے کے وسط میں ایک سپاٹ سی چٹان کی طرف اشارہ کیا۔ "چلو وہاں بیٹھتے ہیں۔"

سُرمئی رنگت کی گلہریاں زمین پر ہر طرف پُھدکتی پھر رہی تھیں۔ دور فاصلے میں بلند و بالا عمارتیں جگمگا رہی تھیں۔ میں نے بے کم و کاست لہجے میں کہا: "تھوڑی دیر پہلے جب تم نہانے گئے تھے تو ڈریسر پر کچھ خطوط پڑے چھوڑ گئے تھے۔" میں نے لوئس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ "تمہارے پبلشر نے اس وقت تمہارے نیویارک میں ہونے پر اصرار نہیں کیا تھا۔ یہ تجویز خود تم نے پیش کی تھی۔ تو پھر مجھے اس کا اُلٹ کیوں بتایا تھا؟"

"اوہ! تو تم پیٹھ پیچھے میرے خط پڑھتی ہو!" لوئس برہمی سے بولا۔

"کیوں نہیں؟ تم مجھ سے جھوٹ جو بولتے ہو۔"

"میں تم سے جھوٹ بولتا ہوں، اور تم میرے نجی کاغذات ٹٹولتی پھرتی ہو۔۔ حساب برابر،" لوئس نے غصے میں کہا۔

اچانک میری طاقت جواب دے گئی اور میں حیرت زدہ سی ہو کر اُسے تکنے لگی۔ یہ وہ ہے۔ یہ میں ہوں۔ آخر ہماری یہ گت کیسے بن گئی؟

"لوئس، میری تو سمجھ میں اب کچھ نہیں آتا۔ تمہیں مجھ سے محبت ہے۔ مجھے تم سے

محبت ہے۔ پھر ہمیں کیا ہوتا جا رہا ہے؟" میں نے حواس باختہ ہو کر پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں،" لوئس نے جواب دیا۔

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ مجھے بتاؤ، ہم میکسیکو میں خوش نہیں تھے؟ تو پھر کس بات نے تمھیں نیویارک آنے پر مجبور کیا؟ تمھیں خوب پتا تھا کہ یہاں آ کر ہمیں ایک دوسرے کو دیکھنے تک کا وقت مشکل سے ملے گا۔"

"انڈین لوگ اور کھنڈر، کھنڈر اور انڈین لوگ، میں ان سے عاجز آتا جا رہا تھا،" لوئس نے کہا۔ اس نے شانے اُچکائے۔ "میرا دل منظر کی تبدیلی کو چاہنے لگا تھا۔ یہ کوئی ایسی المناک بات تو ہے نہیں، یا ہے؟"

یہ کوئی جواب نہیں تھا، تاہم میں نے وقتی طور پر اس سے مطمئن ہو جانے کا فیصلہ کیا۔ "مجھ سے صاف صاف کیوں نہیں کہہ دیا کہ میکسیکو سے تمھاری طبیعت بھر گئی ہے؟ اتنے داؤ پیچ لڑانے کی کیا ضرورت تھی؟"

"اس لیے کہ تم مجھے یہاں آنے نہ دیتیں؛ تم مجھے وہیں رہنے پر مجبور کرتیں،" لوئس نے جواب دیا۔

میں یوں دہل کر رہ گئی جیسے اُس نے تھپڑ مار دیا ہو۔ اس کی آواز میں کیسی شدید خفگی تھی!

"تمھارا واقعی یہی خیال ہے؟"

"بالکل،" لوئس بولا۔

"لیکن لوئس، ذرا دیکھو تو سہی، میں نے کب تمھیں اپنی مرضی کے مطابق کرنے سے روکا ہے؟ ٹھیک ہے، تم ہمیشہ میری دلجوئی کی کوشش کرتے رہے ہو، لیکن لگتا تھا کہ تمھیں خود بھی اس میں لطف آ رہا ہے۔ مجھے بھولے سے بھی یہ محسوس نہیں ہوا کہ تم پر کوئی زیادتی کر رہی ہوں۔"

میں نے تصوّر میں ہم دونوں کے مشترکہ ماضی کا جائزہ لیا۔ ہر چیز محبّت تھی، سمجھ بوجھ تھی، اور دوسرے کو خوشی پہنچانے کی خوشی۔ یہ خیال تک تکلیف دہ تھا کہ لوئس کی توجّہ اور لحاظ کے عقب میں خفگی دھواں دے رہی تھی۔

"تمھیں اندازہ نہیں کہ تم کتنی ہٹ دھرم ہو،" لوئس نے کہا۔ "تم بیٹھی بیٹھی چیزوں کو ایک خاص انداز سے اپنے دماغ میں ترتیب دیتی رہتی ہو، اور اس سے ذرا بھی

انحراف کے لیے تیار نہیں ہوتیں۔ لازم ہے کہ ہر شخص ٹھیک وہی کرے جو تم چاہتی ہو۔"

"لیکن میں نے ایسا کب کیا ہے؟ مثال تو دو،" میں نے کہا۔

لوئس ہچکچایا۔ "میں یہ مہینا مری خاندان کے گھر پر گزارنا چاہتا ہوں اور تم اس سے انکار کر رہی ہو۔"

میں نے اُسے ٹوکا۔ "تمھیں پتا ہے کہ تم انصاف سے کام نہیں لے رہے ہو۔ میکسیکو سے پہلے میں کب ایسی تھی؟"

"اگر میں نے تمھیں مجبور کرنے کا نسخہ دریافت نہ کر لیا ہوتا تو خوب پتا ہے کہ ہم ابھی تک وہیں میکسیکو میں پڑے ہوتے۔ تمھارے پروگرام کے مطابق ہمیں وہاں ایک مہینا اور گزارنا تھا۔ اور تم مجھے قائل کر لیتیں کہ ایسا کرنا ناگزیر ہے۔"

"پہلی بات تو یہ کہ یہی ہمارا پروگرام تھا،" میں نے کہا۔ تھوڑا سا غور کیا اور پھر بولی: "میرا خیال ہے میں تھوڑی بہت حجت ضرور کرتی، لیکن چوں کہ تم نیویارک آنے کے شیدائی تھے، میں نے آخر میں یقیناً سپر ڈال دی ہوتی۔"

"بس، سب زبانی جمع خرچ ہے،" لوئس نے پھبتی کسی۔ اس نے اشارے سے مجھے مزید کچھ کہنے سے روک دیا۔ "بہر کیف، تمھیں قائل کرنے کے لیے بہت پاپڑ بیلنے پڑتے۔ وقت بچانے کی خاطر میں نے ذرا سا جھوٹ بول دیا۔ یہ ایسی بات تو نہیں کہ آسمان ٹوٹ پڑے، یا ہے؟"

"میرے خیال میں تو ہے،" میں نے جواباً کہا۔ "میں تو ہمیشہ یہی سوچتی رہی ہوں کہ تم نے مجھ سے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔"

لوئس میری طرف خفیف سی شرمندگی سے دیکھتے ہوئے مسکرایا۔ "حقیقت میں یہ پہلی بار ہے۔ لیکن اس سے اتنا شدید اثر لے کر تم اچھا نہیں کر رہیں۔ آدمی چاہے جھوٹ بولے یا نہ بولے، سچ بہرحال کبھی نہیں بولا جاتا۔"

لمحے بھر کے لیے میں نے بڑے غور سے اُسے دیکھا۔ میں چکرا گئی۔ صاف ظاہر تھا کہ اُس کا دماغ عجیب عجیب خیالات کی آماج گاہ بنا ہوا ہے، اور کوئی بات ہے جس نے اسے سخت مضطرب کر رکھا ہے۔ لیکن وہ کیا بات تھی؟ میں نے اپنا سر ہلایا۔ "میں اس پر یقین نہیں رکھتی،" میں نے کہا۔ "لوگ ایک دوسرے سے کہہ سن سکتے ہیں، ایک دوسرے سے واقف ہو سکتے ہیں۔ بس تھوڑی سی خیر خواہی ہی تو چاہیے۔"

"ہاں، مجھے پتا ہے کہ تمھارا عقیدہ یہی ہے،" لوئس نے کہا۔ "لیکن یہی بد ترین جھوٹ ہے، یہ تاثر دینا کہ لوگ ایک دوسرے سے سچ بولتے ہیں۔" وہ کھڑا ہو گیا۔ "خیر، اس نکتے پر میں نے اپنے خیالات کا اظہار کر دیا ہے۔ اس پر اضافہ نہیں کر سکتا۔ یہ بتاؤ، اب یہاں سے اُٹھ سکتے ہیں؟"

"ہاں،" میں نے کہا۔

ہم نے پارک کو خاموشی سے پار کیا۔ اس کی وضاحت سے کوئی بات صاف نہیں ہو سکی تھی۔ ذرّہ برابر بھی نہیں۔ صرف ایک بات بالکل واضح تھی: لوئس کی عداوت۔ لیکن یہ آئی کہاں سے؟ اُس میں اتنا بَیر تھا کہ وہ ہر گز نہ بتاتا؛ اس سے پوچھنا بے سود تھا۔

"ہم کہاں چل رہے ہیں؟" لوئس نے پوچھا۔

"جہاں بھی تم چاہو۔"

"مجھے تو کچھ نہیں سُوجھ رہا۔"

"مجھے بھی نہیں۔"

"لیکن آج شام کا پروگرام تو بہ ظاہر تمھیں نے بنایا تھا،" لوئس نے کہا۔

"کوئی خاص پروگرام نہیں تھا،" میں نے جواب دیا۔ "سوچا تھا کسی خاموش، چھوٹی سی بار میں چل کر بیٹھیں گے اور صرف باتیں کریں گے۔"

"آدمی بس یوں ہی باتیں نہیں کرنے لگتا، میرا مطلب ہے صرف حکم دینے سے،" اس نے چڑچڑاہٹ کے ساتھ کہا۔

"چلو، کیفے سوسائٹی میں چل کر تھوڑا سا جاز سنتے ہیں،" میں نے کہا۔

"کیا جاز سے تمھارا پیٹ نہیں بھرا؟"

غصّے سے میرا چہرہ تمتما گیا۔ "خوب۔ تو پھر ہوٹل چل کر سو رہتے ہیں،" میں نے کہا۔

"مجھے نیند نہیں آرہی،" لوئس معصومیت سے بولا۔

وہ میرے ساتھ چھیڑ خانی کر رہا تھا، لیکن ازراہِ تفنّن نہیں بلکہ دانستہ، آج کی شام غارت کرنے کے لیے۔ یہ جان بوجھ کر ہر چیز کا ستیاناس کرنے کے لیے ایسا کر رہا ہے، میں نے تلخی سے سوچا۔

"اچھا، تو کیفے سوسائٹی چلتے ہیں،" میں نے تیزی سے کہا۔ "کیوں کہ میرا کہیں جانے

کو جی چاہ رہا ہے اور تمہارا کچھ نہ کرنے کو۔"

ہم نے ٹیکسی لی۔ مجھے ایک سال پہلے لوئس کی کہی ہوئی بات یاد آئی: یہ کہ جس مٹی سے اُس کا خمیر اٹھا ہے اس میں کسی سے نباہ کرنے کی صلاحیت نہیں۔ سو یہ بات درست ثابت ہو رہی تھی۔ اگر ٹیڈی، فیلٹن، مری کے ساتھ اس کے تعلقات اچھے تھے تو محض اس لیے کہ ان سے ملاقات کبھی کبھار ہوتی تھی۔ مگر وہ کسی کے ساتھ زیادہ دیر تک رہنا برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے مجھ سے بڑی تُند و تیز محبّت کی تھی، اور اس وقت اسے یہ محبت راستے کی رکاوٹ لگ رہی تھی۔ غصّے کے احساس سے میرا حلق ایک بار پھر جکڑ کر رہ گیا۔ لیکن اس میں ایک گونہ طمانیت بھی محسوس ہوئی۔ جو اُفتاد اس پر پڑ رہی ہے، اس کی پیش بینی اسے ضرور کر لینی چاہیے تھی، میں نے سوچا۔ اسے چاہیے تھا کہ مجھے اس معاشقے میں دل و جان سے مبتلا ہونے سے باز رکھتا۔ اور جو طرزِ عمل وہ اختیار کیے ہوئے ہے اس کا اسے کوئی حق نہیں پہنچتا۔ اگر میں اس کے لیے بوجھ ہوں تو کہہ کیوں نہیں دیتا؟ میں پیرس واپس جا سکتی ہوں۔ میں اسی وقت واپس جانے کو تیار ہوں۔

آرکسٹرا ڈیوک ایلنگٹن کی جاز موسیقی کا کوئی نغمہ بجا رہا تھا۔ ہم نے دو عدد بائی بالز کا آرڈر دیا۔ لوئس نے کسی قدر تردّد کے ساتھ مجھے دیکھا۔

"ناخوش ہو؟"

"نہیں،" میں نے جواب دیا۔ "میں ناخوش نہیں۔ میں غصّے میں ہوں۔"

"غصّے میں؟ اس میں کلام نہیں کہ غصّے میں ہونے کا تمہارا بڑا پُرسکون انداز ہے۔"

"اس سے دھوکے میں نہ آجانا۔"

"کیا سوچ رہی ہو؟"

"میں سوچ رہی ہوں کہ اگر یہ تعلق تم پر بار ہے تو بس کہہ دو۔ میں کل پیرس کا جہاز پکڑ سکتی ہوں۔"

لوئس ذرا سا مسکرایا۔ "جو بات تم کہہ رہی ہو، بڑی سنگین بات ہے۔"

"تمہارے طرزِ عمل سے ایسا لگتا ہے جیسے ہمارا ایک مرتبہ بھی ساتھ باہر نکلنا تمہارے لیے بالکل ناقابلِ برداشت ہے،" میں نے کہا۔ "" تمہارے طرزِ عمل کا اصل راز یہ ہے کہ تمہاری طبیعت مجھ سے بھر گئی ہے۔ تو اس صورت میں بہتر یہی ہے کہ میں اپنی راہ لوں۔"

لوئس نے نفی میں سر ہلایا۔ "میری طبیعت تم سے بھری نہیں ہے،" اس نے

گمبھیرتا سے کہا۔

میرا غصہ جس تیزی سے آیا تھا اُسی تیزی سے رخصت ہو گیا، اور میں خود کو ایک بار پھر کم زور محسوس کرنے لگی۔ "تو پھر کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا۔ "کچھ نہ کچھ تو ضرور ہے۔ کیا ہے؟"

کچھ دیر خاموشی رہی، جس کے بعد لوئس نے کہا: "یوں سمجھ لو کہ کبھی کبھار تم مجھے تھوڑا سا برہم کر دیتی ہو۔"

"خیر یہ تو ظاہر ہے،" میں نے کہا۔ "لیکن میں اصل وجہ جاننا چاہتی ہوں۔"

"ایک بار مجھ سے وضاحت کرتے ہوئے تم نے کہا تھا کہ تمھارے لیے محبّت ہی سب کچھ نہیں ہے،" لوئس نے یوں کہا جیسے یک بارگی اس پر روانی کا دورہ پڑ گیا ہو۔ "چلو مان لیا۔ لیکن پھر یہ اصرار کیوں ہے کہ میرے لیے محبّت سب کچھ ہو؟ اگر میرا جی چاہتا ہے کہ نیویارک جاؤں، دوستوں سے ملوں ملاؤں، تو اس سے تمھیں غصہ آ جاتا ہے۔ تمھاری اُس وقت تک تشفی نہیں ہوتی جب تک ہر جستجو کا مرکز نہ بن جاؤ، جب میرے لیے تمھارے سوا کسی چیز کا وجود نہ رہے، جب تک میں اپنی پوری زندگی تمھارے لیے وقف نہ کر دوں، حالاں کہ تم اپنی زندگی کا کچھ بھی قربان کرنے کو تیار نہیں ہو۔ یہ کہاں کا انصاف ہے؟"

میں خاموش رہی۔ اُس کی ملامتوں میں بہت کچھ غلط بیانی تھی، اور اتنی ہی بے ربطی بھی۔ لیکن مسئلہ یہ نہیں تھا۔ اُس شام پہلی بار مجھے روشنی کی کرن نظر آئی؛ اور یہ ذرا بھی تسلّی بخش نہیں تھی۔

"تم غلطی پر ہو،" میں بڑبڑائی۔ "مجھے کسی بات پر اصرار نہیں۔"

"صحیح فرمایا! تمھارا یہ ہے کہ جب جی چاہا آ گئیں، جب جی چاہا چلتی بنیں۔ لیکن جب تک یہاں رہو، میرے فرائضِ منصبی میں داخل ہے کہ تمھیں مکمل طور پر خوش رکھوں۔"

"انصاف سے کام تو تم خود نہیں لے رہے،" میں نے کہا۔ میری آواز حلق میں گھُٹ کر رہ گئی۔ اچانک ساری بات میرے سامنے بالکل واضح ہو گئی: لوئس اس بات پر میری گرفت کر رہا تھا کہ میں نے اس کے ساتھ مستقل رہنے سے انکار کر دیا تھا۔ نیویارک کا سفر، مری کے گھر رہنے کا منصوبہ، یہ سب محض انتقامی کارروائی تھی!

"تم مجھ سے بیر کر رہے ہو،" میں نے کہا۔ "لیکن کیوں؟ تمھیں پتا ہے کہ میں بے قصور ہوں۔"

"میں تم سے کوئی بیر وَیر نہیں کر رہا۔ بس اتنا کہوں گا کہ جتنا دستی ہو اُس سے زیادہ نہ مانگا کرو۔"

"تم واقعی مجھ سے بیر کر رہے ہو!" میں نے دہرایا۔ میں نے مایوسی سے لوئس کی طرف دیکھا۔ "اس کے باوجود، اُس رات جب چی چی کاستینانگو میں ہم نے ان معاملات پر تفصیلی گفتگو کی تھی تو ہمارا اتفاق ہو گیا تھا: تم میری صورتِ حال سمجھ گئے تھے۔ تو پھر اب کیا ہو گیا ہے؟"

"کچھ نہیں،" لوئس نے جواب دیا۔

"تو پھر؟ تم نے کہا تھا کہ صورت حال مختلف ہوتی تو تم اتنا ٹوٹ کر مجھ سے محبت نہ کرتے۔ تم نے کہا تھا کہ ہم خوش رہیں گے۔۔۔"

لوئس نے شانے اُچکائے۔ "میں نے وہی کہا جو تم مجھ سے سننا چاہتی تھیں۔"

ایک بار پھر ایسا محسوس ہوا جیسے میرے منہ پر بھرپور طمانچہ مارا گیا ہو۔ "اس سے تمہارا مطلب؟" میں ہکلائی۔

"بہت سی دوسری باتیں تھیں جو میں تم سے کرنا چاہتا تھا، لیکن تم فرطِ مسرت سے آنسو بہانے لگی تھیں۔ میری ہمت نہ پڑی۔"

ہاں، مجھے یاد آیا، شعلے بھڑک رہے تھے اور میری آنکھیں آنسوؤں سے تر تھیں۔ یہ سچ ہے کہ میں بہت جلد لوئس کے شانے پر سر رکھ کر خوشی سے رونے لگی تھی: یہ سچ ہے کہ میں نے اُسے مجبور کر دیا تھا۔

"میں اتنی خوف زدہ تھی،" میں نے کہا۔ "مجھے تمہاری محبت کھو بیٹھنے کا دھڑکا لگا ہوا تھا۔"

"مجھے پتا ہے۔ تم دہشت زدہ لگ رہی تھیں۔ اسی وجہ سے میں کچھ کہنے سے باز رہا۔" لوئس نے کہا۔ پھر تلخی کے ساتھ اضافہ کیا: "اور یہ جان کر کہ میں وہی کروں گا جو تم چاہتی ہو، تم نے کیسا اطمینان محسوس کیا تھا۔ تمہارے لیے کسی اَور چیز کی سرے سے کوئی اہمیت ہی نہیں تھی۔"

میں نے اپنا ہونٹ کاٹا: اس بار، چاہے جو بھی قیمت ادا کرنی پڑے، مجھے خود کو رونے سے باز رکھنا ہو گا۔ مگر جو کچھ مجھ پر گزر رہا تھا، بہت ہولناک تھا۔ شعلے، قالین، کھڑکیوں پر سر مارتی ہوئی بارش، لوئس اپنی باتھ روب میں ملبوس۔۔ یہ سب یادیں جھوٹ تھیں۔ میں

نے خود کو اس کے کندھے پر سر رکھ کر روتے ہوئے دیکھا؛ ہمارا سنجوگ ہمیشہ کے لیے تھا، لیکن اس میں صرف میں ہی شریک تھی۔ وہ ٹھیک ہی تو کہہ رہا تھا: مجھے یہ جاننے کی کوشش کرنی چاہیے تھی کہ اُس کے دماغ میں کیا اُدھیڑبُن ہو رہی ہے، نہ کہ اس کے لفظوں کو سن کر مطمئن ہو بیٹھنا چاہیے تھا جو میں اس سے جبراً کہلوا رہی تھی۔ میں بزدل تھی -- خودغرض اور بزدل -- اور مجھے اس کی مناسب سزا بھی مل رہی تھی۔ میں نے اپنی ساری ہمّت کو مجتمع کیا؛ اب میرے لیے فرار کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی۔

"اگر میں نہ روئی ہوتی تو کیا کہتے؟" میں نے پوچھا۔

"میں کہتا کہ جو مکمل طور پر اپنا نہ ہو اس کے ساتھ بالکل ویسی محبت نہیں کی جا سکتی جیسی اُس کے ساتھ کی جا سکتی ہے جو مکمل طور پر اپنا ہو۔"

میں نے اپنا دل کڑا کر لیا اور جوابی حملہ کیا۔ "تم نے اس کے بالکل اُلٹ بات کہی تھی۔ تم نے کہا تھا کہ اگر میں اس سے مختلف ہوتی تو تم مجھ سے اتنی شدید محبّت نہ کرتے۔"

"اس میں کوئی تضاد نہیں،" لوئس بولا۔ "اور اگر ہے تو اس لیے کہ جذبات متضاد ہو سکتے ہیں۔"

مزید بحث بے کار تھی؛ یہاں منطق کا دور دور تک گزر نہ تھا۔ شروع شروع میں ہو سکتا ہے لوئس کے جذبات گڈمڈ رہے ہوں، اور غور و فکر کرنے کی مہلت پانے کی غرض سے اس نے ایسی باتیں کی ہوں جن سے میری تشفّی ہو سکے۔ یا ہو سکتا ہے وہ بعد میں مجھ سے بَیر کرنے لگا ہو۔ خیر، یہ سب بے اہمیت تھا۔ آج، بہرحال، اُسے مجھ سے وہ محبّت نہیں رہی تھی جو پہلے تھی؛ اس حقیقت سے میں کس طرح سمجھوتا کر سکتی تھی؟ مایوسی میرا دَم گھونٹے دے رہی تھی۔ خود کو سوچنے سے باز رکھنے کی خاطر میں نے کلام جاری رکھا۔

"تمھیں مجھ سے پہلی سی محبت نہیں رہی؟"

لوئس ہچکچایا۔ "محبت، جتنا کہ میرا عقیدہ تھا، اس سے کم اہمیت رکھتی ہے۔"

"سمجھی،" میں نے کہا۔ "چوں کہ مجھے لوٹ جانا ہی ہے، میرے یہاں ہونے یا نہ ہونے سے کچھ ایسا فرق نہیں پڑتا۔"

"بس کچھ یوں ہی سمجھ لو،" لوئس نے جواب دیا۔ اس نے میری طرف دیکھا، اور یک لخت اس کی آواز بدل گئی۔ "اس کے باوجود، میں نے کس بے چینی سے تمھارا انتظار کیا تھا!" وہ جذبے میں ڈوبی ہوئی آواز میں بولا۔ "سارا سال میں نے کسی اَور چیز کے بارے میں

سوچا تک نہیں۔ میں کس بُری طرح تمہاری خواہش کرتا رہا!"

"ہاں،" میں نے افسردگی سے کہا۔ "اور اب۔۔۔"

لوئس نے اپنا بازو میرے کندھوں کے گرد ڈال دیا۔ "اور اب بھی مجھے تمہاری خواہش ہے۔"

"اوہ، اچھا اس طرح،" میں نے کہا۔

"صرف اس طرح ہی نہیں،" اس کے ہاتھ کی گرفت میرے بازو پر سخت ہو گئی۔ "میں اِسی لمحے تم سے شادی کر سکتا ہوں۔"

میں نے سر جُھکا لیا۔ مجھے یاد آیا کہ شہابِ ثاقب جھیل کے اوپر تھا؛ اور اس نے کوئی تمنا کی تھی، لیکن وہ پوری نہیں ہوئی تھی۔ اور میں، جس نے اپنے سے یہ وعدہ لیا تھا کہ اُسے کبھی مایوس نہ کروں گی، اسے ناقابلِ تلافی طور پر مایوس کر چکی تھی۔ صرف میں ہی قصوروار تھی۔ اب میں کبھی اس کے سر کسی چیز کا الزام نہیں رکھ سکوں گی۔

ہم نے بولنا بند کر دیا، تھوڑا سا جاز سنا اور پھر ہوٹل لوٹ آئے۔ مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ میں نے اُداسی کے ساتھ اپنے سے پوچھا کہ کیا میں ہم دونوں کی محبّت کو تباہ ہونے سے محفوظ رکھ سکوں گی۔ یہ محبت اب بھی غیر حاضری، انتظار، غرض ہر چیز پر غالب آ سکتی تھی، بشرطے کہ ہم دونوں یہی چاہتے ہوں۔ کیا لوئس بھی یہ چاہتا ہو گا؟ "وہ ابھی شش و پنج میں ہے،" میں نے خود سے کہا۔ "وہ خود کو پچھتاوے، دُکھ اور اداسی سے محفوظ رکھنے کا تہیہ کیے بیٹھا ہے، لیکن وہ جو ایک بوسیدہ ہاتھ روب سے چھٹکارا پانے کے خیال تک سے نفرت کرتا ہو، اتنی آسانی کے ساتھ ہمارے ماضی سے کیسے پیچھا چھڑا لے گا؟ وہ خود پسند ہونے سے کہیں زیادہ فیاض ہے۔" میں سوچتی چلی گئی، اپنی ہمّت افزائی کی کوشش میں، "محتاط سے زیادہ مشتاق؛ وہ چاہتا ہے کہ واقعات اُسے پیش آئیں۔" لیکن اس کے ساتھ ساتھ، میں یہ بھی خوب جانتی تھی کہ وہ اپنی ناموسیت اور خود مختاری کی کتنی زیادہ قدر کرتا ہے، اور کس حد تک اعتدال پسند اور معقول زندگی گزارنے کے ارادے پر قائم ہے۔ سمندر پار کسی سے محبّت کرنا غیر معقول نظر آ سکتا ہے۔ ہاں، لوئس کے بارے میں بس اِسی چیز سے مجھے سب سے زیادہ خوف آتا تھا۔۔ محتاط رہنے کا یہ خبط جو گاہے گاہے اس پر غالب آ جاتا ہے۔ مجھے اِسی کے خلاف برسرِ پیکار ہونا پڑے گا۔ مجھے لوئس کو یہ ثابت کر کے دکھانا ہو گا کہ اس معاشقے میں اُسے خسارہ کم اور فائدہ زیادہ حاصل ہونے والا ہے۔ ناشتا کرتے وقت میں نے اپنا وار کیا۔

"لوئس، میں رات بھر ہم دونوں کے بارے میں سوچتی رہی۔"

"کچھ سوئی ہوتیں تو اچھا تھا۔"

اس کا لہجہ دوستانہ تھا؛ وہ ستایا ہوا نظر آ رہا تھا۔ بے شک، اُن باتوں کو کہہ کر جو اس پر بوجھ بنی ہوئی تھیں، وہ خود کو پُرسکون محسوس کر رہا تھا۔

"کل تم کہہ رہے تھے کہ تمھیں میری یہ بات تنگ کرتی ہے کہ میں جتنا دیتی ہوں اس سے زیادہ کا مطالبہ کرتی ہوں،" میں نے کہا۔ "یہ واقعی ناروا ہے؛ میں اب ایسا نہیں کروں گی۔ تم جو دوگے لے لوں گی اور کبھی کوئی مطالبہ نہیں کروں گی۔"

لوئس نے میری بات کاٹنی چاہی لیکن میں بولتی رہی۔ پہلی بات، یہ طے ہو ہی چکا تھا کہ ہم مری کے ہاں جائیں گے۔ دوسرے یہ کہ میں یہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ مجھ سے وفادار رہنے کی پابندی محسوس کرے جو اس نے ابھی تک اپنے پر عائد کر رکھی تھیں۔ اسے چاہیے کہ میری عدم موجودگی میں اپنے کو مکمل طور پر آزاد محسوس کرے، جیسے میرا سرے سے وجود ہی نہ ہو۔ اور اگر وہ کبھی کبھار کسی دوسری عورت سے محبت کرے تو یہ میری قسمت؛ میں احتجاج نہیں کروں گی۔ اگر ہمارا تعلق اُسے وہ سب کچھ دینے میں ناکام رہا تھا جس کا وہ متوقع تھا، تو یہ کم از کم اسے کسی چیز سے محروم بھی نہیں رکھے گا۔

"اچھا، اب یہ سوچنا چھوڑ دو کہ میں نے تمھیں پھانسنے کو کوئی دام بچھایا تھا،" میں نے کہا۔ "محض بگاڑنے کی خاطر چیزوں کو مت بگاڑو۔"

لوئس نے بڑی توجہ سے میری بات سنی، سر ہلایا، اور کہا: "اب بات اتنی آسان بھی نہیں۔"

"جانتی ہوں،" میں نے کہا۔ "جوں ہی آدمی کسی سے محبت کرنے لگتا ہے اُس کی آزادی سلب ہو جاتی ہے۔ تاہم، ایسی عورت سے محبت کرنا جو سمجھتی ہو کہ تم پر اس کا حق ہے، اُس عورت سے محبت کرنے کے مساوی بالکل نہیں ہو سکتا جو اس طرح نہ سوچتی ہو۔"

"اوہ، کسی بھی عورت کو اختیار ہے کہ سوچتی پھرے مجھ پر اس کے دنیا جہان کے حق نکلتے ہیں، تو اس سے کیا ہوتا ہے۔ جب تک میں نہیں تسلیم کرتا، ان کی کیا حیثیت؟" لوئس نے کہا۔ پھر یہ اضافہ کیا: "چلو، اس بحث میں نہ پڑیں۔ بحث سے چیزیں اور اُلجھ جاتی ہیں۔"

"اور خاموش رہنے سے بھی،" میں نے کہا۔ پھر میں اس کی طرف جھکی۔ "ایک بات

تم سے پوچھنا چاہتی ہوں: کیا تمھیں افسوس ہے کہ مجھ سے جان پہچان ہو گئی؟"

"نہیں،" اس نے جواباً کہا۔ "اس کا مجھے کبھی افسوس نہیں ہو گا۔"

اس کے لہجے سے میری ہمّت بندھی۔ "ہمیں دوبارہ ملنا نصیب ہو گا، ہو گا نا؟"

وہ مسکرا دیا۔ پھر بولا: "پکّی بات ہے۔"

امّید میرے دل میں لوٹ آئی۔ مجھے اندازہ تھا کہ میری تقریر بازی اُسے نیم قائل ہی کر سکی ہے، اور سچ یہ ہے کہ اس سے آزادی کی بات کرنا اور ساتھ ہی ساتھ یہ درخواست بھی کہ مجھے اپنے دل سے دور نہ کرے، یقیناً ناروا بات تھی۔ "کاش اس نے میرے خلاف غم و غصّے کو راہ دینے کا تہیّہ نہ کر لیا ہو،" میں نے خود سے کہا، "تاکہ میں اس پر ثابت کر سکوں کہ ہماری محبّت شادکام بھی ہو سکتی ہے۔" اس میں شک نہیں کہ میں اس کے دل میں ایک اثر پذیر جذبے کو اُبھارنے میں کامیاب ہو گئی تھی، یا شاید الفاظ کے قالب میں ڈھلتے ہی اس کے سارے گلے شکوے جاتے رہے تھے۔ اُس سہ پہر وہ مجھے کونی آئی لینڈ لے گیا اور اتنا ہی بشاش اور اتنا ہی مہربان نظر آنے لگا جتنا ہماری رفاقت کے خوش گوار ترین ایّام میں۔ اس کے پاس مجھ سے کہنے کے لیے اچانک ہزاروں باتیں نکل آئی تھیں: نیویارک کی ادبی زندگی کے بارے میں، لوگوں کے بارے میں، کتابوں کے بارے میں۔ وہ مسلسل بولتا رہا، جیسے ہم ابھی ابھی دوبارہ ملے ہوں۔ اور اگر ۔۔ اے کاش ۔۔ اس نے یہ کہہ دیا ہوتا کہ "مجھے تم سے محبّت ہے"، تو میں یہ یقین کرنے میں کامیاب ہو جاتی کہ ہر چیز پہلے ہی کی طرح ہے۔

"تمھیں مری کے ہاں جانے پر واقعی کوئی اعتراض نہیں؟" اس نے اگلے پیر کے روز قدرے ہچکچاتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"بالکل نہیں۔ بلکہ میں تو اس کی منتظر ہوں۔"

"خوب۔ تو چلو آج ہی شام کو چلتے ہیں۔"

میں نے اس کی طرف اچنبھے سے دیکھا۔ "میرا خیال تھا ابھی تمھیں یہاں بہت سے کام نمٹانے ہیں؟"

لوئس ہنسنے لگا۔ "تو بھئی، اب انھیں نمٹائے بغیر ہی گزارا کرنا پڑے گا۔"

اگلی صبح ہم مری خاندان کے ساتھ ایک کمرے میں بیٹھے کافی پی رہے تھے جس میں دیوار سے آگے کو نکلی ہوئی کھڑکیاں تھیں۔ مکان شہر سے ذرا باہر، ایک پہاڑی کی لگر پر کسی پرندے کی طرح براجمان تھا۔ آسمان کی نیلاہٹ اور سمندر کا شور کھلی کھڑکیوں سے بہتا ہوا

اندر آ رہا تھا۔ لوئس بے تحاشا باتیں کر رہا تھا اور ساتھ ساتھ مکھن لگے توس بھی کھاتا جا رہا تھا۔ اس کے مسرور چہرے کو دیکھ کر کوئی بھی باور کر سکتا تھا کہ اس کا عزیز ترین خواب پورا ہو گیا ہے۔ یہ اعتراف کرنا ہی پڑے گا کہ ہر چیز درجہ کمال کو پہنچی ہوئی تھی: جگہ، موسم، ناشتا، ہمارے میزبانوں کی مسکراہٹ۔ اس کے باوصف، میں اپنے کو بے چین محسوس کر رہی تھی۔ اپنی نوازش اور کرم کے باوجود ایلن مجھے خائف کیے دے رہی تھی؛ اس کی محتاط نفاست، اس کے گھر کی دل رُبائی، تندرستی سے تمتماتے ہوئے اس کے دو بچّے، یہ سب اس کے شاہد تھے کہ وہ ایک باکمال نوجوان بیاہتا عورت ہے، اور مجھے ہمیشہ ایسی عورتوں سے تھوڑا سا خوف آیا ہے جو اپنے وجود کی تمام جزئیات کی تنظیم اتنے کامیاب طریقے سے کرتی ہوں۔ اس پر طُرفہ یہ کہ میں اس زندگی کے تنگ باف جال میں پھنسنے ہی والی تھی جس سے میرا دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ مجھے محسوس ہوا جیسے میرے ہاتھ پاؤں بندھے ہوے ہوں اور اس پر دھارا کے ساتھ بہی چلی جا رہی ہوں۔

ڈِک، ان کا چھوٹا لڑکا، آٹھ سال کا تھا۔ وہ فوراً لوئس کا گرویدہ ہو گیا اور ایک ڈھلواں راستے پر ہماری رہنمائی کرتا چٹانوں کے دامن میں ایک چھوٹی سی گپھا تک لے آیا۔ لوئس نے پوری صبح اس کے ساتھ پانی میں اور بیچ پر گیند کھیلتے ہوے گزار دی۔ میں تھوڑا سا تیری اور کتاب پڑھتی رہی؛ میں بور نہیں ہوئی تھی، تاہم اپنے سے مسلسل پوچھتی رہی کہ میں آخر یہاں کیا جھک مار رہی ہوں۔ سہ پہر کو مری کار پر ساحلِ سمندر کی سیر کرانے لے گیا؛ ایلن ساتھ نہیں آئی۔ جب ہم واپس گھر پہنچے تو کچھ دیر تک لوئس اور میں ڈرائنگ روم میں اکیلے بیٹھے ہائی بال پیتے رہے۔ مجھ پر اچانک یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ ہمیں اکثر یوں ہی ایک دوسرے کے ساتھ وقت گزارنے کو تنہا چھوڑ دیا جایا کرے گا: مری کی نیت ٹائپ رائٹر کے سامنے بیٹھے بیٹھے دن گزارنے کی تھی اور ایلن کو ظاہرا ایک منٹ اپنی فکر کرنے تک کی فرصت نہیں تھی۔ میں نے ہائی بال کی چُسکی لی؛ مجھے آہستہ آہستہ اچھا لگنے لگا تھا۔

"کتنی خوب صورت جگہ ہے!" میں نے کہا، "اور مری کتنا اچھا ہے! میں سچ مچ بڑی خوش ہوں۔"

"ہاں، یہاں اچھا لگتا ہے،" لوئس نے کہا۔

ریڈیو پر کوئی پرانا گیت بج رہا تھا، اور لمحہ بھر کے لیے ہم اسے خاموشی سے سنتے رہے۔ برف کے ٹکڑے ہمارے گلاسوں میں ٹکرا ٹکرا کر گونج پیدا کرتے رہے، بچّوں کے

قہقہے لگانے کی آواز آتی رہی، اور رسوئی کی سوندھی سگندھ جس میں سمندر کی مہک رچی بسی تھی۔

"زندگی تو بس اِسی طرح گزارنی چاہیے!" لوئس بولا۔ "اپنا گھر ہو، ایک عورت ہو جس سے آدمی نہ بہت زیادہ محبّت کرتا ہو نہ بہت کم، بچّے۔۔۔"

"تمھارے خیال میں مری ایلن کے بارے میں اِس طرح سوچتا ہے؟" میں نے تجسّس سے پوچھا۔ "نہ بہت زیادہ، نہ بہت کم؟"

"صاف ظاہر ہے،" لوئس نے کہا۔

"اور ایلن؟ وہ اس سے کس طرح محبّت کرتی ہے؟"

لوئس مسکرا دیا۔ "بہت زیادہ، اور بہت کم، میرا خیال ہے، ساری عورتوں کی طرح۔"

وہ پھر مجھے سنا رہا ہے، میں نے تھوڑی سی افسردگی کے ساتھ سوچا۔ بے شک اس کا محرک گھریلو مسرّت کا وہ مختصر سا خواب تھا جو ابھی ابھی اس کے دھیان سے ہو کر گزرا تھا۔

"تمھارا کیا خیال ہے، ایسی زندگی سے خوش رہ سکو گے؟" میں نے پوچھا۔

"کم از کم ناخوش تو کبھی نہیں رہوں گا۔"

"کون یقین سے کہہ سکتا ہے؟ خوش نہ رہنا بہت سوں کو ناخوش کر دیتا ہے۔ میرا خیال ہے تم اُنھیں میں سے ہو۔"

لوئس مسکرایا۔ "ہو سکتا ہے،" وہ بولا۔ پھر اس نے لمحہ بھر غور کیا اور کہا: "بہر کیف، مجھے مری پر رشک آتا ہے کہ اس کے بچّے ہیں۔ آدمی ہمیشہ اکیلے اور صرف اپنے لیے رہتے ہوئے اُکتا جاتا ہے۔ ایک وقت آتا ہے کہ یہ سب کچھ خالی خالی سا نظر آنے لگتا ہے۔ میری خواہش ہے کہ میری اولاد ہو۔"

"خیر، ایک نہ ایک دن تمھاری شادی ہو جائے گی اور بچّے بھی ہو جائیں گے،" میں نے کہا۔

لوئس نے ہچکچاتے ہوئے میری طرف دیکھا۔ "ایسا کل یا پرسوں تو ہونے کا نہیں،" اس نے کہا۔ "لیکن چند سال بعد، کیا حرج ہے؟"

میں اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔ "ہاں،" میں نے کہا، "کیا حرج ہے؟ چند سال بعد۔۔۔"

اور میں بس اتنا ہی چاہتی تھی -- چند سال- دوامی محبت کے عہدوپیمان کرنے کی میری عمر نہیں رہی تھی؛ میں بہت دور رہتی تھی- میں بس اتنا چاہتی تھی کہ ہماری محبت کو اتنی زندگی مل جائے کہ سج سج مر سکے، ہمارے دلوں میں کبھی ماند نہ پڑنے والی یادیں چھوڑ جائے اور سدا قائم رہنے والی دوستی-

ڈزر اتنا وافر اور مری اتنا پُرتپاک تھا میں جلد ہی اپنے کو خاصا مطمئن محسوس کرنے لگی- کافی کے دوران، جب لوگ آنے شروع ہوے، میں ملنساری کے موڈ میں آچکی تھی- موسم کا آغاز تھا اور راک پورٹ میں فقط تھوڑے سے چھٹی منانے والے ہی موجود تھے- یہ سب ایک دوسرے سے واقف تھے اور نئے لوگوں سے ملنے کے مشتاق تھے- ہم دونوں، لوگوں کی توجہ کا مرکز بنے ہوے تھے- لوئس جلد ہی گفتگو سے کٹ کر، سینڈوِچ بنانے اور کاک ٹیل ملانے میں ایلن کی مدد کرنے لگا- رہی مَیں، تو میں ان سب کے گاڑھی بھر سوالوں کے جواب دیتی رہی- مری نے تحلیلِ نفسی اور اشتراکیت کے باہمی تعلق پر بحث کا آغاز کیا- یہ ایسا موضوع تھا جس کے بارے میں مَیں اَوروں سے زیادہ جانتی تھی، اور مری کی شہ پاکر اس پر مسلسل بولتی رہی- بعد میں، جب ہم اپنے کمرے میں اکیلے ہوے، لوئس نے متجسّانہ دلچسپی سے میرا جائزہ لیا-

"لگتا ہے جھک مار کر ماننا ہی پڑے گا کہ اس چھوٹی سی کھوپڑی میں دماغ بھی ہے،" اس نے مجھ سے کہا-

"نقلی دماغ، جس پر اصلی کا دھوکا ہو، ہے نا؟" میں نے کہا-

"نہیں، تمھارے پاس واقعی دماغ ہے،" لوئس نے جواب دیا- اس نے جائزہ لینا جاری رکھا، اور اس کی آنکھوں میں ملامت کی خفیف سی جھلک تھی- "عجیب بات ہے، مگر میں تمھارا بادماغ عورت کی حیثیت سے کبھی تصوّر نہیں کرتا- میرے نزدیک تم کوئی اَور ہی چیز ہو!"

"تمھارے ساتھ ہوتی ہوں تو میری کایا ہی پلٹ جاتی ہے!" میں نے اس کی باہوں میں ڈھلکتے ہوے کہا-

اس نے کس زور سے مجھے بھینچا تھا! آہ، یکایک سارے سوال جاتے رہے- وہ وہاں موجود تھا، بس یہی کافی تھا- اس کی ٹانگیں میری ٹانگوں سے اُلجھی ہوئی تھیں، اس کا تنفس، اس کی مردانہ مہک، اس کے آرزومند ہاتھ میرے بدن پر تھے- "این!" وہ میرا نام لے رہا

تھا، جیسا کہ اس کی عادت تھی، اور ایک بار پھر اس کی مسکراہٹ اس کے دل کے ساتھ ساتھ مجھے اس کا جسم بھی عطا کر رہی تھی۔

جب ہم بیدار ہوئے تو آسمان اور سمندر دونوں دمک رہے تھے۔ ہم نے مری کنبے کی سائیکلیں مستعار لیں اور شہر جا پہنچے۔ ہم نے گھاٹ کے ساتھ ساتھ چہل قدمی کی، کچھ وقت کشتیوں، مچھیروں، جالوں اور مچھلیوں کے نظارے میں بِتایا۔ میں نے سمندر کی تازہ، نمکین مہک میں سانسیں بھریں۔ سورج میرے بدن کو سہلا رہا تھا اور لوئس، متبسم، میرا بازو تھامے ہوئے تھا۔

"کتنی شان دار صبح ہے،" میں نے پُرشوق آواز میں کہا۔

"ننھی سی بے چاری گلواز!" لوئس محبت سے بولا۔ "اسے خود کو جنت میں پانے کے لیے کتنا کم درکار ہے!"

"آسمان، سمندر، اور وہ آدمی جس سے مجھے عشق ہے۔ یہ اتنا کم تو نہیں!"

اس نے میرا بازو دبایا۔ "تم بہت زیادہ کا مطالبہ نہیں کرتیں۔"

"جو میسّر ہے اسی پر قناعت کرتی ہوں،" میں نے کہا۔

"بالکل ٹھیک کہا،" لوئس بولا۔ "جو میسّر ہے آدمی کو اسی پر قناعت کرنی چاہیے۔"

آسمان کچھ اَور نیلا ہو گیا، سورج کچھ اَور گرم، اور میں نے اپنے اندر گھنٹیوں کے بڑے پُرمسرت ساز کا نغمہ سنا۔ "میں جیت گئی ہوں!" میں نے اپنے آپ سے کہا۔ یہاں آنے پر رضامند ہو کر میں نے بالکل ٹھیک کیا تھا۔ لوئس اپنے کو آزاد محسوس کر رہا تھا، اب اُسے معلوم ہو گیا تھا کہ میری محبت اسے کسی چیز سے محروم نہیں کیے دے رہی ہے۔ اس نے سہ پہر کا کچھ حصہ ایک بار پھر بیچ پر ڈِک کے ساتھ کھیل کود میں گزارا، اور میں اس کے صبر و تحمل کی داد دیتی رہی۔ ایک مدّت سے میں نے اسے اس درجہ سُستایا ہوا اور تازہ دم نہیں دیکھا تھا۔ ڈنر کے بعد مری ہمیں اپنے احباب سے ملانے لے گیا، اور اس بار لوئس نے الگ تھلگ کھڑے ہونے کی کوشش نہیں کی: وہ تو زندہ دلی سے اُبلا پڑ رہا تھا۔ واقعی، وہ کبھی بھی مجھے تعجب میں ڈالنے سے باز نہیں آئے گا: میں یقین نہیں کر سکتی تھی کہ وہ کسی تفریحی تقریب میں اس درجہ آب و تاب دکھا سکتا ہے۔ لیکن حقیقت یہی تھی۔ ہماری سیاحت کا ذکر کرتے ہوئے وہ اس صفائی اور ہنرمندی سے بعض حقائق کو چھوڑ گیا اور بعض ایسے افسانے جوڑ لیے کہ اس کا تخلیق کیا ہوا گواٹے مالا، سچ مچ کے گواٹے مالا سے زیادہ حقیقی معلوم ہونے لگا۔ ہر فرد

وہاں جانے کو تڑپنے لگا۔ جب اس نے بار بردار کوتاہ قامت انڈین کی ڈُلکی چال کی نقل اتار کر دکھائی تو ایک عورت پکار اٹھی: "تم تو بڑے زبردست اداکار بن سکتے ہو!"، اور ایک اَور عورت نے کہا: "اسے واقعی قصّہ گوئی کا فن آتا ہے۔"

لوئس یک لخت ٹھہر گیا۔ "آپ لوگوں کے صبر کی داد دیتا ہوں!" اس نے مسکرا کر کہا۔ "ذاتی طور پر مجھ میں تو سفر کی داستانیں سننے کی ذرا تاب نہیں۔"

"براہِ کرم، اپنا بیان جاری رکھیے،" ایک سنہری بالوں والی عورت نے درخواست کی۔

"نہیں، بس سنا چکا،" اس نے بوفے کی میز کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ اس نے مین ہیٹن کا بڑا گلاس چڑھایا، اس اثنا میں حسین، سنہری شانوں والی نوجوان عورتیں اور قدرے کم حسین بیاہتا بیبیاں اپنی نشاط سے بوجھل آنکھیں لیے اس کے گرد بھیڑ لگانے لگیں۔ یہ جان کر کہ وہ عورتوں کو پُرکشش لگتا ہے، مجھے تھوڑی سی برہمی محسوس ہوئی۔ میرا خیال تھا کہ میں ٹھیک اِسی وجہ سے اس کی گھایل ہوئی تھی کہ ترغیب دلانے کے معاملے میں وہ بالکل کورا ہے۔ اب اچانک پتا چل رہا تھا کہ اس میں تو یہ صلاحیت بدرجہ اُتم موجود ہے۔ خیر، کچھ بھی سہی، وہ جو کچھ میرے لیے ہے، کسی اَور کے لیے نہیں ہے۔ تنہا میرے ہی لیے وہ یکتائے روزگار ہے، میں نے ایک قسم کے فخر سے سوچا۔

میں بھی پیتی رہی، رقص کیا، ایک گٹار نواز سے گپ لڑائی جسے ترقی یافتہ خیالات رکھنے کی پاداش میں ریڈیو کی ملازمت سے ابھی حال ہی میں برطرف کر دیا گیا تھا، اس کے بعد موسیقاروں، مصوّروں، دانشوروں اور ادیبوں سے باتیں کرتی رہی۔ گرمیوں میں راک پورٹ گرین وِچ وِلیج کا ملحقہ بن جاتا ہے اور فن کاروں سے کھچا کھچ بھرا ہوا ہوتا ہے۔

معاً مجھے لگا کہ لوئس کہیں غائب ہو گیا ہے۔ میں نے مری سے پوچھا: "لوئس کو کیا ہوا؟"

"پتا نہیں،" مری نے پُرسکون آواز میں جواب دیا۔

مجھے دل میں اضطراب کی چبھن محسوس ہوئی۔ اپنی حسین مدّاحوں میں سے کسی کے ساتھ باغ میں سیر کے لیے تو نہیں نکل گیا؟ اگر ایسا ہے تو مجھے وہاں آتا دیکھ کر بہت زیادہ خوش نہیں ہو گا۔ خیر، میری بلا سے! میں نے ڈیوڑھی میں نظر دوڑائی، پھر کچن میں، اور پھر باہر نکل گئی۔ یہاں فقط جھینگروں کے مسلسل الاپ کی آواز آ رہی تھی۔ چند قدم آگے بڑھی

تو مجھے ایک سگریٹ کا جلتا ہوا سِرا نظر آیا۔ لوئس ایک لان چیئر پر بیٹھا تھا۔۔ اکیلا۔

"باہر کیا کر رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"آرام۔"

میں مسکرائی۔ "میرا خیال تھا کہ وہ کُتیاں تمھیں زندہ ہی کھا جائیں گی۔"

"جانتی ہو ہمیں ان کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہیے؟" لوئس نے انتقامی لہجے میں کہا۔ "ہمیں چاہیے کہ انھیں کشتی میں لاد کر سمندر میں پھینک آئیں، اور ان کے عوض اِنڈین عورتوں کی کھیپ بھر لائیں۔ تمھیں چی چی کاستینانگو کی وہ پستہ قد انڈین عورتیں یاد ہیں جو زمین پر کس قدر انکسار سے اپنے شوہروں کے قدموں میں بیٹھی ہوتی تھیں؟ کتنی خاموش، اور کتنی مطمئن!"

"یاد ہیں۔"

"ان کے من موہنے چہرے اور ان کی سیاہ چوٹیاں اب بھی ویسی ہی ہوں گی،" لوئس نے کہا، "اور ہم انھیں دوبارہ کبھی نہیں دیکھ سکیں گے۔" اس نے سرد آہ بھری۔ "وہ سب کتنی دور ہے!"

اس کی آواز میں نوستلجیا کی وہی کیفیت تھی جو اُس وقت تھی جب اس نے چی چین ایتزا کے بن میں، اپنے شکاگو والے اپارٹمنٹ کا ذکر کیا تھا۔ اگر میں یاد بن کر اس کے دل میں جا بسوں تو وہ میرے بارے میں بھی اتنی ہی شفقت سے سوچا کرے گا، مجھے خیال آیا۔ لیکن میں یاد بننا نہیں چاہتی تھی۔

"ممکن ہے ہمیں ایک بار پھر اُن پستہ قد انڈینوں کو دیکھنا میسّر آجائے۔"

"مجھے تو شک ہے کہ کبھی ایسا ہو سکے،" لوئس نے کہا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ "چلو سیر کریں۔ رات کتنی مہک دار ہے۔"

"لوئس، بہتر ہو گا کہ ہم واپس اندر چلیں۔ جلد ہی انھیں ہماری غیر موجودگی کا احساس ہونے لگے گا۔"

"تو پھر کیا ہوا؟ اُن سے کہنے کے لیے میرے پاس کچھ نہیں، نہ اُن کے پاس مجھ سے کہنے کے لیے کچھ ہے۔"

"لیکن وہ مری کے دوست احباب ہیں۔ یوں غائب ہو جانا اچھا نہیں لگتا۔"

لوئس نے آہ بھری۔ "میری کتنی خواہش ہے کہ میری ایک چھوٹی سی اِنڈین بیوی

ہو جو، جہاں جہاں میں جاؤں، پیچھے پیچھے بغیر احتجاج کیے چلی آئے!"

ہم اندر لوٹ آئے۔ لوئس کی ساری بشاشت رخصت ہو چکی تھی۔ وہ بے تحاشا پیتا اور لوگوں کے سوالوں کے جواب غرّا غرّا کر دیتا رہا۔ پھر وہ آ کر میرے پاس بیٹھ گیا اور ناپسندیدگی کے ساتھ گفتگو سنتا رہا۔ میں نے مری کو بتایا کہ فرانس میں ادیبوں کی خاصی بڑی تعداد اس فکر میں سرگرداں ہے کہ اس دور میں لکھنے لکھانے کا کیا فائدہ۔ بس پھر کیا تھا، ہر شخص اس موضوع پر بڑے جوش و خروش سے بحث کرنے لگا۔ لوئس کا چہرہ بتدریج بجھتا چلا گیا۔ اُسے نظریوں، نظاموں، کلیوں سے نفرت تھی۔ میں جانتی تھی کیوں۔ اس لیے کہ اس کے نزدیک کوئی بھی خیال محض لفظوں کا مجموعہ نہیں، بلکہ ایک جان دار شے تھا۔ کوئی خیال جو اسے قبول ہوتا اس کے اندر ہلچل مچا دیتا، ہر چیز کو تہہ و بالا کر کے رکھ دیتا۔ اس کے بعد اپنے دماغ میں ادئی سے نظم و ضبط کو قائم کرنے کے لیے وہ بڑی جان لیوا کوشش کرنے پر مجبور ہو جاتا؛ اور اس کوشش سے اسے کسی قدر خوف آتا تھا۔ اس میدان میں بھی وہ مامونیت کا شدید آرزومند تھا، اور سرگرداں رہنے سے اسے نفرت تھی۔ اکثر تو وہ بالکل ہی کنارہ کش ہو جاتا۔ صاف ظاہر تھا کہ اس وقت وہ کنارہ کش ہو رہا تھا۔ لیکن پھر، اچانک، وہ پھٹ پڑا۔

"آدمی لکھتا کیوں ہے؟ اور کس کے لیے؟ جب آپ اس قسم کے سوال کرنا شروع کر دیں تو پھر لکھ چکے! آپ لکھتے ہیں، بات ختم۔ اور لوگ آپ کو پڑھتے ہیں۔ آپ اپنے پڑھنے والوں کے لیے لکھتے ہیں۔ اس قسم کے سوال وہی ادیب پوچھتے ہیں جنھیں کوئی نہیں پڑھتا۔"

کمرے میں موجود ہر شخص دَم بخود رہ گیا۔ خاص طور پر اس لیے کہ وہاں واقعی ایسے کئی لکھنے والے موجود تھے جنھیں کوئی نہیں پڑھتا تھا، اور نہ آئندہ پڑھنے والا تھا۔ خوش قسمتی سے مری نے سارا معاملہ نہایت خوش اسلوبی سے رفع دفع کر دیا۔ لوئس ایک بار پھر اپنے خول میں سمٹ گیا۔ پندرہ منٹ بعد ہم نے رخصت چاہی۔

اگلے تمام دن لوئس کا منھ پھولا رہا۔ جب ڈِک ہاتھ میں پستول لیے، شور مچاتا ہوا بیچ پر آیا تو لوئس نے اس کی طرف رُکھائی سے دیکھا۔ غصّے سے اُبلتے ہوے، اور بڑے اوپری دل کے ساتھ اس نے ڈِک کو باکسنگ کا سبق دیا اور تیرانے لے گیا۔ اُس شام، جب تک میں ایلن اور مری کے ساتھ گپ بازی کرتی رہی، وہ اخباروں کے انبار میں خود کو گُم کیے بیٹھا رہا۔ مجھے معلوم تھا، مری اتنی جلد بُرا ماننے والا نہیں ہے، لیکن مجھے ایلن کی طرف سے فکر تھی۔

''گزشتہ رات اس نے بہت پی لی تھی؛ کل اچھے موڈ میں ہو گا،'' میں نے سوتے وقت امید کے ساتھ سوچا۔

لیکن میری امید غلط ثابت ہوئی۔ اگلی صبح لوئس نے میری طرف دیکھ کر ایک بار بھی تبسم نہ کیا۔ ایلن اس بات سے خاصی متاثر ہوئی کہ لوئس نے اس کے ہاتھ سے ویکیوم کلینر لے کر اوپر سے نیچے تک پورا گھر صاف کر ڈالا۔ لیکن گھریلو کام کاج کا یہ اچانک جنون مشتبہ تھا۔ لوئس اپنے کو پُرسکون رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ کس چیز سے پیچھا چھڑانا چاہ رہا تھا؟ دوپہر کے کھانے کے دوران اس میں نسبتاً زیادہ دل نوازی آ گئی، لیکن جیسے ہی بیچ پر ہم دونوں تنہا رہ گئے وہ بڑی غضب ناکی سے بولا: ''اگر وہ ناہنجار لونڈا یہاں آیا اور مجھے تنگ کیا، تو اس کی گردن توڑ کر رکھ دوں گا۔''

''قصور خود تمھارا ہے،'' میں نے برہمی سے کہا۔ ''پہلے ہی دن سے منھ نہ لگایا ہوتا۔''

''میں ہمیشہ پہلے دن خود کو فریب میں آ جانے دیتا ہوں،'' لوئس نے عناد سے پُر آواز میں کہا۔

''ٹھیک ہے،'' میں نے تپاک سے کہا، ''لیکن دنیا میں اَور لوگ بھی ہیں۔ تمھیں اس کا خیال رکھنا چاہیے۔''

کنکریوں کے لڑھکنے کی آواز ہمارے سروں کے اوپر اُبھری۔ راستے پر ڈِک چلا آ رہا تھا۔ وہ سفید اور کالے چوخانے والی پتلون اور صاف ستھری قمیص پہنے ہوئے تھا اور کاؤبوائے بیلٹ لگائے ہوئے تھا۔ وہ دوڑتا ہوا لوئس کے پاس آیا۔

''آپ یہاں بیچ پر کیوں چلے آئے؟ میں گھر میں بیٹھا آپ کا انتظار کرتا رہا۔ آپ نے کل کہا تھا کہ آج لنچ کے بعد سائیکل پر سیر کو چلیں گے۔''

''میرا دل نہیں چاہ رہا،'' لوئس نے جواب دیا۔

ڈِک نے اسے ملامتی انداز سے دیکھا۔ ''آپ نے کل کہا تھا کہ کل چلیں گے۔ کل آج ہے۔''

''اگر یہ آج ہے تو کل کس طرح ہے؟'' لوئس نے کہا۔ ''کیا پڑھا رہے ہیں تمھیں اسکول میں؟ کل کل ہو گی۔''

ڈِک کا منھ کھلا کا کھلا رہ گیا؛ وہ روہانسا نظر آنے لگا۔ ''بھئی چلیں نا اب!'' اس نے لوئس کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔

لوئس نے سختی سے اس کا ہاتھ الگ کر دیا۔ اس کے چہرے پر وہی تاثر تھا جو اُس روز پتّھر کے اژدہے کو لات رسید کرتے وقت تھا۔ میں نے ڈِک کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"اگر سائیکل پر سواری کے لیے مَیں تمھارے ساتھ چلوں تو کیسا رہے گا؟ شہر چلتے ہیں، کشتیوں کا منظر دیکھیں گے، اور ڈھیر ساری آئس کریم کھائیں گے۔"

ڈِک نے بغیر کسی جوش و خروش کے میری تجویز پر غور کیا۔ "اِنھوں نے چلنے کا وعدہ کیا تھا،" وہ لوئس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"یہ بہت تھکے ہوئے ہیں۔"

ڈِک لوئس کی طرف متوجہ ہوا۔ "کیا آپ یہیں رہیں گے؟ کیا آپ تیرنے جائیں گے؟"

"مجھے پتا نہیں،" لوئس نے جواب دیا۔

"میں آپ کے ساتھ ہی ٹھہرتا ہوں۔ مُکّے بازی کریں گے،" اس نے کہا، "اس کے بعد تیرنے چلیں گے۔"

ایک بار پھر اس نے اپنا پُراعتماد چہرہ لوئس کی طرف اٹھایا۔

"نہیں!" لوئس نے کہا۔

میں نے ڈِک کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ "آؤ!" میں نے کہا۔ "انھیں بہت سی باتوں کے بارے میں سوچنا ہے۔ بہتر ہو گا کہ ہم اِنھیں تنہا چھوڑ دیں۔ پھر یہ کہ مجھے راک پورٹ جانا ہی ہے۔ خود گئی تو اکیلا لگے گا۔ میرا ساتھ دو گے؟ مجھے وہ ساری باتیں بتانا جو سردیوں میں تم نے کیں۔ میں تمھیں کومک خرید کے دوں گی؛ تم جو چاہو گے خرید دوں گی!" میں نے مایوسی سے پیدا ہونے والی ہمّت سے کہا۔

ڈِک نے لوئس کی طرف پیٹھ پھیری اور اوپر راستے پر جانے لگا۔ میں لوئس کی طرف سے سخت غصّے میں بھری ہوئی تھی۔ بچّوں سے اس طرح کا سلوک نہیں کیا جاتا! پھر میں خود کب چاہتی تھی کہ ڈِک میرے سر منڈھ دیا جائے۔ خوش قسمتی سے میں پیشہ ورانہ طور پر بچّوں کی دل جوئی کا فن جانتی تھی؛ وہ جلد ہی مطمئن ہو گیا۔ ہم نے سائیکل کی دوڑ لگائی، جو مَیں جان بوجھ کر ہار گئی، لیکن بس بال بال؛ میں نے اسے خوب ساری اسٹرابری آئس کریم کھلائی؛ مچھلی پکڑنے والی ایک کشتی کے عرشے پر جا کر سیر کی۔ غرض میں نے اس کے لیے اتنا سب کیا، اور اتنی خوش اسلوبی کے ساتھ کیا، کہ وہ ڈنر کے وقت تک مجھ سے جدا ہونے پر رضامند نہ

ہوا۔

"میرا شکر ادا کرو کہ اس لڑکے سے تمھاری جان چُھڑا دی!" میں نے کمرے میں داخل ہوتے ہی لوئس سے کہا۔ "تم نے اس کے ساتھ بڑا بےہودہ برتاو کیا،" میں نے اضافہ کیا۔

"تمھارا شکر تو اُسے ادا کرنا چاہیے،" لوئس نے کہا۔ "اگر وہ ایک منٹ اَور میرا سر کھاتا تو میں اس کی ایک ہڈی سلامت نہ رہنے دیتا۔"

وہ ٹی شرٹ اور پرانی سوتی پتلون پہنے بستر پر لیٹا ہوا تھا اور سگریٹ کے کش لیتا ہوا چھت کو گھور رہا تھا۔ میں نے تلخی کے ساتھ سوچا کہ اسے واقعی میرا شکریہ ادا کرنا چاہیے تھا۔ میں نے بیچ پر پہننے کے کپڑے اتارے اور بال سنوارنے لگی۔

"کپڑے پہن لو، وقت ہو رہا ہے،" میں نے کہا۔

"پہنے ہوئے تو ہوں،" لوئس نے جواب دیا۔ "تمھیں نظر نہیں آ رہا؟ کیا ننگا دِکھائی دے رہا ہوں؟"

"انھیں کپڑوں میں نیچے جانے کی نیت تو نہیں؟"

"بالکل، انھیں میں جانے کی ہے! مجھے اس میں کوئی تک نظر نہیں آتی کہ لوگ صرف سورج غروب ہونے کی وجہ سے کپڑے بدلتے پھریں۔"

"مری اور ایلن ایسا ہی کرتے ہیں، اور تم ان کے مہمان ہو،" میں نے کہا۔ "اس کے علاوہ یہ کہ انھوں نے کئی اَور لوگوں کو بھی کھانے پر مدعو کر رکھا ہے۔"

"پھر وہی!" لوئس بولا۔ "میں یہاں اس لیے نہیں آیا ہوں کہ نیویارک والی احمقانہ زندگی گزاروں۔"

"اور اس لیے بھی نہیں آئے ہو کہ ہر ایک کے ساتھ ناخوشگواری سے پیش آؤ،" میں نے کہا۔ "کل رات ایلن تمھیں ویسے ہی عجیب عجیب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔" میں اچانک رک گئی۔ "میری بلا سے!" میں نے کہا۔ "جو چاہو کرو۔"

لوئس کو آخر کپڑے بدلنے ہی پڑے۔ اس دوران وہ آپ ہی آپ بڑبڑاتا رہا۔ "اسی نے یہاں آنے پر اصرار کیا تھا، اور اب خود ہی اس میں کھنڈت ڈالے دے رہا ہے!" میں نے غصے سے اپنے آپ سے کہا۔ میں حتی المقدور خوش گوار رہنے کی کوشش کر رہی تھی، اور وہ تھا کہ ہر چیز کا ستیاناس کیے دے رہا تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ اس شام میں اس کے لیے کوئی تردّد نہیں کروں گی؛ اس کی متلون مزاجی کا ساتھ دینا بڑی تھکا دینے والی بات ہے۔

میں اپنے عہد پر قائم رہی۔ میں نے ہر شخص سے بات کی لیکن لوئس کو صاف نظرانداز کر گئی۔ مجموعی طور پر مری کے دوست مجھے خاصی ملنسار طبیعت کے لگے۔ میری شام پُرلطف گزری۔ آدھی رات کے لگ بھگ بیشتر مہمان رخصت ہوئے: ایلن سونے کے لیے چلی گئی اور لوئس بھی۔ میں نیچے کی منزل پر مری، گٹار نواز اور دو اور مردوں کے ساتھ ٹھہری رہی، اور ہم سب تین بجے تک مسلسل باتیں کرتے رہے۔ جب میں اوپر اپنے کمرے میں آئی تو لوئس نے کھٹ سے بتّی جلادی اور بستر میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"تو؟ آخر شور مچانا بند کر دیا؟ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کوئی عورت تمہاری طرح اکیلے اتنا شور مچا سکتی ہے۔"

"مجھے مری سے باتیں کرنے میں مزہ آتا ہے،" میں نے کپڑے اتارتے ہوئے کہا۔

"ہاں، اور تمہاری اسی بات کا تو میں مخالف ہوں!" لوئس بتدریج اونچی ہوتی ہوئی آواز میں کہنے لگا۔ "نظریے، ہمیشہ نظریے! اچھی کتابیں نظریوں کے سہارے نہیں لکھی جاتیں! کچھ لوگ بتاتے پھرتے ہیں کہ کتابیں کیسے لکھی جاتی ہیں، اور دوسرے لکھ کر دکھا دیتے ہیں: دونوں طرح کے لوگ کبھی ایک جیسے نہیں ہو سکتے۔"

"مری کو ناول نگار ہونے کا دعویٰ نہیں۔ وہ نقاد ہے، ایک اعلیٰ نقاد: تم خود اس کے معترف ہو۔"

"وہ پرلے درجے کا بکواسی ہے! اور تم سب کے سب وہاں بیٹھے، چہروں پر عاقلانہ تبسّم منڈھے، اس کی بکواس سنتے رہتے ہو! میں یہ دیکھتا ہوں تو بے اختیار جی چاہتا ہے کہ تمہارے سر دیوار سے مار کر ان میں تھوڑی سی عقلِ سلیم ہی ڈال دوں۔"

میں اپنے بستر میں جا گھسی۔ "شب بخیر،" میں نے کہا۔

اس نے جواب دیے بغیر بتّی گل کر دی۔

میری آنکھیں کھلی رہیں۔ مجھے اب غصّہ بھی نہیں آرہا تھا: میں تو بس کچھ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ لوئس ان محفلوں سے اُکتا گیا ہے، یوں ہی سہی۔ تاہم یہ اقرار کرنا ہو گا کہ وہ لوگ پورا دن ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ سکون سے تنہا چھوڑ دیتے تھے: اور پھر مری میں کوئی بات بھی ایسی نہیں تھی جسے نمائشی فضیلت سے منسوب کیا جا سکے۔ خود لوئس ابھی حال تک اس کی گفتگو سے لطف اندوز ہوتا رہا تھا۔ تو پھر اس اچانک عداوت کی کیا وجہ تھی؟ بے شک اپنے قیام کا ستیاناس کرنے سے اس کا مقصد مجھے ہدف بنانا تھا: اس کے بَیر واقعی دیرپا

ثابت ہو رہے تھے۔ لیکن اس صورت میں اسے چاہیے تھا کہ اپنی بدمزاجی مجھی تک محدود رکھتا۔ ہر کسی کو اس کا نشانہ بنانے کا تو مطلب یہی تھا کہ وہ اپنے آپ پر تاؤ کھائے بیٹھا ہے۔ ممکن ہے وہ اُن لمحوں پر خود کو ملامت کر رہا ہو جن میں ایسا لگتا تھا کہ اس نے اپنی ساری محبت، ساری نرمی مجھ پر نچھاور کر دی ہو۔ یہ خیال اتنا اذیت ناک تھا کہ میرا دل اُسے پکارنے، اس سے باتیں کرنے کو چاہا۔ لیکن میری آواز میرے دانتوں سے ٹکرا کر ٹوٹ گئی۔ میں نے اس کے سانسوں کی آواز سنی، جو بڑی ہمواری سے آجا رہے تھے۔ وہ محوِ خواب تھا، اور میری ہمت نہ ہوئی کہ اسے جگاؤں۔ آدمی کو سوتے ہوئے دیکھنا کتنا دل گداز ہوتا ہے! کتنا معصوم ہوتا ہے یہ منظر! ہر بات ممکن معلوم ہوتی ہے؛ ہر چیز کی ابتدا ہو سکتی ہے، یا ازسرِ نو ابتدا۔ وہ اپنی آنکھیں کھولے گا؛ وہ کہے گا: ''مجھے تم سے محبت ہے، میری ننھی سی گلواز!'' لیکن نہیں، وہ یہ نہیں کہے گا؛ وہ معصومیت محض سراب تھی۔ آئندہ کل، بالکل آج کی مانند ہو گا۔ تو کیا بچ نکلنے کی کوئی صورت باقی نہیں رہی؟ میں نے شدید مایوسی کے عالم میں اپنے سے پوچھا۔ اچانک مجھ پر برگشتگی کا دورہ پڑا۔ وہ کیا چاہتا ہے؟ وہ کیا کرے گا؟ وہ کیا سوچ رہا ہے؟ اِدھر میں تو سوال کر کر کے اپنا حال خراب کیے لے رہی تھی، اُدھر وہ نہایت سکون سے پڑا سو رہا تھا، خیالوں سے کوسوں دور۔ یہ بڑی بے جا بات تھی! میں نے خالی الذہن ہونے کی کوشش کی؛ لیکن میں سو نہ سکی۔ میں آہستگی کے ساتھ بستر سے نکلی۔ اُس سہ پہر میں ڈِک کی وجہ سے تیرنے نہیں جا سکی تھی اور، اچانک، پانی کی خُنکی کو اپنے بدن پر محسوس کرنے کی خواہش میرے اندر اُبھری۔ میں نے اپنا تیراکی کا لباس اور بیچ پر پہننے کے کپڑے پہنے، لوئس کی پرانی باتھ روب اٹھائی، اور ننگے پَیر، نیند میں ڈوبے ہوئے گھر میں سے ہوتی ہوئی باہر نکل گئی۔ رات کس قدر بے پایاں تھی! میں نے باہر آکر سینڈل پہنے، پورا راستا دوڑتی ہوئی بیچ پر پہنچی اور ریت پر پسر گئی۔ یہاں فضا کافی خوش گوار تھی؛ ستاروں کے نیچے لیٹ کر میں نے آنکھیں موند لیں، اور پانی کے بہنے کی آواز نے مجھے سُلا دیا۔ جب میں بیدار ہوئی تو سامنے ایک بہت بڑا سُرخ گولا سمندر سے اُٹھ رہا تھا۔ تخلیقِ عالم کا چوتھا دن تھا اور سورج ابھی ابھی پیدا ہوا تھا؛ انسانوں اور حیوانوں کے غم و محن ابھی وجود میں نہیں آئے تھے۔ میں سمندر میں جا گھسی اور پُشت کے بل تیرنے لگی؛ میرے بدن کا سارا بوجھ جاتا رہا؛ میری آنکھیں آسمان سے لبریز تھیں۔

''این!''

میں ساحل کی طرف مڑی -- ایک آباد علاقہ، ایک مرد کی پکارتی ہوئی آواز۔ یہ لوئس تھا، صرف شب خوابی کا پاجامہ پہنے، سینہ برہنہ۔ مجھے اپنے بدن کا بوجھ دوبارہ محسوس ہونے لگا اور میں تیرتی ہوئی اس کی طرف آنے لگی۔ "یہ رہی میں!"

"این!" اس نے دُہرایا۔ "این!"

"بھیگ جاؤ گے! مجھے ذرا بدن خشک کر لینے دو،" میں نے کنارے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

اس نے اپنی گرفت ڈھیلی نہیں کی۔ "این! خوف کے مارے میری تو سِٹی گم ہو گئی تھی!"

"میں نے تمھیں خوف زدہ کیا؟ خیر، میری باری جو تھی۔"

"میں نے آنکھیں کھولیں: بستر خالی پڑا تھا۔ میں نے کچھ دیر انتظار کیا، تم واپس نہ آئیں۔ میں نچلی منزل پر آیا؛ پورے گھر میں تمھارا نام نشان نہیں ملا۔ پھر میں یہاں آیا تو پہلے پہلے تو تم بالکل نظر نہیں آئیں۔"

"تمھیں یہ خیال تو نہیں گزرا کہ میں ڈوب مری ہوں؟"

"مجھے نہیں پتا کہ کیا خیال گزرا۔ ڈراونے خواب کی طرح لگ رہا تھا!" لوئس نے کہا۔

میں نے سفید باتھ روب اٹھائی۔ "میرے بدن سے پانی پونچھ دو۔ اور اپنے کو بھی خشک کر لو۔"

اس نے تعمیل کی، اور میں نے اپنا لباس پہن لیا۔ اس نے خود کو باتھ روب میں لپیٹ لیا۔ "میرے پاس آ کر بیٹھو،" وہ بولا۔

میں پھر سے بیٹھ گئی اور اس نے مجھے اپنی آغوش میں بھر لیا۔ "تم یہاں موجود ہو! میں تمھیں کھو نہیں بیٹھا ہوں۔"

"تم مجھے کبھی بھی میری کسی کوتاہی کی وجہ سے نہیں کھوؤ گے،" میں نے بے اختیار کہا۔

وہ بڑی دیر خاموشی سے میرے بال سنوارتا رہا۔ پھر اچانک بولا: "این، چلو شکاگو لوٹ چلیں۔"

ایک سورج میرے دل میں طلوع ہوا، اس سورج سے کہیں زیادہ روشن جو آسمان میں بلند ہو رہا تھا۔

"اس سے بہتر کیا بات ہو سکتی ہے!"

"چلو لوٹ چلیں،" اس نے دُہرایا۔ "میں تمھارے ساتھ اکیلے میں وقت گزارنے کو تڑپ رہا ہوں۔ یہاں پہنچتے ہی مجھے احساس ہو گیا تھا کہ میں نے کتنی احمقانہ حرکت کی ہے۔"

"لوئس، تمھارے ساتھ اکیلے میں وقت گزارنے سے زیادہ مجھے دنیا میں کوئی اَور چیز عزیز نہیں،" میں نے کہا۔ "کیا اس وجہ سے اتنے خراب موڈ میں تھے؟ یہاں آنے پر متاسّف تھے؟"

لوئس نے اقرار میں سر ہلایا۔ "مجھے لگا جیسے دام میں آ گیا ہوں: نجات کی کوئی صورت نظر نہیں آئی۔ بڑی وحشت ہوئی۔"

"تو اب کوئی صورت نظر آ رہی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"لوئس نے میری طرف یوں دیکھا جیسے اچانک اسے کوئی بات سُوجھی ہو۔ "وہ ابھی تک پڑے سو رہے ہیں۔ چلو سامان باندھیں اور چلتے بنیں۔"

میں مسکرائی۔ "کیوں نہ مری کو حقیقت سے آگاہ کرنے کی کوشش کریں؟" میں نے کہا۔ "مجھے یقین ہے اس کی سمجھ میں آ جائے گا۔"

"اور نہ آئے تو ہماری بلا سے!" لوئس بولا۔

میں نے اس کی طرف کسی قدر پریشان نظر سے دیکھا۔ "لوئس، تمھیں پورا یقین ہے کہ واپس جانا چاہتے ہو؟ محض ترنگ تو نہیں ہے؟ بعد میں پچھتاؤ گے تو نہیں؟"

لوئس مسکرا دیا۔ "مجھے پتا ہوتا ہے کہ کب ترنگ سے اپنی تواضع کر رہا ہوں،" اس نے جواب دیا۔ "تمھارے سر کی قسم، یہ ترنگ نہیں ہے۔"

میں نے اس کی آنکھوں میں ایک بار پھر جھانکا۔ "اور جب ہم گھر لوٹیں گے تو تمھارے خیال میں یہ تمام چیزوں کی طرف واپسی ہو گی؟ ہر چیز پچھلے سال کی طرح ہو جائے گی؟ یا تقریباً؟"

"بالکل پچھلے سال کی طرح،" لوئس نے بڑی متین آواز میں جواب دیا۔ اس نے میرا سر اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور بڑی دیر تک مجھے دیکھتا رہا۔ "میں نے تم سے کم کم محبت کرنے کی کوشش کی، پر نہ بنا۔"

"اب اَور کوشش ہی نہ کرو،" میں نے کہا۔

"نہیں، اب کوشش نہیں کروں گا۔"

مجھے پتا نہیں کہ لوئس نے مری سے کیا کہا، لیکن اس میں کلام نہیں کہ اگلی شام جب وہ ہمیں ایرپورٹ چھوڑنے گیا تو اس کی باچھیں کِھلی ہوئی تھیں۔ لوئس نے جھوٹ نہیں بولا تھا: شکاگو میں مجھے ہر چیز واپس مل گئی۔ نکڑ پر، الوداع کہنے سے پہلے، اس نے مجھے مضبوطی سے اپنے ساتھ چمٹا لیا، اور بولا: "میں نے پہلے کبھی تم سے اتنی محبت نہیں کی ہے جتنی آج۔"

اِبّار ربّی

ہندی سے ترجمہ: رفیق احمد نقش

آئیے

آئیے شوبھا بڑھائیے
ہماری آنکھوں میں سج جائیے
آپ شرماتی نہیں ہیں
یہ بھلا ہے
بچھڑے ہوئے ہیں ہم
اَور بڑھ آئیے
بچیے، اس جانور سے بچیے
اِدھر آجائیے

آپ کا آدر بھاؤ نہیں چاہیے
بند ہیں ہم
آپ تھوڑا اَور تھوڑا اَور
کُھل جائیے
کِھلیے، کِھلکھلائیے
لوگوں کے دلوں پر بجلی چلائیے

دیکھیے، ہم سے بڑھا نہیں جائے گا
آپ ہی سنبھالیے
آپ لہرائیے
ہمارے تن من پر
بدلی سی چھا جائیے
آئیے اِدھر آئیے

کوی کی پتنی

بچوں کے لیے جیلر
پتی کے لیے ہوٹل ہے
کوی کی پتنی
مونگ کی دال پکاتی ہے
ٹماٹر میں نہاتی ہے
مہنگائی کی طرح
تنک مزاج
کویتا نہیں پڑھتی وہ

ارہر کی دال

کتنی مزے دار ہے
چاول کے ساتھ کھاؤ
باسمتی ہو تو کیا کہنا
بھر کٹوری

تھالی میں اُنڈیلو
تھوڑا گرم گھی چھوڑو
بُھنی ہوئی پیاز
لہسن کا تڑکا
اِس دال چاول کے سامنے
کیا ہے پنچ تارا و یَنجن *
انگلی چاٹو
چاقو چمچ والے
کیا سمجھیں اس کا سواد!

میں گنگا میں لہر پر لہر
کھاتا اور ڈوبتا
جھپک اور لوریاں
ہلکی ہلکی
ایک کے بعد ایک تھاپ
نیند جیسے
نرم جَل
واہ رے بھوجن کے آنند
ارہر کی دال
اور باسمتی
اُس پر تیرتا تھوڑا سا گھی

---

* پنچ تارا و ینجن : Five star cuisine

جیتنا

"پاپا، جیتنا کیا ہوتا ہے؟"
پوچھتی ہے پانچ سال کی جُولی
کیا بتاؤں---
بیٹا، جو ہار جاتا ہے
"کیا مطلب؟"
یعنی جو گر پڑا
وہ ہار گیا
اور جو نہیں گرا
جو نہیں بھاگا
وہ جیتا
"کیا مطلب؟"
کیسے بتاؤں اسے---
جیتنا بیٹا---
کیا ہوتی ہے جیت!

پہاڑ

(اُدے پور سے ڈونگر پور جاتے ہوے)

پہاڑ، تم کہاں رہے
اتنے دن؟
بہت دن بعد ملے
کہاں رہے بھائی؟

بارش میں بھیگ کر

بارش میں بھیگ کر
سہج سَرل ہو گیا
گل گئیں ساری کتابیں
میں انسان ہو گیا
خالی خالی تھا
جیون ہی جیون ہو گیا
میں بھاری بھاری
ہلکا ہلکا ہو گیا
برس رہی ہیں بوندیں
اُن میں ہو کر
اوپر کو اُٹھا
لپک کر تنا
پانی کا پیڑ
آسمان ہو گیا
بارش میں بھیگ کر
میں مہان ہو گیا

تُم

تُم ملیں مجھے
جیسے مکینک کو
اوزار
تم ملیں جیسے

بچّے کو کھلونا
تم ملیں
جیسے مزدور کو
بیڑی کا بنڈل
جیسے روگی کو نیند
کوی کو کویتا
بچھڑے کو تھن
ملیں مجھے تم

میری بیٹی

میری بیٹی بنتی ہے
میڈم
بچوں کو ڈانٹتی جو دیوار ہے
ٹوٹے برساتی میز کرسی پلنگ پر
ناک پر رکھا چشمہ سرکاتی
(جو وہاں نہیں ہے)
موہن
کمار
شیلیش
سُوتریا
گنگ
کو ڈانٹتی
"خاموش رہو!"
چیختی

ڈپٹتی
کمرے میں چکّر لگاتی ہے
ہاتھ پیچھے باندھ
اکڑ کر
فراک کے کونے کو
ساڑھی کی طرح سنبھالتی
کاپیاں جانچتی
"ویری پُور!"
"گڈ!"
کبھی "وَرک ہارڈ!"
کے پھول برساتی

وہ ترستی ہے
ماں پِتا ماسٹرنی بننے کو
اور مَیں بچّہ بننا چاہتا ہوں
بیٹی کی گود میں گڈے سا
جہاں کوئی ماسٹرنی نہ ہو

بھاگو

دنیا کے بچّو
بچو اور بھاگو
وہ پیچھے پڑے ہیں تمھاری
کھال کھینچنے کو
ہڈیاں نوچنے کو

بڑے تمھیں گھیر رہے ہیں
ہیرے کی طرح جڑ رہے ہیں
ٹھوک پیٹ کر کو رہا میں

بچّو، پیڑ، چڑیو
روٹی اور پہاڑو
بھاگو
تُرنت تم چُھپو
ہندی کے کوی آ رہے ہیں
کاغذ اور قلم کی فوج لیے
بھاگو، جہاں ہو سکے چُھپو

دس

دس برس بچے ہیں
جو کچھ کرنا ہے کر لیجیے
مکان بنوا لیجیے
کتاب چھپوا لیجیے
شہرت کما لیجیے
دیش کو سنبھالیے
قوم کو بلائیے
سماج کو بدلیے
دس برس سے پہلے

دس برس بچے ہیں

جلدی کر لیجیے
جو کچھ کرنا ہے
نبٹ لیجیے

اب چھوڑیے یہ دنیا
کب تک لدیں گے آپ
منظر باسی ہُوا
پھیکی برساتیں
بسنت سُوکھا سُوکھا
اُتریے اس گدھے سے
کسی اَور کو چڑھنے دیجیے
آپ دوڑے بھی نہیں
رُکے بھی نہیں
آپ نے کمال کیا
جیے بھی نہیں مرے بھی نہیں

اب بس کیجیے
اس دھرتی پر رحم کیجیے
کیڑے مکوڑے کچھ تو کم کیجیے
تھوڑی سی تھوڑی سی
بس تِل بھر گندگی دور کیجیے

آپ نے پیا بھی نہیں
پینے بھی نہیں دیا
ہٹیے
لوگوں کو نہانے دیجیے

جُوتے

اَن گِنت ننگے پَیروں کو
کچھ جُوتے کچل رہے ہیں

لدَر پدَر

لدَر پدَر
بھدَر بھدَر
چوّن لاکھ لوگ چڑھے بسوں میں
چڑھے بسوں میں لوگ
لدَر پدَر لٹکے اسکوٹروں
لدے سائیکلوں پر
چلے لوگ سَر پَٹ دفتروں،
کارخانوں، دھندوں کی اور

لدَر پدَر
لاکھ لاکھ لوگ
روٹی کا ڈبّا لیے
جیب میں بیڑی
ڈاکٹر کا نسخہ
مکان کا نقشہ
ریزگاری ہلاتے
ستائیس لاکھ لوگ گھُسے
دفتروں کارخانوں میں

بَھد بَھد
بھدَر بھدَر کرتے
لوگ بیٹھ گئے
کرسیوں اور بنچوں پر
فائلوں میں بُوڑ گئے
مشین میں کھو گئے
کٹ گئے کروڑ کروڑ
بچّے
ہنسیاں کِلکاریاں
لڑکپن
جوانیاں
جیون کی نشانیاں

کروڑ کروڑ لوگ
شام کو اُڑے چمگادڑوں کی طرح
لٹکے بسوں
لوکل ریل اور سائیکلوں پر
کٹے پٹے
ہارے تھکے
گھروں کو

یاترا

(وینیشوَر میلے سے ڈونگر پور لوٹتے ہوئے)

پہاڑی پر جیپ میں جار ہے ہو تم
دھڑادھڑ

سڑک سنسان بیابان
میلوں تک کوئی نہیں
میلے سے لوٹتا کوئی خاندان
تھکا پیدل چلا جاتا ہے
ننگے پاؤں
پسینے میں شرابور
جیپ کی آواز سے
مڑ کر دیکھتا ہے بوڑھا
پر رُکتی نہیں جیپ
دوڑتی چلی جاتی ہے
مڑ کر دیکھتی ہے
گزرتی جیپ کو لڑکی
کیا ہے اس آنکھ میں ؟
مڑ کر دیکھتی ہے بچّی
کیا ہے اس آنکھ میں ؟
جیسے ہرن دیکھے بھیڑیا
آگے نکل گئی جیپ
کیچڑ اُلانگھی ہو جیسے

آٹھ سال کا وہ

آٹھ سال کا ہو گیا
پان سِنگ
ماں دیس بھیج رہی ہے اُسے
بچے مراد آباد سے اترتے ہی

پیسے ہی پیسے ہیں
وہاں سے بھیجے گا یہ

پان سِنگ
چچیرے بھائی کے ساتھ جانا
وہ ہے انیس کا

آٹھ سال کا ہے ابھی بس
صاف بول نہیں پاتا
جائے گا دلّی
پتا نہیں کہاں رہے گا
وہاں کیا کرے گا
کیا کھائے گا
بس منی آرڈر کرے گا جاتے ہی
گھر چلائے گا وہاں سے
چلائے گا پورا پہاڑ
دنیا اٹھائے گا
پیٹھ پر
آٹھ سال کا پان سِنگ

فوٹو

جھونپڑپٹی کا منظر ہے
تیس مَرے زہریلی شراب سے
رو رہی ہیں پھٹے حال عورتیں

آنسو ہی آنسو
گیلا ہے اخبار
کلک رہے ہیں بچے
فوٹو کھنچا ہے
پہلی بار

سرکس

وہ قلابازی دکھا رہی ہے
جُھولے میں لٹک گئی
کھڑی ہوئی
پیروں کے بل گڑی مُڑی اور
ہوا میں اُچھل گئی
ہاتھ پیر گول گول
سب غائب
صرف پیٹ دِکھتا ہے
جُھولے پر کھڑی ہوئی
تو پیٹ نکل آیا

سُندر نہیں ہے
ننگی ہیں ٹانگیں اور باہیں
گڑمُڑی کُچھے اور گلابی چولی میں
بَھلی نہیں دِکھتی وہ
چہرہ سپاٹ
جیسے کُھردرا تختہ

تختے کے سہارے کھڑی ہے
آنکھ باندھ کر جوکر
مارتا ہے چُھرے
ایک بھی نہیں لگا اُسے
ہاتھ پیر کچھ نظر نہیں آتا
پسلیاں گِن لو
پر پیٹ اُبھر آتا ہے
پورا تختہ ہی پیٹ ہے

اُس کی بچّی
ایک پہیے کی سائیکل چلاتی ہے
نہیں دِکھتے ہاتھ پاؤں
لوندا جما ہے سائیکل پر
پیٹ دھرا ہے جُھولے پر
پیٹ جَڑا ہے تختے پر

لڑائی سے لَوٹا سپاہی

میرا ہاتھ چلا جاتا ہے
کٹی بانہہ پر
کُھجلی ہوتی ہے کلائی میں
بار بار گُھٹنے کے نیچے
مچھر کاٹتا ہے
ہاتھ اُدھر جاتا ہے نیند میں
چادر سے ٹٹول کر لوٹ آتی ہے

میری وہ بانہہ جو نہیں رہی
دُکھ رہی ہو گی
سر کے بوجھ سے
کیسے بدلوں اسے
کیسے لوں کروٹ

ابار ربی
(Ibbar Rabbi)

ہندی کے منفرد شاعر، علی گڑھ میں پیدا ہوئے۔ وہیں تعلیم پائی۔ کچھ عرصے تک تدریس سے وابستہ رہنے کے بعد صحافت سے منسلک ہو گئے۔ آج کل نئی دلّی سے نکلنے والے نوبھارت ٹائمز میں کام کرتے ہیں۔ ان کی منتخب نظمیں ان کے مجموعے "لوگ باگ" سے لی گئی ہیں جو ۱۹۸۵ میں شائع ہوا۔

ادب اور فنونِ لطیفہ کا ترجمان

سہ ماہی

ذہنِ جدید

مرتّب : زبیر رضوی

پوسٹ بکس ۷۰۴۲ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

انتخاب

رِیشارد کاپوِشنسکی

کی کتاب

شہنشاہ

ریشارد کاپُوشِنسکی (Ryszard Kapuscinski) پولینڈ سے تعلق رکھنے والے ایک صحافی ہیں، لیکن یہ تعارف ان کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں بتاتا۔ ان کی تحریریں، جو انگریزی اور دوسری زبانوں میں ترجمہ ہو کر شائع ہوتی ہیں، صحافتی تحریروں سے اس قدر بنیادی طور پر مختلف ہیں کہ ان کے لیے ایک خاص زُمرہ وضع کرنے کی ضرورت محسوس ہونے لگتی ہے۔ ادب اور صحافت کے درمیان تمام امتیازات یہاں آ کر اپنی معنویت کھو بیٹھتے ہیں۔ کاپوشِنسکی کی پیشہ ورانہ زندگی بھی اسی طرح غیر معمولی انداز میں گزری ہے۔ سب سے پہلے انھیں پولینڈ کے ایک چھوٹے سے اخبار نے اپنے واحد غیر ملکی نامہ نگار کے طور پر ملک سے باہر بھیجا، اور ایک موقعے پر ان کا دائرہ کار پچاس افریقی ریاستوں پر محیط تھا۔ ۱۹۸۵ سے ۱۹۸۰ تک پولش نیوز ایجنسی کے لیے کام کرتے ہوئے انھوں نے افریقا، لاطینی امریکا اور مشرقِ وسطیٰ میں ستائیس انقلابوں کا مشاہدہ کیا۔ یہ پُرخطر مشغولیت کاپوشِنسکی کے منفرد تجربے کی آئینہ دار تو ہے ہی، انگریزی کے ایک ممتاز اور محترم ادیب کے لفظوں میں اس بات کی بھی غمازی کرتی ہے کہ بیسویں صدی کی دنیا میں واقعات کی ہنگامی رفتار نے سکون اور ٹھہراو کے لیے کوئی گنجائش باقی نہیں چھوڑی ہے۔ اس دنیا کو بیان کی گرفت میں لانے کے لیے ایک خاص طرح کی فہم اور خاص طرح کے اظہار کی ضرورت پڑتی ہے۔ آج کی دنیا کے واقعات کو ان اصطلاحوں اور اظہار کے ان سانچوں کی مدد سے سمجھنا اور بیان کرنا ممکن نہیں ہے جنھیں ایک نسبتاً سادہ تر دنیا کو سمجھنے اور بیان کرنے کے لیے وضع کیا گیا تھا۔ معمولی درجے کے صحافی، بلکہ ادیب بھی، واقعات کے اس جمّ غفیر میں راہ کھو بیٹھتے ہیں اور اپنے بیان کو کوئی واضح اور مکمل شکل نہیں دے پاتے۔ کاپوشِنسکی کے پاس یہ گُر موجود ہے۔

ایران کا انقلاب ہمارے خطّے میں پیش آنے والا ایک نہایت اہم اور پُرمعنی واقعہ ہے، اور اس کے بارے میں بےشمار مضامین اور کتابیں لکھی گئی ہیں۔ آئندہ صفحوں میں اس موضوع پر کاپوشِنسکی کی کتاب *Shah of Shahs* کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے۔ اسے پڑھنے کے بعد غالباً آپ اس بات سے اتفاق کریں گے کہ ایران کی جدید تاریخ کے پس منظر میں اس انقلاب کو گہرائی کے ساتھ سمجھنے اور پُراثر انداز میں بیان کرنے میں مشکل ہی سے کوئی اَور تحریر اس بلندی کو پہنچتی ہو گی۔

کاپوشِنسکی ۱۹۳۲ میں مشرقی پولینڈ کے شہر پِنسک (Pinsk) میں پیدا ہوے۔ وارسا کی یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی۔ سولہ سال کی عمر میں ان کی تحریریں پولینڈ کے اخباروں میں چھپنے لگیں۔ چوبیس سال کی عمر میں کاپوشِنسکی کو پہلی بار خبر نگار کی حیثیت سے برصغیر ہندوپاک میں بھیجا گیا اور اس کے بعد پچیس برس تک وہ مختلف براعظموں کے مختلف ملکوں میں یہ خدمات سرانجام دیتے رہے۔ ان کی دیگر کتابیں انگریزی میں *Another Day of* ،*The Emperor* *Life* اور *The Soccer War* کے عنوانات سے شائع ہو چکی ہیں۔

شہنشاہ

ریشارد کاپوشنسکی

انگریزی سے ترجمہ: اجمل کمال

۱

نام، چہرے، پھولوں کے تختے

۲

تصویرخانہ

۳

بُجھا ہوا شعلہ

۱

نام، چہرے، پھولوں کے تختے

ہر چیز سخت بے ترتیبی کے عالم میں ہے، جیسے پولیس نے ابھی ابھی اپنی مضطربانہ اور دست دراز تلاشی ختم کی ہو۔ اخبار -- مقامی اور غیر ملکی -- ہر طرف بکھرے پڑے ہیں: خصوصی ضمیمے، توجہ جذب کرنے والی، بڑے بڑے حروف میں چھپی ہوئی سُرخیاں،

"اُورفت!"

(وہ چلا گیا)

ایک دُبلے، لمبوترے چہرے کی بڑی بڑی تصویریں، جس کے نقوش پر تشویش یا شکست ظاہر نہ کرنے کی کوشش میں طاری کیا ہوا ضبط ہے جس کے باعث وہ چہرہ کسی بھی طرح کے تاثر سے عاری ہو گیا ہے۔ بعد کے اخبارات فاتحانہ جوش کے اعلانوں سے لبریز ہیں:

"اُو آمد!"

(وہ آ پہنچا)

صفحے کے باقی حصے پر ایک گمبھیر، پدرسالار چہرہ چھایا ہوا ہے جو کسی تاثر کے اظہار کا ارادہ نہیں رکھتا۔

(اور اُس روانگی اور اس واپسی کے درمیان، جذبے اور جوش کی، غضب اور دہشت کی کیا کیا انتہائیں، کتنی کتنی آتش زدگیاں!)

فرش پر، کرسیوں پر، میز اور ڈیسک پر، اتنے اشارتی کارڈ، کاغذ کے پُرزے، بے حد عُجلت میں لکھے ہوئے نوٹس، ڈھیریوں کی صورت میں پڑے ہیں کہ مجھے رُک کر سوچنا پڑتا ہے کہ میں نے یہ جملہ کہاں لکھا تھا: "وہ تمھیں دھوکا دے گا اور تم سے وعدے کرے گا، لیکن تم اس فریب میں مت آنا"۔ یہ کس نے کہا تھا؟ کب؟ کس سے؟

یا، کاغذ کے ایک پورے صفحے پر پھیلی ہوئی عبارت: "۶۴۱۲۱۸ پر لازماً فون کرنا ہے!" لیکن اتنا وقت گزر چکا ہے، میں بھول چکا ہوں کہ یہ کس کا نمبر ہے اور اس پر فون کرنا کیوں لازمی تھا۔

ادھورے خط، جو بھیجے نہیں گئے۔ میں نے یہاں جو کچھ دیکھا اور جو کچھ بسر کیا ہے اُس پر چاہوں تو بے تکان بول سکتا ہوں، لیکن اپنے تاثرات کو منضبط نہیں کر سکتا۔

سب سے زیادہ ابتری بڑی گول میز پر ہے: مختلف ناپ کے فوٹو، کیسٹ، ۸ ملی میٹر کی فلمیں، خبر نامے، پمفلٹوں کی فوٹوکاپیاں -- سب کچھ، اُلجھے ہوئے ڈھیر کی شکل میں، درہم برہم، کباڑی بازار کی طرح۔ اور دوسرے پوسٹر، البمیں، ریکارڈ اور کتابیں، لوگوں سے لی ہوئی اور لوگوں کی دی ہوئی، ایک دور کی یادگار جو ابھی ابھی ختم ہوا ہے، مگر جسے اب بھی سنا اور دیکھا جا سکتا ہے کیوں کہ وہ یہاں محفوظ ہے: فلموں میں انسانوں کے چڑھتے ہوئے، ٹھاٹھیں مارتے سمندر؛ کیسٹوں پر مؤذنوں کی پکاریں، چلّا کر دیے گئے احکام، گفتگوئیں، خود کلامیاں؛ تصویروں میں چہرے، سرشاری اور رفعت کے عالم میں۔

اب، اس تمام ابتری کو ترتیب میں لانے کی کوشش کے محض خیال ہی سے (کیوں کہ میری روانگی کا دن قریب آ پہنچا ہے) میں تنفر اور تھکن کے احساس سے مغلوب ہو گیا۔ جب کبھی میں ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہوں (یہ اتفاق اکثر پیش آتا ہے) تو میں اپنے کمرے کو بے ترتیبی کی حالت میں رکھنا پسند کرتا ہوں، کیوں کہ اس طرح کمرے کا ماحول کسی نہ کسی طرح کی زندگی کا التباس فراہم کر دیتا ہے، گرمی اور قُربت کا متبادل، اس بات کا ثبوت (اگرچہ باطل ثبوت) کہ ایسی اجنبی اور سرد جگہ کو، جو تمام ہوٹلوں کے کمرے درحقیقت ہوتے ہیں، کسی حد تک فتح کر کے اپنا مطیع کر لیا گیا ہے۔ کسی ایسے کمرے میں جو ایک مصفّیٰ ترتیب کی حالت میں ہو، میں خود کو بے حس اور تنہا محسوس کرنے لگتا ہوں؛ سیدھی تیز لکیریں، فرنیچر

کے کونے، سپاٹ دیواریں، یہ تمام بے نیاز اور کڑی جیومیٹری مجھے چُبھتی ہے: دقیق احتیاط سے بنائی گئی کشیدہ ترتیب، جو محض اپنے واسطے موجود ہے، انسانی موجودگی کی رمق تک سے خالی۔ خوش قسمتی سے میرے پہنچنے کے کچھ ہی گھنٹوں بعد، میری غیر ارادی حرکات کے زیرِ اثر (جو جلد بازی یا کاہلی کا نتیجہ ہوتی ہیں)، یہ ترتیب شکستہ ہو کر غائب ہو جاتی ہے، چیزوں میں جان پڑ جاتی ہے اور وہ اِدھر سے اُدھر حرکت کرنے لگتی ہیں، اور بدلتے ہوئے باہمی رشتوں اور رابطوں کے سلسلے میں داخل ہو جاتی ہیں: چیزیں منتشر اور بکھری ہوئی صورت اختیار کرلیتی ہیں، اور، یکایک، کمرے کا ماحول زیادہ دوستانہ اور مانوس معلوم ہونے لگتا ہے۔ تب میں ایک طویل سانس لے کر اپنے اعصاب کو ڈھیلا چھوڑ سکتا ہوں۔

اِس وقت مجھ میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ کمرے کو ترتیب میں لانے کے لیے کچھ کر سکوں، اس لیے میں نچلی منزل پر چلا جاتا ہوں، جہاں ایک نیم تاریک، خالی ہال میں چار جوان آدمی چائے پیتے ہوئے تاش کھیل رہے ہیں۔ انھوں نے خود کو کسی نہایت پیچیدہ کھیل میں اُلجھا لیا ہے -- جو نہ برِج ہے اور نہ پوکر، نہ بلیک جیک ہے اور نہ پِنوکل -- ایسا کھیل جس کے اصول غالباً میری سمجھ میں کبھی نہیں آئیں گے۔ وہ خاموشی سے تاش کی بیک وقت دو گڈیوں سے کھیلتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ ان میں سے کسی ایک شخص کا چہرہ خوشی سے چمک اُٹھتا ہے اور وہ سارے پتّے سمیٹ لیتا ہے۔ ایک وقفے کے بعد وہ دوبارہ پتّے بانٹتے ہیں، میز پر درجنوں پتّوں کی ڈھیریاں جما لیتے ہیں، اُن پر غور کرتے ہیں، اُنھیں گنتے ہیں، اور گنتے ہوئے آپس میں تکرار کرنے لگتے ہیں۔

ہوٹل کے استقبالی عملے کے ان چاروں ارکان کے گزارے کا وسیلہ مَیں ہوں۔ میں انھیں پال رہا ہوں، کیوں کہ میں اس ہوٹل کا واحد مہمان ہوں۔ ان کے علاوہ صفائی کرنے والی عورت، باورچیوں، ویٹروں، دھوبیوں، خاکروبوں، مالی، اور میرے علم کے مطابق کئی اور افراد اور ان کے گھر والوں کی روزی کا ذریعہ میری ہی ذات ہے۔ میرے کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اگر میں اپنا بِل ادا کرنے میں تاخیر کروں تو یہ سب لوگ بھوکوں مرنے لگیں گے، مگر پھر بھی میں اپنا بِل بروقت ادا کرنے کی کوشش کرتا ہوں، کِسے معلوم! صرف چند مہینوں پہلے اِس شہر میں ایک کمرہ حاصل کر لینا اتنی ہی بڑی خوش قسمتی کی بات تھی جیسے لاٹری جیت لینا۔ بے شمار ہوٹلوں کے ہوتے ہوئے بھی، لوگوں کا سیلاب اتنا بے پناہ تھا کہ نئے آنے والوں کو اسپتالوں میں بستر حاصل کرنے پڑتے تھے تاکہ رات کو سر چھپانے کی

کوئی جگہ تو میسّر ہو۔ اب آسانی سے ہاتھ لگنے والی دولت اور خیرہ کر دینے والے سودوں کی یہ گرم بازاری ختم ہو چکی ہے، مقامی تاجر منڈی میں آ گئے ہیں، اور ان کے غیر ملکی ساجھے دار سب کچھ چھوڑ کر فرار ہو چکے ہیں۔ سیاحت گھٹ کر صفر کے برابر رہ گئی ہے؛ تمام بین الاقوامی آمدورفت تھم چکی ہے۔ کچھ ہوٹل جلا دیے گئے، کچھ بند ہو گئے یا خالی پڑے ہیں، اور ان میں سے ایک میں چھاپاماروں نے اپنا ہیڈ کوارٹر قائم کر لیا ہے۔ ان دنوں شہر اپنے ہی معاملات میں گرفتار ہے، اسے غیر ملکیوں کی ضرورت نہیں، اسے دنیا کی ضرورت نہیں۔

تاش کھیلنے والے اپنا کھیل روک کر مجھے چائے کی دعوت دیتے ہیں۔ یہاں یا تو چائے پی جاتی ہے یا پھر دُوغ؛ کافی یا الکحل کا رواج نہیں ہے۔ الکحل پینے پر آپ کو چالیس، بلکہ ساٹھ کوڑوں کی سزا دی جا سکتی ہے، اور اگر کوڑے مارنے والا کوئی تگڑا شخص ہو (اس قسم کے لوگ اکثر بہت پُرجوش کوڑے مارنے والے ہوتے ہیں) تو آپ کی پیٹھ کا قیمہ بن سکتا ہے۔ سو ہم چائے کی چسکیاں لیتے ہیں اور ہال کے دوسرے سرے پر، کھڑکی کے نیچے رکھے ہوئے ٹی وی پر نظریں جما دیتے ہیں۔

خمینی کا چہرہ اسکرین پر نمودار ہوتا ہے۔

خمینی کی نشست قُم کے کسی غریبانہ علاقے میں (جیسا کہ عمارتوں کی حالت سے اندازہ ہوتا ہے) ایک چوک پر رکھی ہوئی لکڑی کی ایک سادہ سی، ہتھوں والی کرسی ہے۔ قم ایک چھوٹا سا، سپاٹ، گدلا، بے کشش شہر ہے جو تہران سے سو میل جنوب میں، ایک خالی، تھکا دینے والے، تپتے ہوئے صحرا میں واقع ہے۔ بظاہر اس ہلاک کر دینے والی دشوار آب و ہوا میں کوئی ایسی بات نہیں جو غور و فکر اور مراقبے کو سازگار ہو، اس کے باوجود قم مذہبی جوش و خروش، غضب ناک راسخ العقیدگی، تصوّف اور جنگ جُو ایمان کا مرکز ہے۔ اس شہر میں پانچ سو مسجدیں اور ملک کے بڑے بڑے مدرسے قائم ہیں۔ قرآن کے عالم اور روایت کے نگہبان قم ہی میں بحث و تمحیص کرتے ہیں؛ علما اور آیت اللہ یہیں باہم مشورت کرتے ہیں؛ خمینی ملک بھر پر اسی مقام سے حکومت کرتا ہے۔ وہ ہمیشہ قم ہی میں رہتا ہے؛ دارالحکومت میں کبھی نہیں جاتا؛ کبھی کہیں نہیں جاتا۔ سیر یا ملاقات کے لیے جانا اس کے معمولات کا حصّہ نہیں ہے۔ وہ اپنی بیوی اور پانچ بچوں کے ساتھ اسی شہر کی ایک تنگ، گرد آلود، ناہموار گلی کے، جس کے وسط میں ایک نالا بہتا تھا، ایک چھوٹے سے مکان میں رہا کرتا تھا۔ اب وہ اپنی بیٹی کے مکان میں منتقل ہو چکا ہے، جس کی بالکنی سے وہ نیچے کھڑے ہوئے ہجوم کے سامنے نمودار ہوتا ہے (یہ

ہجوم عام طور پر شہر کی مسجدوں، اور ان سب سے اہم، آٹھویں امام رضا کی ہمشیرہ فاطمہ کے مزار کی -- جس میں غیر مسلموں کا داخلہ ممنوع ہے -- زیارت کی غرض سے آنے والوں کا ہوتا ہے۔) خمینی کا طرزِ زندگی بے حد سادہ ہے، اس کی غذا صرف چاول، دہی اور پھلوں پر مشتمل ہے، اور اس کا وقت خالی دیواروں اور بغیر فرنیچر کے ایک کمرے میں گزرتا ہے جس کے فرش پر صرف ایک بستر اور کتابوں کا ڈھیر ہے -- یہیں، دیوار سے پُشت لگائے، وہ اپنے مہمانوں سے ملاقات کرتا ہے جن میں بیرونی ملکوں کے نہایت رسمی سفارتی وفود بھی شامل ہیں۔ کھڑکی میں سے وہ مسجدوں کے گنبد اور مدرسے کا وسیع صحن دیکھ سکتا ہے جو فیروزی موزائک، آبی مائل سبز میناروں، سکون اور سائے کی دیواروں سے گھری ہوئی دنیا ہے۔ دن بھر ملاقاتیوں اور درخواست گزاروں کی ایک لمبی قطار اس کمرے میں سے گزرتی رہتی ہے۔ جب اس میں وقفہ آتا ہے تو خمینی نماز ادا کرنے چلا جاتا ہے یا کمرے ہی میں قیام کرتا ہے اور یہ وقت غور و فکر یا، جیسا کہ اس بڑی عمر کے شخص کے لیے فطری بات ہے، تھوڑی سی نیند لینے میں صرف کرتا ہے۔ جس شخص کو اس تک سب سے زیادہ رسائی حاصل ہے وہ اس کا چھوٹا بیٹا احمد ہے جو اپنے باپ کی طرح ایک مذہبی عالم ہے۔ دوسرا بیٹا، جو پہلوٹھی کا تھا اور اپنے باپ کی زندگی بھر کی امیدوں کا مرکز تھا، پُراسرار حالات میں ختم ہوا -- لوگ کہتے ہیں شاہ کی خفیہ پولیس ساواک کے ہاتھوں فریب کاری سے قتل کر دیا گیا۔

کیمرا لوگوں سے بھرے ہوئے چوک کو دکھاتا ہے جو کندھے سے کندھا جوڑے کھڑے ہیں۔ متجسس اور گمبھیر چہرے دکھائی دیتے ہیں۔ ہجوم کے ایک طرف، واضح طور پر نشان زد کی ہوئی لکیر کے ذریعے مردوں سے علیحدہ کی ہوئی، چادروں میں لپٹی عورتیں کھڑی ہیں۔ یہ ایک گدلا، ابر آلود دن ہے، اسکرین پر ہجوم سرمئی رنگ کا نظر آتا ہے اور عورتوں والا حصہ بالکل سیاہ۔ خمینی، ہمیشہ کی طرح، گہرے رنگ کے ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہنے اور سر پر سیاہ عمامہ باندھے ہوئے ہے۔ وہ تن کر بیٹھا ہے۔ داڑھی سے اوپر اس کا چہرہ زردی مائل اور ساکت ہے۔ بات کرتے ہوئے وہ ہاتھوں کو حرکت نہیں دیتا؛ اس کے ہاتھ کرسی کے ہتھوں پر رکھے رہتے ہیں۔ کبھی کبھار اس کی پیشانی پر بل پڑ جاتے ہیں اور بھنویں اوپر کو اٹھ جاتی ہیں، ورنہ بے پناہ ثابت قدم، شکست اور تذبذب سے ناآشنا، اور کبھی تسکین نہ پانے والے عزم کے مالک اس شخص کے چہرے کے عُضلات بالکل ساکن رہتے ہیں۔ اس چہرے میں جسے معلوم ہوتا ہے کہ ایک بار اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ان نقوش میں ڈھال دیا

گیا ہے، جو جذبے اور تاثر کو راہ نہیں دیتا، جو کڑی توجہ اور اندرونی استغراق کے سوا کسی چیز کا اظہار نہیں کرتا، صرف آنکھیں ہیں جو مسلسل حرکت میں رہتی ہیں۔ اس کی زندہ، اندر اُتر جانے والی نگاہ گھونگھریالے بالوں والے سروں کے سمندر کی سطح پر پھسلتی ہے، چوک کی گہرائی اور اس کا پھیلاو ناپتی ہے اور اپنا ہاریک۔ بیں جائزہ جاری رکھتی ہے جیسے کسی خاص شخص کی تلاش میں ہو۔ میں اُس کی یکساں آواز سنتا ہوں جس کا بہاو نپاتُلا اور سُست ہے -- ایک طاقت ور آواز، لیکن ایسی آواز جو کبھی جَست یا پرواز نہیں کرتی، کسی جذبے کا تاثر نہیں دیتی، کبھی چمک نہیں دکھاتی۔

''یہ کیا بات کر رہا ہے؟'' جب خمینی اپنے اگلے فقرے پر غور کرنے کو ذرا رکتا ہے تو میں تاش کھیلنے والوں سے دریافت کرتا ہوں۔

''کہہ رہا ہے کہ ہمیں اپنے وقار کی حفاظت کرنی چاہیے،'' ان میں سے ایک جواب دیتا ہے۔

کیمرامین کیمرے کا رُخ قریب کے مکانوں کی چھتوں کی طرف کرتا ہے جہاں نوجوان مرد، سروں پر چارخانے کے رومال باندھے، ہاتھوں میں آٹومیٹک رائفلیں لیے کھڑے ہیں۔

''اور اب کیا کہہ رہا ہے؟'' میں دوبارہ پوچھتا ہوں، کیوں کہ میں فارسی نہیں سمجھتا۔

''کہہ رہا ہے،'' جوانوں میں سے ایک مجھے بتاتا ہے، ''ہمارے ملک میں بیرونی اثرات کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔''

خمینی کی گفتگو جاری رہتی ہے اور تمام لوگ پوری توجہ سے اسے سنتے رہتے ہیں۔ اسکرین پر ایک شخص پلیٹ فارم کے نیچے کھڑے ہوئے بچّوں کو خاموش کرانے کی کوشش کر رہا ہے۔

''کیا کہہ رہا ہے؟'' میں کچھ دیر بعد پھر پوچھتا ہوں۔

''کہہ رہا ہے کہ کسی کو ہم پر کوئی چیز مسلط کرنے یا ہمارے گھر میں آ کر ہمیں یہ بتانے کا حق نہیں ہے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ اور کہہ رہا ہے: ایک دوسرے کے ساتھ بھائیوں کی طرح، اتحاد سے رہو۔''

وہ اپنی اٹکتی ہوئی انگریزی میں مجھے اتنا ہی بتا پاتے ہیں۔ انگریزی سیکھنے والے ہر شخص کو سمجھ لینا چاہیے کہ دنیا بھر میں اس زبان میں بات چیت کرنا دشوار سے دشوار تر ہوتا جا رہا ہے۔ یہی بات فرانسیسی، یا دوسری یوروپی زبانوں کے بارے میں بھی عام طور پر درست

ہے۔ کبھی یوروپ دنیا پر حکمرانی کرتا تھا، اپنے تاجر، سپاہی اور مبلّغ ہر براعظم میں بھیجتا تھا، دوسروں پر اپنے مفادات اور تہذیب لادتا تھا (جو عموماً تہذیب کی بوگس شکل ہوتی تھی)۔ دنیا کے دوردراز کونوں تک میں، کسی یوروپی زبان سے واقفیت امتیاز کی علامت، ترقی پسندانہ پرداخت کی شہادت، اکثر روزمرّہ زندگی کی ضرورت، ملازمت میں کامیابی اور ترقی کی بنیاد، اور کبھی کبھی تو انسان سمجھے جانے کی شرط ہوا کرتی تھی۔ یہ زبانیں افریقی اسکولوں میں پڑھائی جاتی تھیں، تجارت میں استعمال ہوتی تھیں، اجنبی ملکوں کی پارلیمنٹوں، ایشیائی عدالتوں اور عرب قہوہ خانوں میں بولی جاتی تھیں۔ یوروپ کے لوگ کسی دقّت کے بغیر دنیا کے کسی بھی خطّے میں سفر کرسکتے تھے۔ وہ اپنے خیالات کا اظہار کرسکتے تھے اور سمجھ سکتے تھے کہ دوسرے لوگ ان سے کیا کہہ رہے ہیں۔ آج کی دنیا اس سے مختلف ہے۔ سینکڑوں سرحدیں اُبھر آئی ہیں۔ ہر قوم مقامی روایات کے مطابق اپنی آبادی، اپنے علاقے، اپنے وسائل اور اپنی تہذیب کی ترتیب اور تنظیم کرنے کی خواہش مند ہے۔ ہر قوم خود کو آزاد اور خودمختار سمجھتی ہے یا اس کی آرزو رکھتی ہے، اپنی اقدار پر فخر کرتی ہے اور ان اقدار کے احترام کا مطالبہ کرتی ہے (اور اس معاملے میں انتہائی حسّاس ہے)۔ چھوٹی اور کم زور قومیں تک -- بلکہ یہ قومیں خاص طور پر -- تبلیغ کیے جانے سے نفرت کرتی ہیں، اور ہر اس قوّت کے خلاف بغاوت کرتی ہیں جو ان پر حکمرانی کرنے یا مشکوک قسم کی اقدار رائج کرنے کی کوشش کرے۔ لوگ دوسروں کی طاقت کی تحسین کرسکتے ہیں -- بشرطے کہ یہ طاقت ان سے مناسب فاصلے پر ہو اور ان کے خلاف استعمال نہ کی جارہی ہو۔ ہر قوّت اپنی حرکیات، اپنے فرماں روایانہ اور توسیعی رجحانات، اور کم زوروں کو کچل ڈالنے کی شدید، زور آور طلب رکھتی ہے۔ یہ طاقت کا قانون ہے، جیسا کہ ہر کوئی جانتا ہے۔ مگر کم زور کیا کرسکتے ہیں؟ وہ صرف اپنے گرد باڑھ بنا سکتے ہیں اور نگل لیے جانے؛ محروم کردیے جانے؛ یکساں چال ڈھال، روپ رنگ، زبان، سوچ اور ردعمل کی بےچہرہ قطاروں کا حصّہ بنادیے جانے؛ کسی اجنبی مقصد کے لیے خون بہانے پر مجبور کیے جانے، اور آخرکار کچل کر ملیامیٹ کردیے جانے کے خوف میں مبتلا رہ سکتے ہیں۔ ان کی مزاحمت اور بغاوت کا، آزاد زندگی کے لیے ان کی جدوجہد کا، اپنی زبان کو قائم کرنے کی کوشش کا یہی سبب ہے۔ شام میں فرانسیسی اخبار بند کردیا گیا؛ ویت نام میں، امریکیوں کے نکل جانے کے بعد، انگریزی اخبار بند کردیا گیا، اور اب ایران میں انگریزی اور فرانسیسی دونوں زبانوں کے اخبار بند کردیے گئے۔ ریڈیو اور ٹیلی وژن پر، اور پریس کانفرنسوں میں،

صرف فارسی، اُن کی اپنی زبان، استعمال کی جاتی ہے۔ جو شخص تہران میں زنانہ کپڑوں کی دُکان کے باہر لکھی ہوئی ہدایت -- "اس دکان میں داخل ہونے والے مرد کو گرفتار کر لیا جائے گا" -- پڑھنے سے قاصر رہتا ہے، ضرور جیل جائے گا۔ کوئی اَور شخص جو اصفہان کے نواح میں لکھی ہوئی تختی -- "خبردار! یہاں بارودی سُرنگیں ہیں!" -- نہیں پڑھ سکتا، عین ممکن ہے ہلاک ہو جائے۔

میں اپنے ساتھ ایک چھوٹا سا ٹرانزسٹر ریڈیو رکھا کرتا تھا اور اس پر مقامی اسٹیشنوں کی نشریات سنتا تھا۔ میں کسی بھی براعظم میں ہوتا، اس کے ذریعے ہمیشہ پتا لگا سکتا تھا کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ اب یہ ریڈیو بے مصرف ہو چکا ہے۔ جب میں سوئی گھماتا ہوں تو مجھے دس اسٹیشن سنائی دیتے ہیں، جن میں سے ہر ایک پر ایک مختلف زبان بولی جا رہی ہے، اور میں ایک لفظ بھی نہیں سمجھ سکتا۔ اگر میں ہزار میل کے فاصلے پر کسی اَور جگہ پہنچوں تو میرے ٹرانزسٹر پر دس نئے اور اُتنے ہی ناقابلِ فہم اسٹیشن آنے لگتے ہیں۔ کیا ان اسٹیشنوں سے یہ کہا جا رہا ہے کہ جو رقم میری جیب میں ہے اُس کی اب کوئی قدر نہیں رہی؟ کیا یہ کہا جا رہا ہے کہ جنگ شروع ہو گئی ہے؟

ٹیلی وژن کا بھی یہی حال ہے۔

دنیا بھر میں، دن اور رات کے ہر حصے میں، لاکھوں اسکرینوں پر بے شمار لوگ ہم سے کچھ نہ کچھ کہہ رہے ہیں، ہمیں کسی نہ کسی چیز پر قائل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، ہاتھ لہرا رہے ہیں، چہروں پر مختلف تاثرات پیدا کر رہے ہیں، جوش میں آ رہے ہیں، مسکرا رہے ہیں، سر ہلا رہے ہیں، انگلیوں سے اشارے کر رہے ہیں، اور ہم کچھ نہیں جانتے کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے، وہ ہم سے کیا چاہتے ہیں، کس چیز کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ یہ بالکل ایسا ہے جیسے وہ کسی اَور سیارے سے آئے ہوں -- زہرہ یا مریخ سے آیا ہوا ابلاغِ عامّہ کے ماہروں کا بہت بڑا لشکر -- مگر وہ ہمارے ہی ہم جنس ہیں، ہماری ہی سی ہڈیاں اور خون رکھتے ہیں، متحرک ہونٹوں اور سنائی دینے والی آواز کے مالک ہیں، گو ہماری سمجھ میں ان کا ایک لفظ بھی نہیں آتا۔ نوعِ انسان کا ہمہ گیر مکالمہ کس زبان میں برپا کیا جائے گا؟ کئی سو زبانیں شناخت اور ترقّی کے لیے برسرِ پیکار ہیں؛ زبان کی رکاوٹیں بڑھ رہی ہیں۔ ناشنوائی اور نافہمی میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔

ایک مختصر وقفے کے بعد جس میں پھولوں کے تختے بچھائے گئے -- یہاں کے لوگ

پھولوں سے محبت رکھتے ہیں اور اپنے عظیم ترین شاعروں کے مقبروں کے گرد پُررنگ، گھنے باغ لگاتے ہیں۔۔) اسکرین پر ایک جوان آدمی کی تصویر اُبھرتی ہے۔ ایک اناؤنسر کوئی اعلان کرتا ہے۔

"یہ کیا کہہ رہا ہے؟" میں اپنے تاش کھیلنے والوں سے پوچھتا ہوں۔

"اس آدمی کا نام بتا رہا ہے جس کی یہ تصویر ہے۔ اور یہ بتا رہا ہے کہ یہ کون تھا۔"

ایک اَور تصویر آتی ہے، پھر ایک اَور۔۔ طلبا کے شناختی کارڈوں پر لگی تصویریں، فریم کیے ہوئے فوٹو، خودکار مشینوں سے کھنچوائے گئے فوٹو، فوٹو جن کے عقب میں ملبہ دکھائی دے رہا ہے، ایک خاندان کا گروپ فوٹو جس پر بنا ہوا تیر کا نشان ایک لڑکی کے بمشکل دکھائی دیتے ہوئے ہیولے کی طرف اشارہ کر رہا ہے، یہ واضح کرنے کے لیے کہ کس کا ذکر ہو رہا ہے۔ ہر تصویر چند لمحوں کے لیے آتی ہے؛ اناؤنسر ایک فہرست میں سے نام پڑھے جا رہا ہے۔

ان سب کے والدین ان کے بارے میں اطلاعات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ وہ ناامیدی کی مزاحمت کرتے ہوئے مہینوں سے یہی کیے جا رہے ہیں۔ تصویروں میں دکھائے گئے لوگ ستمبر میں، دسمبر میں، جنوری میں غائب ہو گئے تھے، یعنی اُن مہینوں میں جب لڑائی اپنے عروج پر تھی، جب شہر میں فائرنگ کی آواز کبھی نہیں تھمتی تھی۔ یہ لوگ غالباً جلوس کے آگے آگے چلتے ہوئے، سیدھے مشین گنوں سے نکلتی ہوئی باڑھ میں جا گھُسے ہوں گے۔ یا قریبی چھتوں پر متعین نشانچیوں نے انھیں تاک کر مارا ہو گا۔ ہم یہ فرض کر سکتے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک کو آخری بار کسی سپاہی کے نشانے کی زد کے اندر دیکھا گیا ہو گا۔ ہر شام اس پروگرام میں ہمیں اناؤنسر کی غیرجذباتی آواز سنائی دیتی ہے، اور بےشمار ایسے لوگوں کے چہرے دکھائی دیتے ہیں جو اَب نہیں ہیں۔

ایک بار پھر پھولوں کے تختے دکھائے جاتے ہیں، جس کے بعد اگلا پروگرام شروع ہوتا ہے۔ یہ پروگرام بھی لوگوں کی تصویروں پر مشتمل ہے، لیکن اس میں دکھائے جانے والے لوگ دوسری طرح کے ہیں۔ ان میں اکثر عمررسیدہ ہیں، ان کے لباس کثیف ہیں (کالروں پر شکنیں پڑی ہیں اور جیکٹیں ملی دَلی ہیں)، چہروں پر مایوسی کی لکیریں ہیں اور شیو بڑھا ہوا ہے، ان میں سے کچھ کی باقاعدہ داڑھیاں ہیں۔ ہر ایک کے گلے میں دفتی کا ایک بڑا سا ٹکڑا لٹکا ہوا ہے جس پر اس کا نام لکھا ہے۔ کسی کسی تصویر کے نمودار ہونے پر تاش کھیلنے والوں میں سے

کوئی پکار اٹھتا ہے: "آہا، اچھا تو یہ ہے وہ!" اور ہر شخص اسکرین پر نظر جما دیتا ہے۔ اناؤنسر ان میں سے ہر ایک کے ذاتی کوائف اور اس کے جرائم کی تفصیل پڑھ کر سنا رہا ہے۔ جنرل محمد زند نے تبریز میں نہتے مظاہرین پر فائر کرنے کا حکم دیا: سینکڑوں لوگ مارے گئے۔ میجر حسین فرزین نے قیدیوں پر تشدد کیا، ان کے پپوٹے جلائے اور ناخن اکھاڑ دیے۔ چند گھنٹے پہلے، اناؤنسر کہتا ہے، اسلامی ملیشیا کے فائرنگ اسکواڈ نے ٹربیونل کی سنائی ہوئی سزا پر عمل در آمد کر دیا۔

اچھے اور بُرے غیر موجود لوگوں کی اس شناختی پریڈ کے دوران ہال کی فضا بوجھل اور افسردہ ہو گئی ہے ـــ اس وجہ سے اَور بھی زیادہ کہ موت کا پہیا جو اتنے طویل عرصے سے گھوم رہا ہے، اب بھی حرکت میں ہے اور سینکڑوں نئے لوگوں کو کچلتا چلا جا رہا ہے۔ (محو ہوتے ہوئے فوٹوگراف، جیل میں لی گئی مجرموں کی تصویریں)۔ جھٹکوں کے ساتھ گزرتا ہوا، ساکت، خاموش چہروں کا یہ جلوس رفتہ رفتہ پریشان کن ہو جاتا ہے لیکن میں اس میں اتنا محو بھی ہو جاتا ہوں کہ اچانک اسکرین پر اپنے تاش کے کھلاڑیوں کی، اور پھر خود اپنی، تصویر دیکھنے اور اناؤنسر کی زبان سے اپنے نام سننے کی توقع کرنے لگتا ہوں۔

پھر میں اوپر کی منزل پر چلا آتا ہوں اور خالی راہداریوں سے گزرتا ہوا اپنے بے ترتیب کمرے میں خود کو بند کر لیتا ہوں۔ اس وقت مجھے، معمول کے مطابق، نظر نہ آنے والے شہر کے کسی اندرونی حصے سے فائرنگ کی آواز سنائی دیتی ہے۔ فائرنگ ہر رات ٹھیک نو بجے شروع ہوتی ہے، جیسے یہ وقت کسی رواج یا روایت کا مقرر کیا ہوا ہو۔ اس کے بعد شہر پر خاموشی چھا جاتی ہے۔ پھر دوبارہ گولیاں چلنے کی آوازیں اور دھماکوں کی گھُٹی ہوئی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ یہ آوازیں کسی کو مضطرب نہیں کرتیں، نہ کوئی ان پر توجہ دیتا ہے اور نہ خود کو براہِ راست خطرے کی زد میں محسوس کرتا ہے (سوائے اُن لوگوں کے جنھیں گولی ماری جا رہی ہو گی)۔ فروری کے وسط سے، جب شہر میں بغاوت پھیل گئی اور ہجوم نے فوج کے اسلحہ خانوں پر قبضہ کر لیا، تہران مسلّح ہو چکا ہے، بے حد اشتعال کے عالم میں ہے: اندھیرے کی اوٹ میں گلیوں اور مکانوں میں قتل کا ڈراما کھیلا جا رہا ہے۔ دن کے وقت شہر کا زیرِ زمین حصہ خود کو چھپائے رکھتا ہے، لیکن رات میں وہ نقاب پوش مسلّح دستوں کو شہر کی گلیوں میں لے آتا ہے۔

خطرناک راتیں لوگوں کو اپنے گھروں میں مقفّل ہو جانے پر مجبور کرتی ہیں۔ کرفیو نہیں

ہے، لیکن آدھی رات سے لے کر سورج نکلنے کے وقت تک کہیں جانا دشوار اور خطرناک ہو سکتا ہے۔ اس عرصے میں نیم تاریک اور ڈرے ہوئے شہر پر اسلامی ملیشیا یا آزاد مسلّح دستوں کا راج ہوتا ہے۔ یہ دونوں پوری طرح مسلّح نوجوانوں پر مشتمل ہیں جو لوگوں پر بندوقیں تانتے ہیں، ان سے جرح کرتے ہیں، آپس میں مشورہ کرتے ہیں، اور کبھی کبھی، محض احتیاط کے پیشِ نظر، روکے ہوئے لوگوں کو جیل خانے لے جاتے ہیں -- جہاں سے باہر آنا بہت مشکل ہے۔ اس کے علاوہ آپ کو یہ بھی پتا نہیں چلتا کہ آپ کس گروپ کے ہاتھوں گرفتار ہوئے ہیں، اس لیے کہ تشدّد کے جن نمائندوں سے آپ کا سامنا ہوتا ہے اُنھیں ایک دوسرے سے جُدا شناخت کرنے کے لیے کوئی علامت نہیں ہے، نہ وردی، نہ ٹوپی، نہ بازو یا سینے پر لگے ہوئے بلّے -- یہ صرف مسلّح شہری ہیں جن کے احکام، اگر آپ کو جان عزیز ہے، بے چون و چرا مان لینے چاہییں۔ مگر چند دن میں ہم ان کے عادی ہو جاتے ہیں اور انھیں الگ الگ پہچاننے لگتے ہیں۔ یہ ممتاز دکھائی دینے والا شخص، جو عمدہ سلی ہوئی قمیص پہنے اور لباس سے مناسبت رکھنے والی ٹائی لگائے ہوئے، کندھے پر رائفل لٹکائے، سڑک پر چلا آرہا ہے، یقیناً ملیشیا سے تعلّق رکھتا ہے اور کسی وزارت یا مرکزی دفتر میں کام کرتا ہے۔ دوسری طرف، یہ نقاب پوش نوجوان (جس کے چہرے پر چڑھی ہوئی اُونی نقاب میں آنکھوں اور منھ کے لیے سوراخ بنے ہوئے ہیں) مقامی فدائین میں سے ہے جس کی صورت یا نام سے کسی کو واقف نہیں ہونا چاہیے۔ جو لوگ امریکی فوج کی سبز وردی پہنے، کاروں میں تیزی سے آجا رہے ہیں -- اور ان کاروں کی کھڑکیوں سے بندوقوں کی نالیں جھانک رہی ہیں -- ان کی شناخت کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ وہ ملیشیا والے بھی ہو سکتے ہیں اور مسلّح حزبِ مخالف (یعنی مذہبی انتہاپسند، زراج پسند، ساواک کی آخری باقیات) کے لوگ بھی، جو خود کشی کے سے عزم کے ساتھ انتقام یا شر انگیزی کی کوئی واردات کرنے کی غرض سے اُڑے چلے جا رہے ہیں۔

لیکن یہ اندازہ لگاتے رہنا کہ کس کی کمیں گاہ آپ کے راستے میں آنے والی ہے، یا آپ کس کے جال میں پھنسنے جا رہے ہیں، کوئی ایسی مزے کی بات نہیں ہے۔ لوگ ناگہانیوں کو پسند نہیں کرتے، اس لیے رات کے وقت خود کو اپنے گھروں کے حفاظتی مورچوں میں رکھتے ہیں۔ میرے ہوٹل کے دروازے بھی مقفّل رہتے ہیں (اس وقت گولیاں چلنے کی آوازیں، شٹر گرائے جانے اور دروازے اور پھاٹک بند کیے جانے کی آوازوں میں

گھُل مِل گئی ہیں)۔ کوئی دوست ملنے نہیں آئے گا؛ ایسی کوئی بات پیش نہیں آئے گی۔ کوئی شخص نہیں ہے جس سے میں بات کر سکوں۔ میں تنہا بیٹھا، میز پر پڑی تصویروں اور نوٹس کو کھنگال رہا ہوں، ٹیپ کی ہوئی گفتگوئیں سن رہا ہوں۔

۲
تصویر خانہ

فوٹو گراف ۱

یہ قدیم ترین تصویر ہے جو مجھے حاصل ہو سکی - ایک سپاہی، اپنے داہنے ہاتھ میں ایک زنجیر کا سِرا تھامے ہوئے، اور ایک قیدی، زنجیر کے دوسرے سِرے پر - دونوں کیمرے کے عدسے کی طرف غور سے دیکھ رہے ہیں - یہ واضح طور پر ان کی زندگیوں کا ایک اہم لمحہ ہے - سپاہی ایک معمّر، پستہ قد شخص ہے، ایک سادہ، تابعدار دہقان، جس نے اپنے ناپ سے بڑی، بھدّی سلی ہوئی وردی پہن رکھی ہے جس کی پتلون میں اکارڈین کے غلاف کی طرح کی چُنٹیں پڑی ہیں، بڑی سی ٹوپی باہر کو نکلے ہوئے کانوں پر ترچھی ٹِکی ہوئی ہے -- غرض وہ ایک تماشے کی شبیہ ہے جو گڈ سولجر شوائیک کی یاد دلاتی ہے - زنجیر میں بندھا ہوا آدمی: دُبلا جسم، اندر کو دھنسی ہوئی آنکھیں، سر پر پٹّی بندھی ہوئی، غالباً زخمی - فوٹو گراف پر لکھے ہوئے عنوان سے پتا چلتا ہے کہ سپاہی شاہ محمّد رضا پہلوی (آخری شاہِ ایران) کا دادا ہے، اور زخمی شخص شاہ نصرالدین کا قاتل - اس لحاظ سے یہ فوٹو گراف ۱۸۹۶ کا ہونا چاہیے جب شاہ نصرالدین، چالیس سال حکمرانی کرنے کے بعد، مارا گیا تھا - دادا اور زخمی دونوں تھکے ہوئے لگتے ہیں، جو سمجھ میں آنے والی بات ہے، کیوں کہ وہ کئی دن سے، پاپیادہ، قُم سے تہران میں واقع سزائے موت کے عوامی میدان کی طرف چلے جا رہے ہیں - وہ شدید گرمی اور حبس کے موسم میں صحرائی راستے پر چل رہے ہیں، سپاہی پیچھے پیچھے اور زنجیر سے بندھا ہوا دُبلا قاتل اس

کے آگے آگے، جیسے کسی قدیم سرکس میں کام کرنے والا شخص اور اس کا سدھایا ہوا ریچھ گاؤں گاؤں گھوم کر اپنا پیٹ پال رہے ہوں۔ قاتل کبھی کبھی اپنے زخم خوردہ سر میں درد کی شکایت کرتا ہے، لیکن اکثر اوقات وہ خاموش رہتے ہیں، کیوں کہ ان کے پاس آپس میں بات کرنے کے لیے کوئی موضوع نہیں رہا ہے۔ قاتل قتل کر چکا ہے اور سپاہی اُسے سزائے موت کی جانب لیے جا رہا ہے۔ فارس انتہائی افلاس زدہ ملک ہے: یہاں ریل کی پٹریوں کا وجود نہیں، گھوڑوں کے زور سے چلنے والی گاڑیاں صرف اشرافیہ کے پاس ہیں، اس لیے ان دونوں کے پاس قانون اور فرمان کی متعیّن کی ہوئی دُور دراز منزل کی طرف پیدل چل کر جانے کے سوا کوئی راستا نہیں ہے۔ چلتے چلتے انھیں کچّے گھروں کی بستیاں ملتی ہیں جہاں خستہ حال دہقان گرد میں اَٹے ہوئے مسافروں کو گھیر لیتے ہیں۔ ''یہ کون ہے جسے آپ لے جا رہے ہیں؟'' وہ سپاہی سے مخاطب ہو کر ہچکچاتے ہوئے پوچھتے ہیں۔ ''کون؟'' سپاہی سوال دُہراتا ہے اور تجسس بڑھانے کے لیے ذرا دیر خاموش رہتا ہے۔ ''یہ،'' آخر کار وہ قیدی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے، ''شاہ کا قاتل ہے۔'' دادا کی آواز میں چھپائے نہ چھپنے والا فخر جھلک رہا ہے۔ دہقان قاتل کو دہشت اور تحسین کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ چوں کہ اس نے ایک بڑے آدمی کو قتل کیا ہے، اس لیے وہ خود بھی کسی نہ کسی طرح بڑا آدمی معلوم ہونے لگا ہے۔ اس کے جُرم نے اسے ایک اعلیٰ تر سطح پر پہنچا دیا ہے۔ دہقان فیصلہ نہیں کر پاتے کہ طیش کا اظہار کریں یا گھٹنوں کے بل جُھک جائیں۔ اس دوران میں سپاہی زنجیر کو راستے کے کنارے گڑے ہوئے ایک کھونٹے سے باندھ دیتا ہے، اپنے کندھے سے رائفل اتارتا ہے (جو اتنی لمبی ہے کہ جب اس کے کندھے پر لٹکی ہوئی ہو تو اس کا سرا زمین کو چھو لیتا ہے)، اور دہقانوں کو پانی اور کھانا لانے کا حکم دیتا ہے۔ وہ سر کھجانے لگتے ہیں۔ گاؤں میں کھانے کو قریب قریب کچھ نہیں ہے، کیوں کہ قحط زوروں پر ہے۔ ہمیں یہاں اس بات کا اضافہ کرنا چاہیے کہ سپاہی خود بھی اُنھیں کی طرح دہقان ہے اور اُنھیں کی طرح اس کے بھی گاؤں کا نام اس کے نام کا جُز ہے —— وہ خود کو سوادکوہی کہتا ہے —— لیکن اس کے پاس بندوق اور وردی ہے اور اسے شاہ کے قاتل کو سزائے موت کے میدان تک پہنچانے کے لیے منتخب کیا گیا ہے، اس لیے وہ اپنی اونچی حیثیت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے دہقانوں کو پانی اور کھانا لانے کا دوبارہ حکم دیتا ہے کیوں کہ وہ سخت بھوکا ہے، اور اس کے علاوہ، زنجیر میں بندھے ہوئے آدمی کو پیاس یا تھکن سے ہلاک ہونے نہیں دے سکتا۔ اگر ایسا ہو گیا تو تہران کے پُرہجوم چوک میں شاہ کے

قاتل کو سرعام پھانسی دینے کی تقریب کو منسوخ کرنا پڑے گا۔ سپاہی کی متواتر ڈانٹ ڈپٹ سے مجبور ہو کر دہقان وہ بچی کھچی غذا سامنے لا رکھتے ہیں جو اُن کے کام آ سکتی تھی: زمین میں سے کھودی ہوئی خشک جڑیں اور سکھائی ہوئی ٹڈیوں سے بھرا تھیلا۔ سپاہی اور قاتل سائے میں بیٹھ کر کھانے لگتے ہیں، بڑی اشتہا سے ٹڈیاں ایک ایک کر کے اپنے منہ میں ڈالتے ہیں، پَر باہر تھوک دیتے ہیں اور پانی پی کر حلق صاف کرتے ہیں، جبکہ دہقان خاموش رشک سے انھیں تکتے رہتے ہیں۔ جب شام قریب آنے لگتی ہے تو سپاہی سب سے بہتر جھونپڑی چُن کر اس کے مکینوں کو نکال باہر کرتا ہے اور اسے ایک عارضی قید خانے میں تبدیل کر لیتا ہے۔ وہ زنجیر کا ہاتھ میں پکڑا ہوا سِرا اپنے جسم کے گرد باندھ لیتا ہے، اور پھر، جلتے ہوئے سورج کی دھوپ میں گھنٹوں چلتے رہنے کی تھکن سے چُور ہو کر، دونوں آدمی، لال بیگوں کی وجہ سے سیاہ پڑی ہوئی کچّی زمین پر دراز ہو کر گہری نیند سو جاتے ہیں۔ صبح اُٹھ کر وہ پھر قانون اور فرمان کی متعین کی ہوئی منزل کی جانب، شمال کی سمت، تہران شہر کی طرف چلنے لگتے ہیں؛ اُسی ریگستان کو عبور کرتے ہوئے، قاتل کے سر پر اُسی طرح پٹّی بندھی ہوئی ہے، اس کی زنجیر لمبی دُم کی طرح اس کے پیچھے لٹک رہی ہے اور اس کا دوسرا سِرا سپاہی کے ہاتھ میں ہے، جو اُسی طرح بھدّی سلی ہوئی وردی پہنے ہوئے ہے، اور اس کے باہر کو نکلے ہوئے کانوں پر بڑی سی ٹوپی اسی مضحکہ خیز انداز میں ٹِکی ہوئی ہے کہ جب میں نے پہلی بار یہ تصویر دیکھی تو مجھے گمان ہوا کہ یہ سپاہی شوائیک کی تصویر ہے۔

فوٹوگراف ۲

اس میں ہمیں فارس کے قازق بریگیڈ کا ایک نوجوان افسر ایک مشین گن کے پاس کھڑا ہوا دکھائی دیتا ہے اور اس مہلک ہتھیار کے اصول اپنے ساتھیوں کو سمجھا رہا ہے۔ یہ ہتھیار میکسم گن کا ۱۹۱۰ کا ترقی یافتہ ماڈل ہے، جس کا مطلب ہے کہ اس فوٹوگراف کا تعلق اُسی سال سے ہے۔ نوجوان افسر، جس کا نام رضا خاں اور سنِ پیدائش ۱۸۷۸ ہے، اُسی سپاہی کا بیٹا ہے جو، بیس برس سے کم عرصہ ہوا، شاہ کے قاتل کو لے کر ریگستان کو پیدل عبور کر رہا تھا۔ اگر دونوں تصویروں کا موازنہ کریں تو ہمیں فوراً احساس ہو جاتا ہے کہ رضا خاں، اپنے باپ کے برعکس، لمبا تڑنگا، دیوہیکل آدمی ہے۔ اس کا قد اپنے ساتھیوں کے مقابلے میں کوئی بالشت بھر اونچا ہے، فراخ سینہ باہر کو نکلا ہوا ہے، اور وہ ایسا تگڑا شخص معلوم

ہوتا ہے جو گھوڑے کی نعل کو اپنے ہاتھوں کے زور سے آسانی کے ساتھ دو ٹکڑے کر سکتا ہے۔ وہ خاص فوجیوں کی سی چھب رکھتا ہے: سرد اور چیر دینے والی نگاہ، چوڑے اور مضبوط جبڑے، اور بھنچے ہوئے ہونٹ جن پر ہلکی سے ہلکی مسکراہٹ بھی امکان سے باہر ہے۔ اس کے سر پر بڑی سی سیاہ قراقلی ٹوپی رکھی ہے کیوں کہ وہ، جیسا کہ میں نے کہا، فارس کے قازق بریگیڈ سے تعلق رکھتا ہے (یہ اُس زمانے کے شاہِ ایران کی واحد فوج تھی) جس کی کمان زار کی فوج کے کرنل، سینٹ پیٹرز برگ کے رہنے والے وسیوولود لیاخوف کے ہاتھ میں ہے۔ کرنل لیاخوف کو پیدائشی فوجیوں سے دلی لگاو ہے، اور رضا خاں اس کا چہیتا ہے کیوں کہ ہمارا یہ نوجوان افسر پیدائشی فوجیوں میں مثالی حیثیت رکھتا ہے۔ بریگیڈ میں بھرتی ہونے کے وقت وہ ایک چودہ سالہ ناخواندہ لڑکا تھا (وہ اچھی طرح لکھنا پڑھنا کبھی نہ سیکھ سکا)، اور اپنی سعادت مندی، انضباط، قوتِ فیصلہ، فطری ذہانت اور اُس خصوصیت کی بدولت جسے فوج والے رہنمائی کی صلاحیت کہنا پسند کرتے ہیں، سپہ گری کے پیشے کے مدارج رفتہ رفتہ طے کرتا گیا۔ البتہ تیز رفتار ترقیاں اُسے ۱۹۱۷ کے بعد نصیب ہوئیں جب شاہ نے کرنل لیاخوف پر بالشویکوں سے ہمدردی کا غلط گمان کر کے اُسے واپس روس بھیج دیا۔ تب رضا خاں کرنل کے عہدے پر پہنچ گیا اور قازق بریگیڈ کی کمان اس کے ہاتھ میں آ گئی اور اسے جلد ہی انگریزوں نے اپنی عاطفت کے سائے میں لے لیا۔ ایک ضیافت میں برطانوی جنرل سر ایڈمنڈ آئرن سائیڈ پنجوں کے بل کھڑا ہو کر اپنا منھ رضا خاں کے کان تک لاتا ہے اور سرگوشی میں کہتا ہے: ''کرنل، تم جیسے شخص کے سامنے بےپناہ امکانات ہیں۔'' وہ دونوں باہر باغ میں چہل قدمی کے لیے چلے جاتے ہیں اور اس دوران جنرل باتوں باتوں میں فوجی انقلاب کی تجویز پیش کرتا ہے اور اس سلسلے میں برطانوی تائید کا اشارہ دیتا ہے۔ فروری ۱۹۲۱ میں رضا خاں اپنے بریگیڈ کی کمان کرتا ہوا تہران میں داخل ہوتا ہے، دارالحکومت کے سیاست دانوں کو گرفتار کر لیتا ہے (موسم نہایت سرد ہے، برف باری ہو رہی ہے؛ سیاست داں بعد میں اپنی کوٹھریوں میں سیلن اور برودت کی شکایت کرتے ہیں)، اور ایک نئی حکومت قائم کرتا ہے جس میں اس کی حیثیت پہلے پہل وزیرِ جنگ کی ہے لیکن جلد ہی وہ وزیرِاعظم کے عہدے پر پہنچ جاتا ہے۔ دسمبر ۱۹۲۵ میں فرماں دار مجلسِ آئینی (جو کرنل اور اس کے پہلو میں کھڑے ہوئے انگریزوں سے خوف زدہ ہے) قازق بریگیڈ کے کمانڈر کی بادشاہی کا اعلان کر دیتی ہے۔ آج کے بعد ہمارا نوجوان افسر — جو فوٹوگراف میں میکسم مشین گن کے ۱۹۱۰

کے ماڈل کے کام کرنے کے اصول اپنے ساتھیوں کو سمجھا رہا ہے، جنھوں نے روسی دہقانوں کی وضع کی پیٹی دار قمیصیں اور روئی بھری جیکٹیں پہن رکھی ہیں)-- شاہ رضا، شاہنشاہ، ظلِ سبحانی، نائبِ خدا اور مرکزِ کائنات کے القاب سے پہچانا جائے گا اور پہلوی خاندان کا بانی ہو گا جو، تقدیر کے فیصلے کے مطابق، اس سے شروع ہو کر اس کے بیٹے پر ختم ہو جائے گی، اور جیسی سرد صبح کو اس نے تاج اور تخت پر قبضہ کیا تھا، اس کا بیٹا، پچپن برس بعد، ایک ویسی ہی سرد صبح کو محل اور تہران دونوں سے رخصت ہو کر جیٹ طیارے کے ذریعے نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہو جائے گا۔

فوٹوگراف ۳

اگر کوئی باپ اور بیٹے کی ۱۹۲۶ کی اس تصویر کو غور سے دیکھے تو بہت کچھ سمجھ سکتا ہے۔ باپ کی عمر چھیالیس سال ہے اور بیٹے کی سات سال۔ ان دونوں کے درمیان تضاد ہر اعتبار سے نمایاں ہے: جسیم اور طاقت ور بادشاہ باپ کولھوں پر ہاتھ رکھے نہایت سنجیدہ اور مضبوط انداز میں کھڑا ہے، اور اس کے برابر میں ایک چھوٹا سا کمزور بچہ، گھبرایا ہوا، تابعداری سے اٹنشن کھڑا بمشکل اپنے باپ کی کمر تک پہنچ رہا ہے۔ انھوں نے ایک سی وردیاں اور ٹوپیاں پہن رکھی ہیں، ان کے جوتے اور پیٹیاں بھی یکساں ہیں، یہاں تک کہ ان کی جیکٹوں میں لگے ہوئے بٹنوں کی تعداد بھی برابر، یعنی چودہ، ہے۔ لباس کی یہ یکسانی باپ کے ذہن کی اختراع ہے جس کی خواہش ہے کہ اس کا بیٹا -- جو اس سے حددرجہ مختلف ہے-- ہر تفصیل میں بالکل اُس جیسا دکھائی دے۔ بیٹے کو باپ کی اس خواہش کا احساس ہے، اور طبعی طور پر کم زور اور ہچکچاہٹ کا شکار ہونے کے باوجود، وہ ہر قیمت پر اپنے مطلق العنان اور بےرحم باپ کا مثیل بننے کی کوشش کرے گا۔ اس لمحے سے دو مختلف فطرتیں بچے کی ذات میں بیک وقت پرورش پانے لگتی ہیں: ایک اس کی پیدائشی فطرت اور دوسری باپ سے ارث کی ہوئی فطرت جسے وہ اپنی ترقی کی شدید خواہش کے باعث رفتہ رفتہ اختیار کرنے لگتا ہے۔ آخرکار باپ کی فطرت اس پر اس حد تک تسلّط حاصل کر لیتی ہے کہ برسوں بعد، بادشاہ بننے پر، وہ خود بخود (لیکن اکثر موقعوں پر دانستہ) باپ کے طرزِ عمل کو دُہرانے لگتا ہے، اور اپنے اقتدار کے آخری دنوں میں باپ ہی کی طرح طاقت استعمال کرتا ہے۔ لیکن اس وقت، تصویر میں، باپ اپنی پیدائشی قوّت اور ولولے کے ساتھ اپنا اقتدار قائم کر رہا ہے۔ اُسے

ایک طرح کے مِشن کا شدید احساس ہے اور وہ جانتا ہے کہ کس مقصد کے لیے سر گرداں ہے -- اس کے اپنے بے رحم الفاظ میں، وہ جاہل رعایا کو کام پر لگانا چاہتا ہے اور ایک ایسی مضبوط جدید ریاست قائم کرنا چاہتا ہے جس کے خوف سے سب کا پیشاب نکل جائے۔ اس کے اطوار پرُوشیائیوں کی طرح آہنی اور غلام گیروں کی طرح سادہ ہیں۔ قدیم، غنودہ اور ناکارہ ایران (شاہ کے حکم پر فارس کا نام بدل کر ایران کر دیا گیا ہے) اپنی بنیادوں تک لرز جاتا ہے۔ شاہ ایک ہیبت ناک فوج کے قیام سے ابتدا کرتا ہے۔ فوج شاہ کو اپنی آنکھ کی پُتلی کی طرح عزیز ہے، اس کے اشتیاق کا مرکز ہے۔ فوج کو رقم کی کمی کبھی نہیں ہونی چاہیے۔ اس کو ہر چیز مہیا رہنی چاہیے۔ فوج ہی قوم کو جدید، منظّم اور فرماں بردار بنائے گی۔ ہر شخص اٹنشن ہو جائے! شاہ روایتی لباس کو ممنوع کرنے کا حکم جاری کرتا ہے۔ ہر شخص یوروپی وضع کے سوٹ پہنے! ہر شخص یوروپی ہیٹ لگائے! شاہ چادر پہننے پر پابندی لگا دیتا ہے۔ گلیوں میں پولیس والے سہمی ہوئی عورتوں کی چادریں کھینچ کر اتار دیتے ہیں۔ مشہد کی مسجدوں میں مومن احتجاج کرتے ہیں۔ وہ اپنا توپ خانہ بھیج کر مسجدوں کو ہموار کرا دیتا ہے اور باغیوں کو قتل کر دیتا ہے۔ وہ حکم جاری کرتا ہے کہ خانہ بدوش قبائلیوں کو مستقل طور پر بسنے پر مجبور کیا جائے۔ خانہ بدوش احتجاج کرتے ہیں۔ وہ اُن کے کنووں کے پانی کو زہر آلود کرا دیتا ہے اور اُنھیں بھوک پیاس سے ہلاک کرنے کی دھمکی دیتا ہے۔ خانہ بدوش احتجاج جاری رکھتے ہیں، وہ فوجی دستے بھیج کر بڑے بڑے علاقوں کو اُجاڑ بنا دیتا ہے۔ بے تحاشا خون بہتا ہے۔ وہ اُس انتہائی پسماندہ جانور، اونٹ، کی تصویریں کھینچنے پر پابندی لگا دیتا ہے۔ قُم میں ایک ملّا اپنے وعظ میں تنقیدی لہجہ اختیار کرتا ہے: شاہ خود اپنے ہاتھ میں قمچی لیے مسجد میں داخل ہوتا ہے اور ناقد ملّا کی پٹائی کرتا ہے۔ وہ شکایت میں آواز بلند کرنے والے آیت اللہ مدرّسی کو برسوں کے لیے قید میں ڈال دیتا ہے۔ لبرل لوگ اخباروں میں ڈرتے ڈرتے احتجاج کی آواز اُٹھاتے ہیں، شاہ اخبار بند کر کے اُنھیں قید کر دیتا ہے۔ اُن میں کئی ایک کو شاہ کے حکم سے ایک مینار میں چُنوا دیا جاتا ہے۔ جن لوگوں کو وہ سرکش سمجھتا ہے اُن پر روزانہ پولیس کے سامنے حاضر ہونے کی پابندی لگا دی جاتی ہے۔ ضیافتوں میں آئی ہوئی طبقۂ اشرافیہ سے تعلق رکھنے والی خواتین اس تُرش رُو، رسائی سے باہر شخص کی کڑی نگاہ کی تاب نہ لا کر بے ہوش ہو جاتی ہیں۔ رضا خاں آخر عمر تک اپنے دیہاتی بچپن اور فوجی بیرکوں میں گزری ہوئی جوانی کی اکثر عادتیں برقرار رکھتا ہے۔ وہ محل میں رہتا ہے مگر زمین پر سوتا ہے؛ ہمیشہ وردی پہنے رہتا ہے؛

اپنے سپاہیوں کے ساتھ ایک ہی برتن میں کھاتا ہے۔ بالکل سپاہیوں کی طرح! اس کے ساتھ ساتھ، اسے زمین اور دولت سے بڑی رغبت ہے۔ اپنے اقتدار کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے وہ تصوّر سے بڑھ کر دولت جمع کر لیتا ہے۔ وہ سب سے بڑا زمیندار، قریب قریب تین ہزار گاؤوں کا مالک اور ان میں بسنے والے ڈھائی لاکھ کسانوں کا خداوند بن جاتا ہے۔ وہ کارخانوں اور بینکوں کے حصص حاصل کرتا ہے، نذریں وصول کرتا ہے، دولت کو شمار کرتا ہے، اس کا حساب لگاتار رہتا ہے۔۔ کسی شان دار جنگل، سرسبز وادی، یا زرخیز زمین پر نظر پڑنے کی دیر ہے کہ وہ اس کی ہو جاتی ہے۔۔ جائیداد اور جاگیریں بڑھانے سے اس کی طبیعت کبھی سیر نہیں ہوتی۔ شاہ کی زمینوں کی سرحد کے قریب تک کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ شاہ کے حکم پر ایک فائرنگ اسکواڈ ایک گدھے کو ہلاک کرتا ہے جو، خبردار کرنے کی تمام تختیوں کو نظرانداز کرتا ہوا رضا خاں کی مِلک کی ایک چراگاہ میں جا گھسا تھا۔ آس پاس کے گاؤوں کے رہنے والوں کو یہ منظر دیکھنے کے لیے گھیر کر لے جایا جاتا ہے تاکہ ان میں اپنے مالک کی جائیداد کا احترام پیدا ہو۔ لیکن اس کے ظلم، ہوس اور عجیب اطوار سے قطع نظر، یہ بات شاہ اوّل کے حق میں جاتی ہے کہ اس نے ایران کو انتشار کے اُس خطرے سے نجات دلائی جو پہلی عالمی جنگ کے بعد اسے لاحق تھا۔ ملک کو جدید بنانے کی کوشش میں اس نے سڑکیں بنوائیں، ریل کی پٹریاں بچھوائیں، اسکول، دفاتر، ہوائی اڈّے، اور شہروں میں نئے سکونتی علاقے تعمیر کرائے۔ مگر قوم پہلے کی طرح مُفلس اور مُردہ دل رہی، اور رضا خاں کے مرنے پر شاداں ایرانی بہت دنوں تک خوشیاں مناتے رہے۔

فوٹوگراف ۴

یہ وہ تصویر ہے جو اپنے وقت میں دنیا بھر میں دیکھی گئی تھی: اسٹالن، روزویلٹ، اور چرچل، ایک وسیع برآمدے میں بڑی آرام کرسیوں پر بیٹھے ہیں۔ اسٹالن اور چرچل وردیوں میں ہیں، روزویلٹ نے گہرے رنگ کا سُوٹ پہن رکھا ہے۔ تہران، دسمبر کی ایک دھوپ بھری صبح، ۱۹۴۳۔ تصویر میں ہر شخص ہمارا دل بڑھانے کے لیے اپنے چہرے پر بُردباری طاری کیے ہوئے ہے: آخر ہم جانتے ہیں کہ تاریخ کی بدترین جنگ جاری ہے اور ان چہروں کا تاثر بہت اہمیت رکھتا ہے: اس تصویر کے لیے ہماری حوصلہ افزائی کرنا لازمی ہے۔ فوٹوگرافر اپنا کام ختم کرتے ہیں، اور تینوں عظیم شخصیتیں اٹھ کر ہال میں چلی جاتی ہیں تاکہ ایک مختصر

سی رازدارانہ گفتگو کرسکیں۔ روزویلٹ چرچل سے دریافت کرتا ہے کہ اِس ملک کے حکمراں، شاہ رضا کا کیا بنا (اگر، روزویلٹ اپنی بات میں اضافہ کرتا ہے، میں اس کا نام صحیح لے رہا ہوں)۔ چرچل اپنے کندھے اُچکاتا ہے اور جھجکتے ہوے بات کرتا ہے۔ شاہ ہٹلر کو سراہتا تھا اور اس نے اپنے گرد ہٹلر کے آدمی جمع کرلیے تھے۔ ایران میں ہر جگہ -- محل میں، وزارتوں میں، فوج میں -- جرمن ہی جرمن دکھائی دیتے تھے۔ ایب وہر نے تہران میں خاصی قوّت حاصل کرلی، اور شاہ اسے تائید کی نظر سے دیکھتا رہا۔ ہٹلر انگلستان اور روس سے جنگ کررہا تھا، اور ہمارا بادشاہ انگریزوں اور روسیوں کو برداشت نہ کرسکتا تھا؛ وہ فیوہرر کی افواج کی پیش قدمی پر مسرّت سے مغلوب ہو جاتا تھا۔ لندن کو ایرانی تیل کی فکر تھی جو برطانوی بحری بیڑے کا ایندھن تھا، اور روسیوں کو یہ تشویش تھی کہ جرمن ایرانی سرزمین میں داخل ہو کر بحیرۂ کیسپیئن کے پاس کے علاقے پر حملہ کردیں گے۔ لیکن سب سے زیادہ اہمیت ایران کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جانے والی ریلوے لائن کی تھی جو برطانویوں کو اسٹالن کی فوجوں تک خوراک اور اسلحہ پہنچانے کے لیے درکار تھی۔ اُس بحرانی لمحے میں، جب جرمن فوج کے ڈویژن مشرق کی طرف بڑھے چلے آرہے تھے، شاہ نے اتحادیوں کو ریلوے لائن استعمال کرنے کی اجازت دینے سے انکار کردیا۔ انھوں نے جواب میں فیصلہ کن اقدام کیا: اگست ۱۹۴۱ میں برطانوی اور سُرخ فوجیں ایران میں داخل ہو گئیں۔ شاہ نے یہ خبر ذاتی توہین اور شکست کے احساس کے ساتھ سنی کہ پندرہ ایرانی ڈویژنوں نے کسی خاص مزاحمت کے بغیر ہتھیار ڈال دیے۔ اس کے کچھ فوجی بھاگ کر گھروں کو چلے گئے اور باقیوں کو اتحادیوں نے ان کی بیرکوں میں بند کردیا۔ سپاہیوں سے محروم ہو کر شاہ کی کوئی اہمیت نہیں تھی، بلکہ اس کا کوئی وجود نہیں تھا۔ برطانویوں نے -- جو اپنے ساتھ دغا کرنے والے بادشاہوں تک کا احترام کرتے تھے -- شاہ کے لیے ایک باعزّت راستا تجویز کیا: کیا بادشاہ سلامت مہربانی فرما کر اپنے بیٹے، ولی عہد کے حق میں تخت سے دست بردار ہونا پسند کریں گے؟ ہم ان کے بارے میں اونچی رائے رکھتے ہیں اور یقین دلاتے ہیں کہ ان کی حیثیت کا تحفظ کیا جائے گا۔ شاہ رضامند ہو گیا، اور اُسی سال، ۱۹۴۱، کے ستمبر میں اس کے بیس سالہ فرزند محمد رضا پہلوی نے تاج و تخت سنبھال لیا۔ بوڑھا فرماں روا اب ایک عام شہری تھا، اور اپنی بالغ زندگی میں پہلی بار اس نے غیر فوجی لباس پہنا۔ انگریزوں نے اسے، جوہانس برگ، افریقا بھیج دیا (جہاں وہ تین برس تک بے رنگ آرام دہ زندگی گزار کر، جس کے بارے میں کھنے کے

لیے کوئی خاص بات نہیں ہے، چل بسا۔) سلطنت کی چیز تھی، سلطنت نے واپس لے لی۔

نوٹس ۱

مجھے احساس ہوتا ہے کہ چند تصویریں یا تو گم ہو گئی ہیں یا میں نے انھیں کہیں اِدھراُدھر رکھ دیا ہے۔ میرے پاس آخری شاہ کی جوانی کے اوائل کی کوئی تصویر نہیں ہے۔ میرے پاس ۱۹۳۹ کی تصویر نہیں ہے جب وہ تہران کے آفیسرز اسکول میں تعلیم حاصل کرتا تھا: اس کے باپ نے اُسے بیسویں سالگرہ پر جنرل کے عہدے پر ترقی دے دی تھی۔ میرے پاس اس کی پہلی بیوی فوزیہ کی تصویر نہیں ہے جس میں وہ دودھ میں نہا رہی ہے۔ ہاں، شاہ فاروق کی بہن اور بے حد حسین فوزیہ نے باقاعدہ دودھ میں غسل کیا تھا۔۔ لیکن شاہزادی اشرف نے، جو نوجوان شاہ کی جڑواں بہن، اور بعض لوگوں کی رائے میں اس کی شرانگیز ذہانت اور سیاہ ضمیر کا سرچشمہ تھی، اس دودھ میں کاسٹک ڈٹرجنٹ ملا دیا تھا: ایک اَور محلّاتی اسکینڈل! لیکن میرے پاس آخری شاہ کی ۱۶ ستمبر ۱۹۴۱ کی تصویر موجود ہے جب اس نے شاہ محمد رضا پہلوی کا لقب اختیار کر کے اپنے باپ کا تخت سنبھالا۔ اپنے چھریرے بدن پر تقریباتی فوجی لباس پہنے اور پہلو میں تلوار لگائے، وہ پارلیمان کے ایوان میں کھڑا اور ایک کاغذ ہاتھ میں لیے حلف کا متن پڑھ رہا ہے۔ یہ تصویر شاہ کے اعزاز میں جاری ہونے والی تمام یادگاری البموں میں شامل کی جاتی تھی، اور ایسی البمیں سینکڑوں نہیں تو بیسیوں کی تعداد میں ہیں۔ اسے اپنے بارے میں کتابیں پڑھنے اور اپنے اعزاز میں جاری کی گئی البموں کی ورق گردانی کرنے سے بہت رغبت تھی۔ اسے اپنے مجسموں اور روغنی تصویروں کی نقاب کشائی کرنے کا بہت شوق تھا۔ شاہ کی شبیہ پر نظر پڑنا ناگزیر تھا۔ آنکھیں بند کر کے کہیں بھی کھڑے ہو جانا اور پھر آنکھیں کھول دینا اس کے لیے کافی تھا: شاہ ہر جگہ موجود تھا۔ چوں کہ دراز قد شاہ کا نمایاں ترین وصف نہیں تھا، اس لیے فوٹوگرافر ہمیشہ ایسے زاویے سے تصویر لیتے تھے کہ وہ تمام لوگوں میں سب سے اونچا دکھائی دے۔ وہ خود بھی اس التباس کو موٹے تلے کے جوتے پہن کر تقویت دیتا تھا۔ اس کی رعایا اس کے جوتوں کو بوسہ دیتی تھی۔ میرے پاس اس منظر کی ایک تصویر موجود ہے جس میں لوگ اس کے آگے سجدہ ریز ہیں اور اس کے موٹے تلے کے جوتوں کو بوسہ دے رہے ہیں۔ دوسری طرف میرے پاس ۱۹۴۹ سے تعلق رکھنے والی وہ تصویر نہیں ہے جس میں اس کی ایک خاص وردی دکھائی گئی ہے۔

گولیوں سے چھدی اور خون میں لتھڑی ہوئی اس وردی کو تہران کے آفیسرز کلب میں کانچ کے ایک کیس میں نمائش کے لیے رکھا گیا تھا۔ یہ وردی اُس وقت شاہ کے جسم پر تھی جب فوٹوگرافر کے بھیس میں ایک نوجوان آدمی نے اپنے کیمرے میں چھپائی ہوئی بندوق سے اس پر کئی گولیاں چلا کر اسے شدید زخمی کر دیا تھا۔ اس پر پانچ بار قاتلانہ حملہ کیا گیا۔ اس طرح اس کے گرد خطرے کا ماحول چھا گیا (جو آخرکار حقیقی ثابت ہوا) اور ہر جگہ پولیس کے حفاظتی گھیرے میں رہنے لگا۔ ایرانی اس بات پر آزردہ رہتے تھے کہ بعض تقریبات میں، جن میں شاہ موجود ہوتا، حفاظت کے خیال سے، صرف غیر ملکیوں کو مدعو کیا جاتا تھا۔ شاہ کے ہم وطن طنز کے ساتھ کہا کرتے کہ چوں کہ وہ ہمیشہ طیارے یا ہیلی کاپٹر میں سفر کرتا ہے اس لیے اس نے اپنے ملک کو صرف بلندی سے دیکھا ہے جہاں سے دیکھنے پر تمام خدوخال مٹ جاتے ہیں۔ میرے پاس خمینی کی ابتدائی برسوں کی کوئی تصویر نہیں ہے۔ وہ میرے تصویرخانے میں عمررسیدہ صورت ہی میں ظاہر ہوتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ کبھی جوان یا ادھیڑ عمر کا نہیں رہا۔ بعض مقامی مذہبی انتہاپسند اسے بارھواں امام، امامِ منتظر، خیال کرتے ہیں جو نویں صدی میں غائب ہونے کے گیارہ سو برس بعد انھیں بدبختی اور ظلم سے نجات دلانے کے لیے واپس آیا ہے۔ تصویروں میں اس کے معمّر نظر آنے کو بھی اس عقیدے کی تائید سمجھا جا سکتا ہے۔

فوٹوگراف ۵

یہ بلاشبہ ڈاکٹر مصدّق کی طویل زندگی کا اہم ترین دن ہے۔ وہ پُرجوش ہجوم کے کندھوں پر سوار، پارلیمان سے باہر نکل رہا ہے۔ وہ مسکراتے ہوئے، بازو لہرا کر ہجوم کو مبارک باد دے رہا ہے۔ تین دن پہلے، ۲۸ اپریل 1951 کو، اس نے وزیراعظم کا عہدہ سنبھالا تھا اور آج پارلیمان نے ملک کے تیل کو قومی ملکیت میں لینے کا بِل منظور کر لیا ہے۔ ایران کا عظیم ترین خزانہ اب قوم کی ملکیت ہے۔ ہمیں اُس دور کے جذبے کو محسوس کرنے کی شعوری کوشش کرنی پڑے گی، کیوں کہ اس کے بعد سے دنیا بہت کچھ تبدیل ہو چکی ہے۔ اُن دنوں میں اس قسم کے اقدام کی جسارت کرنا جیسا ڈاکٹر مصدّق نے ابھی ابھی انجام دیا ہے، واشنگٹن یا لندن پر اچانک اور غیر متوقع طور پر بم گرا دینے کے مترادف تھا۔ اس کا نفسیاتی اثر بھی ایسا ہی تھا: صدمہ، خوف، غصہ، طیش۔ ایران میں کسی مقام پر ایک بوڑھے وکیل نے، جو کوئی نیم بُخت نظریہ باز معلوم ہوتا ہے، سلطنت کے ستون اینگلوایرانین آئل کمپنی

کو تاراج کر دیا ہے! ناقابلِ یقین، ناقابلِ معافی! اُن برسوں میں نو آبادیاتی ملکیت کا احترام ایک مقدّس قدر تھی، جس پر نگاہ ڈالنا تصوّر سے باہر کی بات تھی۔ لیکن اس روز، جس کی مسرّت سے مغلوب کیفیت لوگوں کے چہروں سے جھلک رہی ہے، ایرانیوں کو احساس نہیں ہے کہ ان سے ایسے جرم کا ارتکاب ہوا ہے جس کی انھیں سخت دردناک سزا بھگتنی پڑے گی۔ اس وقت تو پورا تہران اپنے غیر ملکی اور نفرت انگیز ماضی سے رہائی پانے کے عظیم دن کے ایک ایک پُر مسرّت گھنٹے کو جی رہا ہے۔ نفت خونِ ماست! (تیل ہمارا خون ہے!) ہجوم جوش سے نعرے لگا رہا ہے۔ نفت حقِ ماست! (تیل ہمارا حق ہے!) محل بھی عوام کے احساس میں شریک ہے، اور شاہ پارلیمان کے ایکٹ پر دستخط کر دیتا ہے۔ یہ ایسا لمحہ ہے جب سب لوگ ایک دوسرے کے بھائی ہو گئے ہیں، یہ نادر لمحہ بہت جلد ایک یاد میں تبدیل ہو جانے والا ہے کیوں کہ قومی خاندان کا اتحاد بے حد عارضی ہے۔ مصدّق کے تعلقات پہلوی باپ اور بیٹے سے کبھی اچھے نہیں رہے۔ مصدّق کے خیالات کا منبع فرانسیسی کلچر تھا: وہ لبرل اور ڈیموکریٹ تھا، پارلیمنٹ اور آزاد پریس جیسے اداروں پر یقین رکھتا تھا اور اپنے وطن کی بےچارگی پر کُڑھا کرتا تھا۔ رضا خاں کے زوال نے اسے اور اس جیسے دوسرے لوگوں کو ایک عظیم موقع فراہم کیا۔ اس اثنا میں نوجوان شاہ کی دل چسپی سیاست سے زیادہ خوش وقتی اور اسپورٹس میں ہے، اس لیے ایران میں جمہوریت اور آزادی کے لیے ایک سنہری موقع ہے۔ مصدّق کی قوّت اتنی بڑھی اور اس کے نعرے اتنے مقبول ہیں کہ شاہ کی اہمیت ثانوی ہو کر رہ جاتی ہے۔ وہ سَوکر کھیلتا ہے، اپنا ذاتی طیارہ اڑاتا ہے، نقاب پوش دعوتوں کا اہتمام کرتا ہے، طلاقیں دیتا اور شادیاں کرتا ہے، اور اِسکی اِنگ کے لیے سوئٹزرلینڈ جاتا ہے۔

فوٹوگراف ۶

شاہ اپنی نئی بیوی ثریّا اسفندیاری کے ساتھ روم میں۔ لیکن یہ ہنی مون نہیں ہے، نہ روزمرّہ زندگی کی اُکتاہٹ اور فکروں سے دور لے جانے والا خوش دلانہ ایڈونچر ہے: نہیں، یہ ان دونوں کی جلاوطنی کا زمانہ ہے۔ اس باقاعدہ کھنچوائی ہوئی تصویر تک میں چونتیس سالہ بادشاہ (سنولایا ہوا، ہلکے رنگ کے ڈبل بریسٹ سوٹ میں ملبوس) اپنی فکرمندی کو چھپا نہیں پا رہا -- اور یہ تعجب کا مقام نہیں، کیوں کہ وہ نہیں جانتا کہ جس تخت کو وہ عجلت میں چھوڑ آیا ہے وہ دوبارہ اس کے ہاتھ آئے گا یا اسے جلاوطن کے طور پر دیس دیس بھٹکتے ہوئے اپنی باقی

زندگی بسر کرنی ہوگی۔ نمایاں مگر سرد حسن کی مالک ثریا، جو بختیار قبیلے کے سردار اور ایران میں بس جانے والی ایک جرمن عورت کی بیٹی ہے، خود پر نسبتاً زیادہ کامیابی سے قابو رکھے ہوئے ہے: اس کے چہرے سے کسی تاثر کا بمشکل اظہار ہوتا ہے، خاص طور پر اس لیے بھی کہ اس نے اپنی آنکھیں سیاہ چشمے کے پیچھے چھپا رکھی ہیں۔ وہ گزشتہ روز، یعنی ۱۷ اپریل ۱۹۵۳ کو، اپنے وطن سے اپنے نجی طیارے میں یہاں پہنچے ہیں (طیارہ شاہ نے خود اُڑایا؛ طیارہ اڑانا اس کے لیے ہمیشہ سکون کا باعث ہوتا ہے)، اور عالی شان ہوٹل ایکسلسیئر میں ٹھہرے ہیں جہاں خبر نگاروں کا ایک جمِ غفیر شاہ اور ملکہ کی موجودگی کے ایک ایک لمحے کو ابدیت بخشنے کے لیے جمع ہے۔ گرما کے اس ٹورسٹ سیزن میں روم سیاحوں سے بھرا ہوا ہے اور ساحلِ سمندر پر تل رکھنے کی جگہ نہیں ہے (بکنی کا فیشن ابھی شروع ہی ہو رہا ہے)۔ یوروپ آرام کرنے، چھٹیاں منانے، سیر کرنے، اچھے ریستورانوں میں عمدہ کھانا کھانے، پہاڑوں پر ہائکنگ کرنے، خیمے گاڑنے اور آنے والے خنک موسمِ خزاں اور برف آلود سرما کے واسطے توانائی جمع کرنے میں مشغول ہے۔ لیکن اس دوران تہران کو سکون یا تعطیل کا ایک لمحہ بھی میسّر نہیں کیوں کہ ہر شخص بارود کی بُو سونگھ رہا ہے اور چُھریوں پر دھار رکھے جانے کی آواز سن رہا ہے۔ ہر شخص کہہ رہا ہے کہ کچھ ہونے والا ہے، بہت جلد کچھ ہوگا (ہر شخص دھماکے سے کچھ پہلے کی بوجھل ہوتی ہوئی ہوا کا دباو محسوس کر رہا ہے)، لیکن صرف چند لوگ، جو سازش میں شریک ہیں، یہ جانتے ہیں کہ جو کچھ ہونا ہے وہ کس کے ہاتھوں اور کس طرح شروع ہوگا۔ ڈاکٹر مصدّق کا دو سالہ دورِ اقتدار اپنے خاتمے پر ہے۔ بغاوت کے مستقل خطرے کا شکار (ڈیموکریٹ، شاہ کے لوگ اور مذہبی جنونی، سب اس کے خلاف سازشوں میں مصروف ہیں)، وہ اپنا بستر اور پاجاموں سے بھرا ہوا بریف کیس (وہ پاجامہ پہن کر کام کرنے کا عادی ہے) اور دواؤں کا تھیلا لے کر پارلیمان کی عمارت میں منتقل ہو گیا ہے جہاں وہ خود کو اپنی دانست میں محفوظ محسوس کرتا ہے۔ وہ وہیں رہتا اور کام کرتا ہے، کبھی وہاں سے باہر نہیں نکلتا۔ وہ اس قدر دل شکستہ ہو چکا ہے کہ اس سے ملاقات کرنے والے ہمیشہ اس کے آنسوؤں کا تذکرہ کرتے ہیں۔ اس کی تمام امیدیں خاک میں مل چکی ہیں، تمام تخمینے غلط ثابت ہوئے ہیں۔ اس نے تیل کے کنووں پر سے انگریزوں کو ہٹا دیا ہے، کیوں کہ ہر قوم کو اپنے وسائل پر پورا حق حاصل ہے، لیکن وہ یہ بات بھول گیا کہ حق کا فیصلہ طاقت سے ہوتا ہے۔ مغرب ایران کی ناکابندی کا اور ایران کے تیل کے بائیکاٹ کا اعلان کر دیتا ہے اور ایرانی تیل عالمی منڈی میں

ممنوعہ پھل کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ شاہ فیصلہ کرنے میں تذبذب کا شکار ہے: کیا اسے محل کے مقرب ترین افسروں کی بات مان لینی چاہیے جو اسے بادشاہی اور فوج کو بچانے کے لیے مصدّق کو ختم کرنے کا مشورہ دیتے ہیں؟ وہ بہت عرصے تک وزیرِاعظم سے اپنے کم زور رشتے منقطع کرنے کا آخری قدم نہیں اٹھا پاتا (وہ دونوں ایسی کشمکش میں اُلجھے ہوئے ہیں کہ ان کے درمیان سمجھوتا ممکن نہیں ہے، کیوں کہ یہ دو اصولوں کا تضاد ہے: شاہ کی مطلق العنانی اور مصدّق کی جمہوریت کا تضاد)، اور شاید شاہ اس اقدام کو اس لیے ٹال رہا ہے کہ وہ بوڑھے ڈاکٹر کے لیے احترام کا جذبہ محسوس کرتا ہے، یا شاید اپنی بےدرنگ اقدام کرنے کی صلاحیت پر اعتماد نہ رکھنے کی وجہ سے وہ مصدّق سے کھلی جنگ کرنے کی ہمت نہیں کر پاتا۔ شاہ یقیناً اس بات کو ترجیح دے گا کہ یہ دردناک بلکہ وحشیانہ کام اس کے بدلے کوئی اَور کر دے۔ اسی ہچکچاہٹ اور متواتر تشویش میں مبتلا، وہ بحیرۂ کیسپیئن کے کنارے رمسر کے مقام پر اپنی گرمائی قیام گاہ پر چلا جاتا ہے اور وہاں آخرکار مصدّق کی برطرفی کے حکم نامے پر دستخط کر دیتا ہے۔ لیکن جب معلوم ہوتا ہے کہ مصدّق کو ختم کرنے کی اس پہلی کوشش کا راز کھل گیا اور اس کوشش میں شاہی محل کو ناکامی اٹھانی پڑی تو شاہ مزید واقعات کا (جو دراصل اس کے حق میں ہیں) انتظار نہیں کرتا اور اپنی نئی بیوی کے ساتھ فرار ہو کر روم چلا جاتا ہے۔ اس کی تہران واپسی چند ہفتے بعد ہوتی ہے جب فوج مصدّق کو معزول کر کے تمام اختیارات شاہ کو سونپ دیتی ہے۔

کیسٹ ۱

ہاں بالکل، آپ ریکارڈ کر سکتے ہیں۔ اب اُس کا ذکر ممنوع نہیں رہا۔ پہلے ممنوع تھا۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ پچیس سال تک اس کا نام برسرِعام لینے پر پابندی تھی؟ کہ "مصدّق" نام کو تمام کتابوں سے، پوری تاریخ سے نکال دیا گیا تھا؟ اور ذرا سوچیے: آج نوعمر لوگ، جن کے بارے میں فرض کیا گیا تھا کہ انھیں اُس کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں، اُس کی بڑی بڑی تصویریں ہاتھوں میں اٹھائے اپنی موت کا سامنا کرتے ہیں۔ اس سے آپ کو اس بات کا ثبوت مل سکتا ہے کہ تاریخ سے کسی کو نکالنا اور تاریخ کو ازسرِنو تحریر کرنا کن نتائج کا سبب بنتا ہے۔ لیکن یہ بات شاہ کی سمجھ میں نہیں آئی۔ وہ نہیں سمجھ سکا کہ آپ کسی شخص کو مار ضرور سکتے ہیں، لیکن مار دینے سے اُس کا وجود ختم نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کے برعکس، میں تو

کھوں گا کہ اُس کا وجود اَور زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ آمروں کو ایسی ہی عجیب و غریب باتوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ درانتی گھومتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ گھاس دوبارہ اُگنے لگتی ہے۔ دوبارہ کاٹیں تو اَور بھی زیادہ تیزی سے بڑھنے لگتی ہے۔ یہ فطرت کا بڑا اطمینان بخش قانون ہے۔ مصدّق! انگریزوں نے اُس کا نام "اولڈ موسی" رکھ دیا تھا۔ اُس نے اُنھیں پاگل کر دیا تھا، مگر پھر بھی وہ ایک طرح سے اُس کی عزت کرتے تھے۔ کسی انگریز نے اس پر کبھی بندوق نہیں اٹھائی۔ آخر کار ہمارے ہی وردی پوش غنڈوں کو طلب کرنا پڑا۔ اور انھیں اپنی قسم کا انتظام نافذ کرنے میں چند دنوں سے زیادہ وقت نہیں لگا! مصدق تین برس کے لیے جیل چلا گیا۔ پانچ ہزار لوگ دیوار کے ساتھ کھڑا کر کے یا گلیوں میں مار دیے گئے -- یہ شاہی کو بچانے کی قیمت تھی۔ ایک غم ناک، خون آلود اور غلیظ واپسی۔ آپ پوچھتے ہیں کہ کیا شکست مصدّق کا مقدّر تھی؟ اس کو شکست نہیں ہوئی۔ وہ جیت گیا۔ ایسے شخص کو لوگوں کے حافظے سے مٹایا نہیں جا سکتا؛ اسے عہدے سے معزول کیا جا سکتا ہے لیکن تاریخ سے باہر نہیں نکالا جا سکتا۔ حافظہ ایک ذاتی متاع ہے جس تک کسی حکومت کا ہاتھ نہیں پہنچ سکتا۔ مصدّق نے کہا تھا کہ جس زمین پر ہم چلتے ہیں وہ ہماری ہے اور اس زمین سے جو کچھ پیدا ہوتا ہے وہ بھی ہمارا ہے۔ اس ملک میں کسی نے کبھی یہ بات اتنے واضح طور پر نہیں کہی تھی۔ اس نے یہ بھی کہا: ہر شخص کو بات کرنے دو -- میں سب کی رائے جاننا چاہتا ہوں۔ کیا آپ اس بات کا مطلب سمجھتے ہیں؟ ڈھائی ہزار سال تک جبر کے پیروں تلے روندے جانے والے ایرانی کی طرف اشارہ کر کے اُس نے کہا کہ تم سوچنے والے وجود ہو۔ کسی حکمراں نے کبھی ایسا نہیں کیا تھا! لوگوں کو مصدّق کی باتیں یاد رہیں۔ یہ باتیں ان کے ذہنوں میں محفوظ رہیں اور آج تک زندہ ہیں۔ جو لفظ دنیا کے مقابل ہماری آنکھیں کھول دیتے ہیں انھیں یاد رکھنا سب سے آسان کام ہے۔ ان لفظوں کا بھی یہی معاملہ تھا۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ مصدّق نے جو کچھ کہا اور کیا وہ غلط تھا؟ آج ہر کوئی کہتا ہے کہ اُس کی بات درست تھی، مگر مشکل یہ تھی کہ اس نے یہ درست بات وقت آنے سے بہت پہلے کہہ دی۔ وقت آنے سے پہلے درست بات کہنا آپ کے اقتدار، بلکہ آپ کی زندگی کے لیے بھی خطرناک ہو سکتا ہے۔ سچ کے پھل کو پکنے میں بہت وقت لگتا ہے، اور اس عرصے میں لوگ مصیبتیں جھیلتے اور لاعلمی میں غلطیاں کرتے رہتے ہیں۔ لیکن اچانک ایک شخص آ کر وقت سے پہلے یہ سچی بات کہہ دیتا ہے، اس سے پہلے کہ یہ بات اپنی جڑیں اچھی طرح جما سکے، اور حکمراں قوتیں اس گستاخ کو پکڑ کر زندہ جلا دیتی ہیں یا قید کر دیتی

ہیں یا پھانسی پر چڑھا دیتی ہیں کیوں کہ اس نے ان کے مفادات پر ضرب لگائی یا ان کے سکون میں خلل ڈالا۔ مصدق شاہی آمریت اور غیر ملکی استبداد کے سامنے آکھڑا ہوا۔ آج شاہیاں ایک ایک کر کے زمیں بوس ہو رہی ہیں اور استبداد کو ہزار طرح کے بھیس بدلنے پڑتے ہیں کیوں کہ اس کی شدید مخالفت شروع ہو جاتی ہے۔ لیکن وہ تیس سال پہلے ہی اس کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا، جب یہاں کوئی بھی اتنی سادہ باتیں کہنے کی ہمت نہیں کرتا تھا۔ میں نے اُسے موت سے تین ہفتے پہلے دیکھا تھا۔ یہ کب کی بات ہے؟ غالباً فروری ۱۹۶۷ کی۔ اس نے اپنی زندگی کے آخری دس سال تہران کے باہر ایک چھوٹے سے فارم پر نظر بندی میں گزارے تھے۔ ظاہر ہے، اس سے ملنا ممنوع تھا، اور پولیس اس پورے علاقے کی نگرانی کرتی تھی۔ لیکن اس ملک میں اگر آپ کے پاس پیسہ ہے اور آپ صحیح لوگوں سے واقف ہیں تو ہر چیز کا بندوبست ہو سکتا ہے۔ پیسہ ہر آہنی قانون کو ربربینڈ بنا دیتا ہے۔ مصدق کی عمر اُس وقت نوّے برس کے لگ بھگ رہی ہو گی۔ میرا خیال ہے وہ اتنے طویل عرصے تک اس خواہش پر زندہ رہا کہ وہ وقت دیکھ سکے جب زندگی اس کی بات کو درست ثابت کر دے۔ وہ ایک سخت آدمی تھا، دوسروں کے لیے سخت، کیوں کہ اس نے کبھی جُھکنا نہیں چاہا۔ لیکن ایسے آدمی اگر چاہیں بھی تو جھک نہیں سکتے۔ آخر وقت تک اُس کی فکر واضح تھی اور وہ بالکل ٹھیک جانتا تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ مگر اسے چلنے پھرنے میں بہت دشواری ہوتی تھی اور لاٹھی کا سہارا لینا پڑتا تھا۔ تھوڑا سا چل کر وہ تھک جاتا اور آرام کرنے کے لیے زمین پر لیٹ جاتا۔ بعد میں اُس کی نگرانی کرنے والی پولیس نے بتایا کہ ایک صبح وہ اسی طرح چہل قدمی کر رہا تھا اور چلتے چلتے تھک کر زمین پر لیٹ گیا تھا، مگر وہ بہت زیادہ دیر تک لیٹا رہا اور جب وہ اس کے پاس پہنچے تو انھیں صاف معلوم ہو گیا کہ وہ مر چکا ہے۔

نوٹس ۲

تیل سے غیر معمولی جذبے اور امیدیں بیدار ہو جاتی ہیں، کیوں کہ تیل سب سے بڑھ کر ایک بہت بڑی ترغیب ہے۔ یہ آسائش، دولت، طاقت، خزانے اور اقتدار کی ترغیب ہے۔ یہ ایک غلیظ، بدبودار مائع ہے جو زمین سے قوت کے ساتھ نکل کر فوارے کی طرح فضا میں بلند ہوتا ہے اور پھر دولت کی بارش کی طرح دوبارہ زمین پر آ گرتا ہے۔ تیل کا ذخیرہ دریافت کرنا اور اس کا مالک ہو جانا بالکل ایسا ہے جیسے زیرِ زمین سُرنگ میں بہت دیر بھٹکنے

کے بعد کسی کو کوئی شاہی خزانہ ہاتھ آجائے۔ یہ خزانہ نہ صرف اسے مالدار کر دیتا ہے بلکہ اس کے دل میں یہ عارفانہ احساس بھی ڈال دیتا ہے کہ کسی برتر قوّت نے اس پر مہربانی کی نگاہ کی ہے اور اسے اپنا چہیتا بنا کر دوسروں سے بلند کر دیا ہے۔ بہت سے فوٹوگراف اُس لمحے کو محفوظ کیے ہوئے ہیں جب تیل کے کنویں سے پہلا فوّارہ بلند ہوا تھا: لوگ مسرّت سے اُچھل رہے ہیں، ایک دوسرے سے لپٹ رہے ہیں، رو رہے ہیں۔ تیل ایک بالکل بدلی ہوئی زندگی کا التباس پیدا کرتا ہے، بغیر محنت کی زندگی، مُفت کی زندگی۔ تیل ایک ایسا وسیلہ ہے جو سوچنے کی صلاحیت کو سُن کر دیتا ہے، نظر کو دُھندلا دیتا ہے، انسان کو مسخ کر دیتا ہے۔ غریب ملکوں کے لوگ سوچنے لگتے ہیں: خدایا! کاش ہمارے ہاں بھی تیل نکل آئے! تیل کا تصوّر انسان کے اُس ابدی خواب کا اظہار ہے جس میں وہ خون پسینے اور محنت کے بجائے خوش قسمتی کے ایک حادثے کی بدولت راتوں رات مالامال ہو جاتا ہے۔ اس لحاظ سے تیل پریوں کی کہانیوں کی طرح ہے، اور پریوں کی کہانیوں ہی کی طرح اس میں جھوٹ کا سا عنصر شامل ہے۔ تیل ہمیں ایسے تکبّر میں مبتلا کر دیتا ہے کہ ہم سمجھنے لگتے ہیں کہ ہمارے لیے وقت جیسی ناقابلِ عبور رکاوٹ کو بھی عبور کرنا ممکن ہو گیا ہے۔ آخری شاہ کہا کرتا تھا: تیل کی مدد سے مَیں ایک نسل کی زندگی کے عرصے میں دوسرے امریکا کی تخلیق کروں گا! وہ اس امریکا کو کبھی تخلیق نہ کر سکا۔ تیل، طاقت کا سرچشمہ ہونے کے باوجود، اپنے نقائص رکھتا ہے۔ یہ فکر یا دانائی کا متبادل نہیں ہو سکتا۔ حکمرانوں کے لیے اس کی دلکش ترین خصوصیت یہ ہے کہ یہ اقتدار کو مضبوط کرتا ہے۔ تیل سے، ہزاروں افراد کو کام پر لگائے بغیر، بے پناہ منافع حاصل ہوتا ہے۔ تیل سے سماجی مسائل پیدا نہیں ہوتے کیوں کہ اس سے نہ تو بہت بڑی پرولتاریہ جنم لیتی ہے اور نہ بورژوازی۔ اس طرح حکومت اس منافعے میں کسی کو شریک کرنے پر مجبور نہیں ہوتی اور اسے اپنے خیالات اور خواہشات کے مطابق خرچ کر سکتی ہے۔ تیل پیدا کرنے والے ملکوں کے تیل کے وزیروں کو دیکھیے: اُن کا سر کیسا فضا میں بلند ہوتا ہے، اُن میں قوّت کی کیسی سرشاری ہوتی ہے، وہ توانائی کے دیوتا ہیں جن کے ہاتھ میں اس بات کا فیصلہ ہے کہ کل ہماری گاڑیاں چلیں گی یا ہم پیدل گھوم رہے ہوں گے۔ اور تیل کا مسجد سے تعلّق؟ اس نئی دولت نے اپنے مذہب اسلام کو کیسی سربلندی، کیسا وقار عطا کیا ہے، جو ایک بار پھر تیز رفتاری سے پھیلنے لگا ہے اور نئے ماننے والے اس میں جوق در جوق شامل ہو رہے ہیں۔

نوٹس ۳

وہ کہتا ہے کہ بعد میں شاہ کے ساتھ جو واقعات پیش آئے وہ بنیادی طور پر مخصوص ایرانی نوعیت کے تھے۔ تاریخ کی ابتدا سے ہر فرماں روا کو دردناک اور شرمناک انجام سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ وہ سر قلم کیے جانے سے یا پُشت میں خنجر کے وار سے ہلاک ہوئے یا ان میں سے جو خوش قسمت تھے انھیں ملک سے فرار ہو کر جلاوطنی، گمنامی اور فراموشی کے عالم میں موت کا سامنا کرنا پڑا۔ اُسے یاد نہیں ہے، اگرچہ ایسی مستثنیات رہی ہوں گی جب کسی بادشاہ کو تخت پر برقرار رہتے ہوئے، عزّت اور محبّت کے ماحول میں فطری موت نصیب ہوئی ہو۔ اُسے یاد نہیں کہ قوم کسی فرماں روا کے مرنے پر روئی ہو اور اسے آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ اس کی قبر تک پہنچایا ہو۔ پچھلی صدی میں تمام بادشاہ -- اور ان کی تعداد خاصی تھی -- ناخوشگوار حالات میں اپنے تخت و تاج اور زندگی سے محروم ہوئے۔ لوگوں نے انھیں عفریتوں کے طور پر یاد کیا، اُن کی سِفلگی پر لعنت بھیجی، انھیں بددعاؤں اور گالیوں کے ساتھ رخصت کیا اور ان کے مرنے کی خبر کو خوشی کے موقعوں کی طرح منایا۔

بے شک، وہ کہتا ہے، ہمیں سائرس اور عبّاس جیسے عمدہ بادشاہ بھی نصیب ہوئے، لیکن یہ بہت پرانی بات ہے۔ آخری دو خاندانوں نے تخت حاصل کرنے یا اپنے قبضے میں رکھنے کے لیے بے تحاشا معصوم خون بہایا۔ شاہ آغا محمّد خاں کا ذرا تصوّر کرو جو شہر کرمان کی تمام آبادی کو، کسی استثنیٰ کے بغیر، قتل کرنے یا ان کی آنکھیں پھوڑ دینے کا حکم صادر کرتا ہے۔ اس کے عمّال فوراً دل جمعی سے اس حکم کی تعمیل میں جُٹ جاتے ہیں۔ وہ شہر کے تمام باشندوں کو قطار میں کھڑا کر کے جوانوں کے سر قلم کرنا اور بچّوں کی آنکھیں نکالنا شروع کر دیتے ہیں۔ آخر کار، تھوڑی تھوڑی دیر بعد آرام کا وقفہ کرنے کے باوجود، وہ سب تھکن سے اتنے بے حال ہو جاتے ہیں کہ اپنی تلواروں اور چاقوؤں کو مزید حرکت نہیں دے سکتے۔ صرف اس تھکن کی وجہ سے باقی آبادی کے سر اور آنکھیں سلامت رہ جاتی ہیں۔ بعد میں اندھے بچّوں کے جلوس شہر چھوڑ چھوڑ کر نکلنے لگتے ہیں۔ ان میں سے بہت سے بچّے دیہات میں بھٹکتے ہوئے، ریگستان میں راہ کھو بیٹھتے ہیں اور پیاس سے ہلاک ہو جاتے ہیں۔ کچھ ٹولیاں آباد بستیوں میں جا نکلتی ہیں اور کرمان کے قتلِ عام کے بارے میں گیت گا گا کر کھانا مانگنے لگتی ہیں۔ اُن دنوں میں خبریں پھیلنے کی رفتار سُست ہے، اس لیے لوگ ان برہنہ پا، نابینا بچّوں کی زبانی سر سراتی ہوئی تلواروں اور اُڑتے ہوئے سروں کا گیت سن کر دہشت زدہ رہ

جاتے ہیں۔ وہ دریافت کرتے ہیں کہ کرمان کو کس جرم کی یہ ظالمانہ سزا دی گئی۔ اس کے جواب میں بچے جُرم کے بارے میں گیت گانے لگتے ہیں، جو یہ ہے: ان بچوں کے باپوں نے پچھلے شاہ کو پناہ دی تھی، اور نئے بادشاہ کی نظر میں یہ ناقابلِ معافی جرم ہے۔ ننگے پاؤں بھٹکتے ہوئے اندھے بچوں کو دیکھ کر ہر کسی کے دل میں رحم پیدا ہوتا ہے اور کوئی ان کی مدد کرنے سے انکار نہیں کرتا، لیکن ان کی مدد کرنے میں بڑی احتیاط بلکہ رازداری سے کام لینا ضروری ہے کیوں کہ شاہ کے کارندوں کے ہاتھوں سزا پائے ہوئے یہ بچے دربدر بھٹکتی ہوئی مزاحمت کی علامت ہیں اور مزاحمت کا ساتھ دینا انتہائی سخت سزا کا موجب بن سکتا ہے۔ رفتہ رفتہ گلیوں کے آنکھوں والے بچے ان اندھے بچوں کی رہنمائی کے لیے ان کے جلوس کے ساتھ ہو جاتے ہیں۔ پھر وہ ساتھ ساتھ پھرنے لگتے ہیں اور سردی سے پناہ اور خوراک کی تلاش میں دور دراز گاؤوں تک پہنچ کر کرمان کی تباہی کی داستان ہر طرف پھیلا دیتے ہیں۔

یہ وہ بھیانک اور دردناک یادیں ہیں، وہ کہتا ہے، جو ہمارے قومی حافظے میں موجود ہیں۔ ظالم بادشاہ طاقت کے بل پر اقتدار تک پہنچے اور لاشوں پر چڑھ کر، ماؤں کی آہوں اور زخمیوں کی کراہوں کی گونج میں تخت پر بیٹھے۔ وراثت کا فیصلہ اکثر دور اُفتادہ دارالحکومتوں میں ہوا اور تخت کے نئے دعوے دار تہران میں اس طرح داخل ہوئے کہ انھیں ایک طرف سے انگریزوں نے اور دوسری طرف سے روسیوں نے سہارا دے رکھا تھا۔ لوگوں نے ایسے شاہوں کو ہمیشہ غاصب اور قابض خیال کیا، اور جس شخص کو اس روایت کا علم ہے وہ سمجھ سکتا ہے کہ کس طرح ملّا ان کے خلاف اتنی بار بغاوت برپا کرنے میں کامیاب ہوئے۔ ملّا اعلان کرتے: یہ جو شخص محل میں بیٹھا ہے غیر ملکی ہے اور خارجی طاقتوں کے احکام پر عمل کر رہا ہے۔ یہی تمھارے تمام مصائب کا ذمے دار ہے؛ وہ تمھیں لُوٹ کر خزانہ جمع کر رہا ہے اور ملک کو فروخت کر رہا ہے۔ لوگ ان باتوں پر دھیان دیتے تھے کیوں کہ ملّاؤں کی باتیں انھیں واضح طور پر سچ معلوم ہوتی تھیں۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ ملّا لوگ خود فرشتے تھے۔ ہرگز نہیں! ان منبروں کے پیچھے بہت سی تاریک قوتیں کارفرما رہی ہیں۔ لیکن محل کی بدعنوانیوں اور چیرہ دستیوں نے ملّاؤں کو قومی مفاد کا ترجمان بنا دیا۔

پھر وہ پچھلے شاہ کے انجام کے موضوع کی طرف لوٹتا ہے۔ اُس زمانے میں، جب محمد رضا اپنی مختصر جلاوطنی کے دن روم میں گزار رہا ہے، اُسے احساس ہوتا ہے کہ وہ تخت سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو کر جلاوطن بادشاہوں کی صف میں شامل ہو سکتا ہے۔ یہ خیال اسے نشے

سے بیداری کی حالت میں لے آتا ہے۔ وہ اس زندگی کو خیرباد کہنے کا فیصلہ کرتا ہے جو اَب تک عیش و عشرت اور کھیل کود میں بسر ہو رہی تھی۔ (بعد میں وہ اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ روم میں سیّدنا علی نے ایک خواب میں ظاہر ہو کر اسے بشارت دی تھی: وطن واپس جاؤ اور اپنی قوم کو نجات دلاؤ!) تب اس میں ایک زبردست آرزو، اپنی طاقت اور برتری کا مظاہرہ کرنے کی شدید طلب بیدار ہوتی ہے۔ یہ ذہنی رَو بھی، مجھ سے مخاطب شخص کہتا ہے، ایرانیوں سے مخصوص ہے۔ ہر کسی کو اپنی برتری کا یقین ہے، ہر شخص اول ہونا چاہتا ہے، اپنی "میں" کو دوسروں پر نافذ کرنا چاہتا ہے۔ میں! میں! میں بہتر جانتا ہوں! میں زیادہ مال رکھتا ہوں! میں سب کچھ کر سکتا ہوں! میں دنیا کا مرکز ہوں، میں خود پوری دنیا ہوں! (اس موقعے پر وہ کھڑا ہو کر سر اونچا کر لیتا ہے اور غلو آمیز، غالب اور ٹھیٹھ مشرقی تکبّر کے ساتھ مجھ پر نظر ڈالتا ہے۔) جہاں کچھ ایرانی جمع ہو جائیں، خود کو مراتب کے لحاظ سے ترتیب دے لیتے ہیں: میں پہلا ہوں، تم دوسرے ہو، تم تیسرے ہو۔ دوسرا اور تیسرا شخص اس پر مطمئن نہیں ہوتے اور پہلے کو معزول کرنے کے لیے سازشیں کرنے لگتے ہیں۔ پہلے شخص کو اپنے مقام پر برقرار رہنے کے لیے بہت چوکنّا رہنا پڑتا ہے۔

چوکنّا رہنا اور رائفلوں کی زد سے باہر رہنا!

دوسرے میدانوں میں بھی یہی اصول کارفرما رہتا ہے۔۔ مثلاً گھر میں۔ چوں کہ مرد برتر ہے، اس لیے عورت کو لازماً کمتر ہونا پڑے گا۔ گھر سے باہر خواہ میری کچھ حیثیت نہ ہو، مگر گھر میں میری اس محرومی کی تلافی ہو جاتی ہے، یہاں میں سب کچھ ہوں۔ یہاں میرا اقتدار کسی شرکت کو روا نہیں رکھتا، اور کنبہ جتنا بڑا ہو گا اُتنی ہی میری حاکمیت وسیع اور مضبوط ہو گی۔ بچے جتنے زیادہ ہوں اُتنا بہتر ہے: یہ مرد کی رعایا ہیں۔ وہ خاندانی ریاست کا بادشاہ بن جاتا ہے، احترام اور اطاعت کا مطالبہ کرتا ہے، اپنی رعیّت کی قسمت کا فیصلہ کرتا ہے، ان کے باہمی جھگڑے چکاتا ہے، اپنی مرضی چلاتا ہے، حکمرانی کرتا ہے۔ (وہ یہ دیکھنے کے لیے رکتا ہے کہ اُس کی بات مجھ پر کیسا اثر کر رہی ہے۔ میں زور شور سے اُس کی مخالفت کرتا ہوں: میں ایسے عمومی حکم لگانے کے خلاف ہوں۔ میں اس کے کتنے ہی ہم وطنوں سے واقف ہوں جو نہایت منکسر مزاج اور شائستہ ہیں، جنھوں نے مجھے کبھی کمتری کے احساس میں مبتلا نہیں کیا۔) بالکل درست، وہ مجھ سے اتفاق کرتا ہے، لیکن محض اس لیے کہ تم سے ہمیں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ تم اناؤں کے ٹکراؤ کے اس کھیل میں شریک نہیں ہو۔ اِسی کھیل کی وجہ سے یہاں ٹھوس

بنیادوں پر پارٹیاں قائم نہیں ہو سکیں کیوں کہ قیادت کے جھگڑے فوراً اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور ہر شخص اپنی الگ پارٹی بنانا چاہتا ہے۔ لیکن اب، روم سے واپس آ کر، شاہ بھی اپنی برتری منوانے کے اس کھیل میں خود کو پوری طرح جھونک دیتا ہے۔

چوں کہ سُبکی نہایت ذلت کی بات ہے، وہ مجھے بتاتا ہے، اس لیے شاہ سب سے پہلے اپنی سُبکی کا ازالہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ذرا سوچو، ہماری اقدار اور روایات میں ایک بادشاہ -- قوم کا باپ -- ایسے نازک موقعے پر بھاگ کھڑا ہوا اور اپنی بیوی کے ساتھ جواہرات خریدنے میں مشغول دیکھا گیا! نہیں، اُسے اس تاثر کو کسی نہ کسی طرح زائل کرنا ہو گا۔ اس لیے جب زاہدی، جس کی فوج نے مصدق کی حکومت کو معزول کیا ہے، شاہ کو تار کے ذریعے اطلاع دیتا ہے کہ ٹینکوں نے اپنا کام پورا کر لیا اور اب شاہ کو واپس آنے میں کوئی خطرہ نہیں ہے، تو شاہ سب سے پہلے سیدھا عراق کا رخ کرتا ہے تاکہ سیّدنا علی کے روضے پر تصویر بنوا سکے۔

ایک مذہبی اقدام -- جو ہماری قوم کی نظر میں اپنی عزت بحال کرنے کا درست طریقہ ہے۔

اس طرح شاہ کی واپسی ہوتی ہے، لیکن ایران ابھی سکون سے بہت دور ہے -- طلبا کی ہڑتالیں، سڑکوں پر مظاہرے، بندوقوں کی لڑائیاں، جنازے۔ فوج خود اختلافات، سازشوں اور جھڑپوں میں مبتلا ہے۔ شاہ محل ہی میں رہنے میں عافیت سمجھتا ہے؛ بہت سے لوگ اس کے خون کے پیاسے ہیں۔ وہ اپنے گرد خاندان کے لوگوں، درباریوں اور جنرلوں کی دیواریں کھڑی کر لیتا ہے۔ اب، جبکہ مصدق راستے سے ہٹ چکا ہے، واشنگٹن بے تحاشا رقمیں بھیجنا شروع کر دیتا ہے اور شاہ ان میں سے نصف فوج کے لیے مخصوص کر دیتا ہے۔

یوں فوجیوں کو کھانے میں نان اور گوشت ملتا ہے۔ تمھیں یاد رکھنا ہو گا کہ ہمارے لوگ کس افلاس کے عالم میں رہتے ہیں اور فوجی کو نان اور گوشت ملنے کا کیا مطلب ہے اور یہ بات کس طرح اسے دوسروں سے ممتاز کر دیتی ہے۔

اُس زمانے میں پھولے ہوئے پیٹوں والے بچّے ہر طرف گھوما کرتے تھے کیوں کہ اُنھیں کھانے کے لیے گھاس کے سوا کچھ میسّر نہ تھا۔

مجھے ایک شخص یاد ہے جس نے اپنے بچّے کی آنکھ سگریٹ سے پھوڑ دی تھی۔ آنکھ میں پیپ بھر گئی اور اس کا چہرہ بھیانک ہو گیا۔ اُس شخص نے اپنے بازو پر گریز مل لی جس

سے بازو سُوج گیا اور سیاہ پڑ گیا- وہ اس طرح لوگوں میں رحم کا جذبہ بیدار کر کے دو وقت کی روٹی حاصل کرنا چاہتا تھا-

مجھے بچپن میں کھیلنے کے لیے صرف پتّھر دستیاب تھے- میں ایک بڑے سے پتّھر کو رسّی باندھ کر کھینچا کرتا تھا-- میں گھوڑا تھا اور وہ پتّھر شاہ کا سنہری رَتھ-

نوٹس ۴

شاہ کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کے لیے، وہ کہتا ہے، کوئی بھی بہانہ درست ہو سکتا تھا- لوگ اس آمر سے نجات پانا چاہتے تھے اور موقعے کی تلاش میں تھے-

ہر ایک کی نظریں قُم پر لگی ہوئی تھیں- ہماری تاریخ میں ہمیشہ ایسا ہی ہوا ہے: جب کبھی ناخوشی پھیلی اور بحران آیا، لوگوں نے پہلے اشارے کے انتظار میں قم کی جانب دیکھنا شروع کر دیا-

اور قُم دہاڑ رہا تھا-

یہ اُس وقت کی بات ہے جب شاہ نے ایران میں مقیم تمام امریکی فوجیوں اور ان کے کنبوں کو قانون سے سفارتی استثنیٰ کا حقدار قرار دے دیا تھا- امریکی ماہرین ہماری فوج میں بھرے ہوئے تھے- ملّاؤں نے بہ آوازِ بلند اعلان کیا کہ شاہ کا یہ اقدام خودمختاری کے اصول کے خلاف ہے- تب، ایران نے پہلی بار آیت اللہ خمینی کی آواز سنی- اس سے پہلے کوئی اس سے واقف نہیں تھا-- سوائے اُن لوگوں کے جو قم میں رہتے تھے- اس کی عمر اُس وقت ہی ساٹھ سے زیادہ کی ہو چکی تھی، وہ شاہ کے باپ کی عمر کا تھا- بعد میں کئی موقعوں پر اس نے شاہ کو بیٹا کہہ کر مخاطب کیا، لیکن ظاہر ہے کہ طنز اور غصّے کے انداز میں- خمینی نے اس پر بے رحمی سے حملہ کیا- میرے لوگو، وہ چلّا کر کہتا، اُس پر بھروسا نہ کرنا- وہ تمہارا آدمی نہیں ہے! وہ تمہارے بارے میں نہیں سوچتا-- اُسے صرف اپنا خیال ہے اور اُن کا جو اُسے اپنے حکم پر چلاتے ہیں- وہ تمہارے ملک کا سودا کر رہا ہے، ہم سب کو فروخت کر رہا ہے! شاہ باید برود! شاہ کو جانا ہو گا!

پولیس خمینی کو گرفتار کر لیتی ہے- قم میں مظاہرے شروع ہو جاتے ہیں- لوگ اس کی رہائی کا مطالبہ کرتے ہیں- پھر دوسرے شہر بھی سڑکوں پر نکل آتے ہیں-- تہران، تبریز، مشہد، اصفہان- تب شاہ فوج کو سڑکوں پر لے آتا ہے اور قتال شروع ہو جاتا ہے-

(وہ اٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہے، بازو پھیلا لیتا ہے اور ہاتھوں کو یوں تیزی سے حرکت دینے لگتا ہے گویا مشین گن چلا رہا ہو۔ وہ اپنی داہنی آنکھ میچ کر منھ سے مشین گن کے چلنے کی آواز نکالتا ہے۔) یہ، وہ کہتا ہے، جون ۱۹۶۳ کی بات ہے۔ ہنگامے پانچ مہینے تک ہوتے رہے۔ ان کی قیادت مصدق کی جماعت کے جمہوریت پسندوں اور مذہبی رہنماؤں کے ہاتھ میں تھی۔ دس ہزار سے زیادہ لوگ ہلاک اور زخمی ہوئے۔ اس کے بعد کئی برس خاموشی رہی، لیکن یہ مکمل خاموشی نہیں تھی کیوں کہ کسی نہ کسی طرح کی بغاوت اور جدوجہد کا آغاز ہو چکا تھا۔ خمینی کو جلاوطن کر دیا گیا اور وہ عراق کے شہر نجف چلا گیا جہاں سیّدنا علی کا روضہ واقع ہے۔

اب میں سوچتا ہوں کہ وہ کس طرح کے حالات تھے جنھوں نے خمینی کو پیدا کیا۔ آخر اُن دنوں میں اس سے زیادہ معروف اور زیادہ اہم علما بھی موجود تھے اور شاہ کے ممتاز سیاسی مخالفین بھی۔ ہم سب فردِ احتجاج، مینی فیسٹو، خطوط اور بیانات لکھا کرتے تھے۔ اُنھیں دانشوروں کا ایک محدود سا گروہ پڑھتا تھا کیوں کہ اس طرح کی تحریریں قانونی طور پر چھاپی نہیں جا سکتی تھیں، اور دوسری بات یہ کہ لوگوں کی اکثریت پڑھنے سے نابلد تھی۔ ہم شاہ پر تنقید کرتے تھے، کہتے تھے کہ حالات خراب ہیں، تبدیلیوں کا مطالبہ کرتے تھے، اصلاحات، جمہوریت اور انصاف کا مطالبہ کرتے تھے۔ لیکن یہ کسی کے ذہن میں نہیں آیا تھا کہ خمینی کی طرح باہر نکل آئے اور ان تمام تحریروں، ان تمام قراردادوں، مطالبوں اور تجویزوں کو مسترد کر دے۔ لوگوں کے سامنے کھڑا ہو جائے اور بلند آواز میں کہے: شاہ باید برود! شاہ کو جانا ہو گا!

اُس زمانے میں خمینی نے جو کچھ کہا اس کا لبِ لباب یہی تھا، اور وہ یہی بات پندرہ سال تک دُہراتا رہا۔ یہ سادہ ترین بات تھی اور اسے ہر کوئی یاد رکھ سکتا تھا۔۔ لیکن لوگوں کو یہ سمجھنے میں پندرہ سال لگے کہ دراصل اس بات کا مطلب کیا ہے۔ لوگ شاہی کے ادارے کو ہوا کی طرح قدرتی سمجھتے تھے۔ کسی کے ذہن میں اس کے بغیر زندگی کا تصوّر نہیں تھا۔

شاہ باید برود!

بحث مت کرو، گفتگو مت کرو، اصلاحات مت کرو، معاف مت کرو۔ یہ سب کچھ لغو ہے، اس سے کچھ نہیں ہو گا، یہ بے کار ہے، یہ خود فریبی ہے۔ ہم صرف شاہی کے ملبے پر سے گزر کر آگے جا سکتے ہیں۔ اس کے سوا کوئی راستا نہیں۔

شاہ کو جانا ہو گا!

انتظار مت کرو، رکو مت، سوؤ مت۔

شاہ باید برود!

جب اُس نے پہلے پہل یہ لفظ ادا کیے تو یہ کسی جنونی کا ہذیان معلوم ہوئے۔ شاہی نے ابھی اپنی قوّت کے سب امکانات ختم نہیں کیے تھے۔

فوٹو گراف ۷

یہاں ہم تہران کی ایک سڑک کے کنارے بس اسٹاپ پر چند لوگوں کو کھڑا دیکھتے ہیں۔ بس کا انتظار کرتے ہوئے لوگ دنیا بھر میں ایک ہی جیسے دکھائی دیتے ہیں؛ ان کے چہروں پر تھکن اور بے حسی کا وہی تاثر ہوتا ہے، کھڑے ہونے کے انداز میں وہی بوجھل پن اور شکست خوردگی جھلکتی ہے، آنکھوں میں وہی دھندلاہٹ اور بے یقینی کی کیفیت ہوتی ہے۔ جس آدمی نے جب کبھی مجھے یہ تصویر دی تھی اُس نے مجھ سے دریافت کیا تھا کہ کیا مجھے اس میں کوئی عجیب بات دکھائی دیتی ہے۔ میں نے تصویر کو غور سے دیکھا اور نفی میں جواب دیا۔ اس نے بتایا کہ یہ تصویر سڑک کے اُس پار کے ایک مکان کی کھڑکی سے خفیہ طور پر کھینچی گئی تھی۔ خاص بات یہ ہے، اس نے مجھے تصویر دکھاتے ہوئے نشان دہی کی، کہ یہ آدمی (جس کا بے نام چہرہ کسی نچلے درجے کے سرکاری اہلکار کا سا تھا) آپس میں بات کرتے ہوئے تین آدمیوں کے پاس کھڑا اُن کی بات چیت پر کان لگائے ہوئے ہے۔ یہ آدمی ساواک سے تعلق رکھتا تھا اور اس کا مستقل کام بس اسٹاپ پر بس کے انتظار میں غیر حاضر دماغی سے ادھراُدھر کی باتیں کرتے ہوئے لوگوں کی سُن گُن لینا تھا۔ لوگ صرف بے ضرر موضوعات پر بات چیت کر سکتے تھے، لیکن اس میں بھی یہ احتیاط ضروری تھی کہ کوئی ایسا حوالہ نہ آنے پائے جن میں پولیس کو کوئی معنی خیز اشارہ مل سکے۔ ساواک کو ایسے اشارے بھانپنے میں خاص مہارت حاصل تھی۔ ایک تپتی ہوئی دوپہر کو ایک ادھیڑ عمر شخص، جو دل کا مریض بھی تھا، بس اسٹاپ پر پہنچا اور ایک طویل سانس لے کر کہنے لگا: "آہ! کس قدر حَبس ہے، سانس لینا بھی مشکل ہے!" "ہاں، بالکل،" ساواک کے ایجنٹ نے فوراً اس کے قریب کھسکتے ہوئے اس کی تائید کی، "حبس بڑھتا ہی جا رہا ہے اور لوگ ہوا کے لیے ترس رہے ہیں۔" "بالکل درست کہا،" بوڑھا اپنے سینے کو ہاتھ سے بھینچ کر معصومیت کے ساتھ بولا، "کیسی بوجھل فضا ہے، سانس رکنے لگا ہے۔" ساواک کے ایجنٹ نے کڑک کر کہا: "اب تمھیں سانس لینے کا اچھی طرح

موقع دیا جائے گا،" اور یہ کہہ کر بوڑھے کو گھسیٹ کر لے گیا۔ بس اسٹاپ پر کھڑے ہوئے دوسرے لوگ دہشت کے عالم میں یہ گفتگو سن رہے تھے، کیوں کہ انھیں شروع ہی میں اندازہ ہو گیا تھا کہ بوڑھے نے ایک اجنبی کے سامنے "حبس" کا لفظ ادا کر کے ایک ناقابلِ معافی جرم کا ارتکاب کیا ہے۔ تجربے نے انھیں ایسے لفظوں اور فقروں سے اجتناب کرنا سکھا دیا تھا -- حبس، اندھیرا، بوجھ، کھائی، شکستگی، دلدل، تعفن، پنجرہ، سلاخیں، زنجیر، زباں بندی، لاٹھی، بُوٹ، دکھاوا، پیچ، جیب، پنجہ، دیوانگی؛ گر پڑنا، بے حرکت ہو جانا، چاروں شانے چت، منہ کے بل، پژمردگی، بھدّاپن، اندھاپن، بہراپن، گندگی میں لوٹنا، گڑبڑ، دھاندلی، تلپٹ ہو جانا، کچھ ہونے والا ہے -- کیوں کہ یہ سب اسم، فعل اور اسم صفت ایسے تھے کہ ان میں شاہ کی حکومت کے بارے میں اشارے چھپے ہوئے ہو سکتے تھے، اور تلمیحات کی یہ بارودی سُرنگیں زبان کی ذرا سی لغزش سے آدمی کو ریزہ ریزہ کر سکتی تھیں۔ ایک لمحے کو، بہت مختصر سے لمحے کو، بس اسٹاپ پر کھڑے ہوئے لوگوں کے ذہنوں میں ایک خیال بجلی کی طرح کوندا: کیا پتا وہ بوڑھا خود بھی ساواک کا ایجنٹ ہو! اسے ضرور تحفظ حاصل رہا ہو گا، ورنہ وہ "حبس" کا لفظ استعمال کر کے حکومت پر تنقید کی جرأت کیوں کر کرتا؟ وہ چپ رہتا، یا پھر ایسے کسی پسندیدہ موضوع پر بات کرتا کہ دھوپ کتنی اچھی ہے، یا یہ کہ بس جلد ہی آنے والی ہے۔ تنقید کرنے کا حق کس کو ہے؟ صرف ساواک کے ایجنٹوں کو، جن کا کام ہی یہ ہے کہ ایسے خطرناک موضوعات چھیڑ کر باتونی لوگوں کو بے احتیاطی سے بولنے پر اکسائیں اور پھر انھیں گھیر کر قید خانے میں لے جائیں۔ ہر جگہ موجود اس دہشت نے لوگوں کو پاگل کر دیا، وہ اتنے خوف زدہ رہنے لگے کہ کسی کو ایمان دار، معصوم اور دلیر ماننے کو تیار نہیں ہوتے تھے۔ آخر وہ خود بھی تو ایمان دار تھے، لیکن اس کے باوجود انھیں کوئی رائے ظاہر کرنے یا کسی بات پر تبصرہ کرنے، یا کسی کو کسی بات پر قصوروار ٹھہرانے کی ہمت نہیں ہوتی تھی، کیوں کہ انھیں معلوم تھا کہ سزا بے رحمی سے ان کی منتظر ہے۔ اس طرح اگر کوئی شاہ پر زبانی حملہ یا حکومت کی مذمت کرتا تو ہر کوئی اُسے اکسانے والا ایجنٹ گردانتا جسے اپنی رائے سے اتفاق کرنے والوں کو سامنے لا کر پھانسنے اور ختم کرنے کے لیے مقرر کیا گیا ہو۔ جن باتوں کو وہ سینوں میں دبائے بیٹھے تھے، اگر کوئی شخص ان باتوں کو برملا اور واضح طور پر بیان کرتا تو مشکوک ٹھہرتا اور لوگ اس سے بچنے لگتے اور اپنے دوستوں کو بھی خبردار کرتے: اس آدمی سے ہوشیار رہنا، یہ زیادہ ہی دلیر بننے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس طرح دہشت کا شکار ہونے والوں کی

تعداد بڑھتی رہی -- وہ ہر اُس شخص کو شک اور ترک شُدگی کا نشانہ بنا دیتی جو، خلوص کے ساتھ، ظلم کی مخالفت کی کوشش کرتا۔ خوف نے لوگوں کے ذہنوں کو اس درجہ مسخ کر دیا کہ انھیں جرأت میں فریب اور دلیری میں سازش نظر آنے لگی۔ لیکن اِس بار ساواک کا ایجنٹ جس طرح اپنے شکار کو گھسیٹ کر لے گیا تھا، اسے دیکھتے ہوئے بس اسٹاپ پر کھڑے ہوئے لوگوں کو تسلیم کرنا پڑا کہ اُس بوڑھے کا پولیس سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ بہرحال شکاری اور شکار دونوں اب نظروں سے اوجھل تھے، اور صرف یہ سوال باقی تھا: وہ کہاں گئے؟ دراصل کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ ساواک کہاں واقع ہے۔ اس تنظیم کا کوئی ہیڈکوارٹر نہیں تھا۔ یہ سارے شہر میں (اور سارے ملک میں) پھیلی ہوئی تھی، ہر جگہ تھی اور کہیں نہیں تھی۔ ایسے مکان، بنگلے اور فلیٹ اس تنظیم کی ملکیت تھے جن پر لوگ کوئی توجہ نہیں دیتے تھے۔ اس کے دروازے یا تو بے نام ہوتے تھے یا ان پر غیر موجود فرموں اور اداروں کے نام کی تختیاں لگی ہوتی تھیں۔ اس کے فون نمبر صرف اُن لوگوں کے پاس تھے جو اس کے رازوں میں شریک تھے۔ کسی عام سی عمارت میں کوئی فلیٹ ساواک کی ملکیت ہو سکتا تھا، یا آدمی کسی دکان، کسی لانڈری، کسی نائٹ کلب سے گزر کر اس کے تفتیشی مرکز میں داخل ہو سکتا تھا۔ ایسی صورت حال میں ہر دیوار کے کان ہوتے ہیں اور کوئی بھی دروازہ خفیہ پولیس کی گرفت میں پہنچا سکتا ہے۔ جو کوئی اس تنظیم کے شکنجے میں گیا، اپنا کوئی نام نشان چھوڑے بغیر غائب ہو گیا، بعض اوقات تو ہمیشہ کے لیے۔ لوگ اچانک مفقود ہو جاتے اور کسی کو معلوم نہ ہوتا کہ ان پر کیا گزری؛ کہاں جائیں، کس سے دریافت کریں، کس سے اپیل کریں۔ وہ یقیناً کسی قید خانے میں بند ہوں گے، لیکن کہاں؟ قید خانے چھ ہزار تھے۔ ایک غیر مرئی، مضبوط دیوار راستے میں آ جاتی، جس کے سامنے آدمی صرف بے بسی سے کھڑا رہ سکتا تھا اور ایک قدم آگے بڑھانا ممکن نہیں تھا۔ ایران ساواک کے قبضے میں تھا، اگرچہ ملک کے اندر یہ پولیس یوں عمل کرتی تھی جیسے کوئی زیرِزمین خفیہ تنظیم ہو، ظاہر ہوتی اور چھپ جاتی، اپنے قدموں کے نشان غائب کر دیتی، اپنا اگلا پتا چھوڑے بغیر غائب ہو جاتی۔ مگر اس کے بعض محکمے سرکاری طور پر کام کرتے تھے۔ ساواک اخباروں، کتابوں اور فلموں کو سنسر کرتی تھی (ساواک ہی نے شیکسپیئر اور مولیئر کے ڈراموں پر پابندی لگائی تھی کیوں کہ ان میں شاہی اور اشرافیہ کے نقائص کی نکتہ چینی کی گئی تھی)۔ یونیورسٹیوں، دفتروں اور کارخانوں میں ساواک کا راج تھا۔ وہ بہت بڑا ہشت پا تھی جو بُری طرح پھیل گیا تھا، جس کی لچکدار سونڈیں ہر چیز کو گرفت میں لیے ہوئے تھیں، ہر

چیز کو اُلجھا لیتی تھیں، ہر کونے کھدرے میں پہنچ جاتی تھیں، اس نے اپنے پنجے ہر جگہ گاڑ رکھے تھے، اس کا وحشی سانس ہر جگہ پہنچتا تھا، اس کے ناخن وجود کی ہر سطح کو کھُرچ کر اندر تک اتر گئے تھے۔ ساواک کے ایجنٹوں کی تعداد ساٹھ ہزار تھی۔ مگر کسی نے حساب لگایا تھا کہ اس کے پاس تیس لاکھ مخبر موجود تھے جو مختلف قسم کے محرکات کے زیرِ اثر دوسرے لوگوں کی مخبری کرتے تھے: یہ محرکات پیسہ یا اپنا تحفظ یا ملازمت یا ترقی کا حصول، کچھ بھی ہو سکتے تھے۔ ساواک یا تو لوگوں کو خرید لیتی تھی یا ان پر تشدد کرتی تھی، انھیں عہدوں پر فائز کرتی تھی یا قید میں ڈال دیتی تھی۔ وہی طے کرتی تھی کہ دشمن کون ہے اور یہ فیصلہ بھی اُسی کے ہاتھ میں تھا کہ کس کو ختم کر دیا جائے۔ اور اس سزائے موت میں اپیل یا نظرِ ثانی کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ ساواک صرف شاہ کو جواب دہ تھی، اور جن لوگوں کے کندھوں پر شاہی نظام کا بوجھ تھا ان کی آوازیں اس پولیس کے آگے بے اثر تھیں۔ بس اسٹاپ پر انتظار کرتے ہوئے لوگ یہ سب کچھ جانتے ہیں اس لیے بوڑھے اور ساواک کے ایجنٹ کے جانے کے بعد بھی خاموش رہتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کو کن اکھیوں سے دیکھتے رہتے ہیں، کیوں کہ ہر ایک اس خدشے میں مبتلا ہے کہ اس کے برابر میں کھڑا ہوا شخص مخبر ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے وہ ابھی ابھی کوئی انٹرویو دے کر آ رہا ہو جس میں ساواک نے اس سے کہا ہو کہ اگر اتفاق سے اس کے علم یا سماعت میں کوئی بات آئے اور وہ اس کی رپورٹ کر دے تو اس کے بیٹے کو یونیورسٹی میں داخلہ مل جائے گا۔ یا اس کا اپنا نام مخالفین کے ریکارڈ میں سے حذف کر دیا جائے گا۔ ''خدا کی پناہ! میرا مخالفین سے کیا تعلق؟'' اس نے اپنے دفاع میں کہا ہو گا۔ ''کیسے نہیں؟ یہاں لکھا ہوا جو ہے کہ تم مخالفین میں سے ہو!'' بس اسٹاپ پر کھڑے ہوئے لوگ نہ چاہتے ہوئے بھی ایک دوسرے کی طرف نفرت سے دیکھتے ہیں (حالاں کہ ان میں سے بعض اپنی نفرت کو چھپائے رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں تاکہ کوئی جھگڑا نہ اٹھ کھڑا ہو۔ ان میں دیوانگی کے، غلو آمیز ردعمل ظاہر کرنے کی ایک شدید لہر اٹھتی ہے۔ کوئی چیز اُن کے اعصاب پر سوار ہونے لگتی ہے، انھیں کہیں سے کسی ناگوار شے کی بُو آتی ہے، اور وہ ایک دوسرے سے پرے سرک جاتے ہیں، انتظار کرتے ہیں کہ کون کس کا پیچھا کرتا ہے، کون سب سے پہلے کسی پر جھپٹتا ہے۔ یہ باہمی بے اعتمادی ساواک کی پیدا کی ہوئی ہے، جو ہر ایک کے کان میں سرگوشی کرتی رہتی ہے کہ تمام لوگ ساواک کے کارندے ہیں۔ یہ بھی، یہ دوسرا بھی، اور وہ بھی۔ کیا وہ بھی؟ ہاں، بے شک، ہر شخص! مگر بس اسٹاپ پر انتظار کرتے

ہوئے یہ لوگ دل کے اچھے بھی ہو سکتے ہیں، اور ان کا اندرونی ہیجان، جسے انھوں نے خاموشی اور سپاٹ پتھریلے چہروں کے پیچھے چھپا رکھا ہے، تھوڑی دیر پہلے کے اس خوف کا نتیجہ بھی ہو سکتا ہے جو ساواک کے قریب کے گزرنے سے پیدا ہوا ہے۔ اگر کہیں ان کی جبلّت نے لمحے بھر کے لیے ان کا ساتھ چھوڑ دیا ہوتا اور انھوں نے کسی مبہم موضوع پر بات چیت شروع کردی ہوتی، مثلاً یہ کہ شدید گرمی میں مچھلیاں جلدی سڑنے لگتی ہیں اور یہ کہ حیرت اس بات پر ہے کہ سڑتی ہوئی مچھلی میں بُو سب سے پہلے اس کے سر سے اٹھتی ہے اور باقی مچھلی کو بچانے کے لیے اس کا سر فوراً کاٹ دینا پڑتا ہے۔۔ اگر انھوں نے باورچی خانے کا مسئلہ چھیڑ دیا ہوتا تو شاید ان کا انجام بھی اُس بوڑھے کا سا ہوتا جو اپنے دل کو پکڑے ہوئے تھا۔ لیکن بہرحال وہ بچ گئے اور اِس وقت بس اسٹاپ پر کھڑے پسینا پونچھ رہے ہیں اور رومال سے ہوا جَھل کر اپنی بھیگی ہوئی قمیصیں خشک کر رہے ہیں۔

نوٹس ۵

سازباز کے ماحول میں لیے ہوئے وِسکی کے گھونٹ، تمام ممنوعہ پھلوں کی طرح، ایک اضافی، مسحور کن کشش رکھتے ہیں (اور اب اس سلسلے میں سازباز کا عنصر شامل ہونا لازمی ہے، کیوں کہ خمینی کی جانب سے شراب پر پابندی کا قانون نافذ ہو چکا ہے)۔ مگر گلاس میں مائع کے صرف چند قطرے موجود ہیں۔۔ میزبان نے اپنی چھپائی ہوئی آخری بوتل نکال لی ہے اور جانتا ہے کہ اگلی بوتل نہیں خرید سکے گا۔ ایران کے باقی ماندہ شرابی مرتے جا رہے ہیں: ووڈکا، وائن یا بیئر کے دستیاب نہ ہونے کے باعث وہ مختلف قسم کے کیمیائی محلول پی رہے ہیں اور ہلاک ہو رہے ہیں۔

ہم ایک آرام دہ، مختصر اور آراستہ ٹاؤن ہاؤس کی زمینی منزل پر بیٹھے، شیشے کے کھلے دروازے سے باہر باغ اور اُس دیوار کو دیکھ رہے ہیں جو اس مکان کو سڑک سے الگ کرتی ہے۔ یہ دس فٹ اونچی دیوار قربت کے اندرونی رقبے کو مستحکم کر کے اس حد بندی کی تشکیل کر رہی ہے جس کے اندر رہنے کے لیے مکان کی عمارت بنائی گئی ہے۔ میرا میزبان اور اس کی بیوی دونوں کی عمر چالیس کے لگ بھگ ہے؛ انھوں نے تہران میں تعلیم پائی ہے اور ایک ٹریول ایجنسی میں کام کرتے ہیں (ان کے ہم وطنوں کی ہوسِ سیر کے باعث اس قسم کی سینکڑوں ایجنسیاں کام کر رہی ہیں۔)

"ہماری شادی کو بارہ سال سے زیادہ ہو چکے ہیں،" مرد، جس کے بالوں میں سفیدی کی جھلک نمودار ہو چکی ہے، مجھے بتاتا ہے، "لیکن آج کل پہلی بار ہم میاں بیوی آپس میں سیاست کے موضوع پر بات کرتے ہیں۔ یہ موضوع اس سے پہلے ہم نے کبھی نہیں چھیڑا۔ جتنے لوگ ہمارے واقف ہیں اُن سب کے گھروں میں یہی صورتِ حال ہے۔"

نہیں، اُس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ دونوں ایک دوسرے پر اعتماد نہیں رکھتے تھے۔ نہ انھوں نے کبھی اس بارے میں باقاعدہ طے کیا تھا۔ اس کے باوجود ان کے درمیان ایک ان کہا سمجھوتا تھا جسے دونوں نے قریب قریب غیر شعوری انداز میں قبول کر رکھا تھا، اور اس سمجھوتے کی بنیاد انسانی فطرت کی بابت ایک خاص تفکر پر تھی: یعنی یہ کہ نہیں کہا جا سکتا کہ کوئی شخص انتہائی تعذیب کے عالم میں کس طرح کا رویّہ اختیار کر سکتا ہے، کس فعل پر، کس دغا، کس بہتان پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔

"بد ترین بات یہ ہے،" بیوی کہتی ہے، "کہ کوئی شخص اپنے بارے میں بھی نہیں کہہ سکتا کہ وہ کس حد تک ایذا برداشت کر سکتا ہے۔ اور ساواک کا مطلب، سب سے بڑھ کر، انتہائی دہشت ناک قسم کا تشدّد ہی تھا۔ گلی میں چلتے ہوے کسی شخص کو اغوا کر کے، آنکھوں پر پٹّی باندھ کر، کوئی سوال کیے بغیر اسے سیدھا عقوبت خانے میں پہنچا دیا جاتا تھا۔ وہاں اس پر تشدّد کے مخصوص بہیمانہ طریقے سلسلہ وار آزمائے جاتے تھے: ہڈّیاں توڑنا، ناخن اکھاڑنا، ہاتھوں کو جلتے ہوے توے پر رکھ دینا، زندہ آدمی کی کھوپڑی میں ڈرِل مشین سے سوراخ کرنا، اور ایسی ہی دوسری ہولناک ایذائیں۔ آخر میں، جب وہ درد سے پاگل ہو کر ایک ٹوٹا پھوٹا خون آلود ڈھیر بن چکا ہوتا، تب اس سے پوچھ گچھ کا آغاز کیا جاتا۔ نام؟ پتا؟ تم شاہ کے خلاف کیا باتیں کرتے پھر رہے تھے؟ جلدی بتاؤ، کیا باتیں کر رہے تھے تم؟ عین ممکن ہے کہ اس نے کبھی شاہ کے خلاف کوئی بات کی ہی نہ ہو۔ عین ممکن ہے کہ وہ بالکل بے قصور ہو۔ لیکن ساواک کے لیے اس بات کی کوئی اہمیت نہیں تھی کہ کوئی شخص بے قصور ہے یا نہیں۔ اس طرح ہر شخص، خواہ وہ بے قصور ہو یا قصوروار، خوف کے عالم میں رہے گا، کوئی خود کو محفوظ نہیں سمجھے گا۔ ساواک کی دہشت کی اصل بنیاد یہی تھی کہ وہ کسی بھی شخص پر جھپٹ سکتی تھی، کسی بھی شخص پر الزام لگا سکتی تھی کیوں کہ ساواک کے لگائے ہوے الزاموں کا تعلق کسی فعل سے نہیں بلکہ فعل کے ارادے سے تھا جسے وہ کسی بھی شخص سے منسوب کر سکتی تھی۔ تم نے شاہ کی مخالفت کی تھی؟ نہیں۔

مگر کرنا چاہتے تھے، حرام زادے! بس اتنا کافی ہوتا تھا۔

"کبھی کبھی وہ مقدمے بھی چلاتے تھے۔ سیاسی سرگرمیوں کے الزام پر (مگر سیاسی سرگرمی کیا ہوتی ہے؟ یہاں تو ہر سرگرمی سیاسی سرگرمی ہے!) صرف فوجی عدالتوں میں مقدمہ چلایا جاتا تھا: بند کمرے میں سماعت، نہ وکیل نہ گواہ، اور فوری فیصلہ۔ اور فوری سزائے موت۔ کیا کسی نے اُن لوگوں کی تعداد کا حساب لگایا ہے جو ساواک کی گولیوں کا شکار ہوئے؟ یہ تعداد یقیناً ہزاروں میں ہو گی۔ ہمارے عظیم شاعر خسرو گلِ سُرخی کو ہلاک کیا گیا۔ ہمارے ایک بہت بڑے فلم ڈائرکٹر کرامت دناشیان کو گولی ماری گئی۔ درجنوں ادیبوں، پروفیسروں اور فنکاروں کو قید میں ڈالا گیا۔ درجنوں کو جان بچا کر فرار ہونا پڑا۔ ساواک ناقابلِ یقین حد تک جاہل اور غلیظ دہشت پسندوں پر مشتمل تھی، اور جب کوئی کتابیں پڑھنے والا شخص ان کے ہاتھوں میں پڑ جاتا تو وہ اس پر خاص خباثت کے ساتھ تشدّد کرتے۔

"ساواک مقدموں اور عدالتوں سے گریز کرتی تھی۔ اس کے طریقے دوسرے تھے اور شکار ہونے والے اکثر لوگوں کو خفیہ طور پر ہلاک کیا جاتا تھا۔ بعد میں کچھ بھی ثابت نہ ہو سکتا تھا۔ کس نے مارا؟ کوئی نہیں جانتا۔ مجرم کون ہے؟ کوئی بھی نہیں۔

"لوگ خالی ہاتھوں سے فوج اور پولیس پر ٹوٹ پڑے کیوں کہ وہ اس حد تک پہنچ چکے تھے کہ مزید دہشت نہیں سہہ سکتے تھے۔ شاید آپ کو یہ اضطراری فعل معلوم ہو، لیکن ہمارے لیے سب کچھ برابر تھا۔

"کیا آپ جانتے ہیں کہ بات چیت میں اگر کسی کے منھ سے ساواک کا نام نکل جاتا تھا تو سننے والا گھنٹوں اسے گھورتا رہتا اور یہ سوچنے لگتا کہ شاید یہ خود ساواک کا ایجنٹ ہے؟ یہ شخص میرا باپ، میرا شوہر، میرا بہترین دوست، کوئی بھی ہو سکتا تھا۔ کتنا ہی خود پر قابو پانے کی کوشش کی جاتی مگر یہ خیال ذہن سے محو نہ ہوتا اور بار بار پریشان کرتا رہتا۔ ہر چیز مریض ہو چکی تھی، پورا ملک، اور مجھے نہیں معلوم کہ ہم کتنے عرصے میں اپنی صحت، اپنا توازن حاصل کر پائیں گے۔ آمریت کے ان برسوں نے ہمیں اندر سے توڑ کر رکھ دیا ہے، اور میرا خیال ہے کہ نارمل انسانوں کی طرح زندگی گزارنے کے قابل ہونے میں ابھی بہت طویل عرصہ لگے گا۔"

فوٹوگراف ۸

یہ تصویر شیراز میں انقلابی کمیٹی کی عمارت کے سامنے لگے ہوئے ایک بُلیٹن بورڈ پر نعروں، اعلانوں اور چند دوسری تصویروں کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ میں نے ایک طالب علم سے اس تصویر کے نیچے ہاتھ سے لکھ کر لگایا ہوا اعلان ترجمہ کر کے سنانے کی درخواست کی۔ "یہاں لکھا ہے،" وہ بولا، "کہ یہ تین سالہ بچہ حبیب فردوست ساواک کا قیدی تھا۔" "کیا؟" میں نے پوچھا۔ "تین سال کا بچہ اور قیدی؟" اس نے جواب دیا کہ کبھی کبھی ساواک پورے کنبے کو قید میں ڈال دیتی تھی، اور اس بچے کے کنبے کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ اس نے اعلان کو آخر تک پڑھا اور مزید بتایا کہ بچے کے ماں باپ تشدّد کے دوران ہلاک ہو گئے تھے۔ اب ساواک کے جرائم کے بارے میں بہت سی کتابیں چھپ رہی ہیں، اور ان کے علاوہ پولیس کی دستاویزات اور تشدّد کے بعد زندہ رہ جانے والوں کے بیانات بھی شائع ہو رہے ہیں۔ اور جو بات میرے لیے سب سے زیادہ صدمہ انگیز تھی وہ یہ کہ یونیورسٹی کے سامنے ایسے رنگین پوسٹ کارڈ بک رہے تھے جن میں ساواک کا شکار ہونے والوں کی لاشیں دکھائی گئی تھیں۔ تیمور لنگ کے چھ سو سال بعد بھی وہی مریضانہ سفّاکی برقرار تھی، بس شاید اوزار زیادہ ترقی یافتہ ہو گئے تھے۔ ساواک کے عقوبت خانوں سے جو مشین سب سے زیادہ تعداد میں برآمد ہوئی وہ دھات کی بنی ہوئی میز تھی جسے "فرائنگ پین" کہا جاتا تھا۔ شکار کو اس پر لٹا کر اس کے ہاتھ پیر باندھ دیے جاتے تھے اور میز کی سطح کو بجلی کے تاروں کے ذریعے تپایا جاتا تھا۔ ایسی میزوں پر بہت سے لوگوں نے جان دی۔ اکثر لوگ تو عقوبت خانے میں داخل ہوتے ہوئے ہی ہذیان بکنے لگتے تھے —۔ اپنی باری کا انتظار کرتے ہوئے انھیں جو چیخیں سنائی دیتیں اور گوشت کے جلنے کی جو بُو آتی اُسے کم ہی لوگ برداشت کر پاتے تھے۔ لیکن اس بھیانک خواب کی دنیا میں ٹیکنولوجی کی ترقی قدیم طریقوں کا بدل نہیں تھی۔ اصفہان میں لوگوں کو بھوک سے پاگل ہوتی ہوئی بلّیوں، یا زہریلے سانپوں سے بھرے بوروں میں ڈال دیا جاتا۔ ایسے دہشت ناک واقعات کو بسا اوقات خود ساواک کی جانب سے شہرت دی جاتی تھی اور یہ واقعات برسوں تک لوگوں کے درمیان گردش کرتے رہتے تھے۔ ان کی دہشت اتنی بےپناہ اور ملک دشمنی کی تعریف اس قدر ڈھیلی ڈھالی اور مبہم تھی کہ ہر شخص ایسے ہی کسی عقوبت خانے میں جان دینے کا تصور کر سکتا تھا۔

فوٹو گراف ۹

یہ تصویر تہران میں ۲۳ دسمبر ۱۹۷۳ کو کھینچی گئی: شاہ بے شمار مائیکروفونوں میں گھرا ہوا اخبار نویسوں سے بھرے ہال میں تقریر کر رہا ہے۔ اس موقعے پر محمد رضا کے لیے، جو عموماً احتیاط اور دانستہ کم گوئی اختیار کیے رہتا ہے، اپنے جذبات، اپنا جوش اور -- اخبار نویسوں کے مشاہدے کے مطابق -- اپنا ہیجان چھپانا مشکل ہو رہا ہے۔ یہ موقع در حقیقت نہایت اہم اور تمام دنیا کے لیے دور رس نتائج کا حامل ہے: شاہ تیل کی نئی قیمت کا اعلان کر رہا ہے۔ پچھلے دو مہینوں کے دوران تیل کی قیمت چار گنا ہو چکی ہے، اور ایران کو، جسے پٹرولیم کی برآمد سے ہر سال پانچ بلین ڈالر کی آمدنی ہوتی تھی، اب بیس بلین ڈالر سالانہ حاصل ہوا کریں گے۔ اور دولت کے اس عظیم ذخیرے کا تصرّف شاہ کے ہاتھ میں رہے گا۔ اس آمرانہ بادشاہی میں وہ اس دولت کو جس طرح چاہے خرچ کر سکتا ہے۔ چاہے اسے سمندر میں پھینک دے، چاہے آئس کریم پر صرف کر ڈالے، چاہے سونے کی تجوری میں بند کر رکھے۔ سو اس کا جوش و خروش کچھ ایسی تعجب کی بات نہیں ہے -- اگر ہم میں سے کسی کو اچانک اپنی جیب میں بیس بلین ڈالر پڑے مل جائیں، اور وہ یہ بھی جانتا ہو کہ ہر سال بیس بلین، بلکہ اس سے بھی زیادہ رقم باقاعدگی سے ملا کرے گی، تو اس کا ردعمل کیا ہو گا؟ اس لیے شاہ کا ہیجانی طرزِ عمل قرینِ قیاس ہے۔ بجائے اس کے کہ وہ اپنے کنبے کے افراد، وفادار جنرلوں اور قابلِ اعتماد مشیروں کو جمع کر کے اس دولت کو صرف کرنے کا کوئی معقول طریقہ تلاش کرتا، یہ فرماں روا -- جس کو اچانک ایک خیرہ کر دینے والے رویا کا دعویٰ ہو گیا -- تمام لوگوں کے سامنے اعلان کرتا ہے کہ ایک نسل کی زندگی کے اندر اندر وہ ایران کو (جو ایک پسماندہ، غیر منظّم، نصف جاہل اور برہنہ پا ملک ہے) دنیا کی پانچویں بڑی طاقت بنا دے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ شاہ "سب کے لیے خوش حالی" کا دلکش نعرہ لگا کر اپنی رعایا میں غیر معمولی امیدیں جگا دیتا ہے۔ اور پہلے پہل، جب ہر شخص جانتا ہے کہ شاہ کے پاس واقعی بے پناہ دولت آ گئی ہے، یہ امیدیں کچھ ایسی بے جا بھی معلوم نہیں ہوتیں۔

اس تصویر میں دکھائی گئی پریس کانفرنس کے چند ہی روز بعد شاہ (جرمن اخبار) "ڈیر اشپیگل" کو انٹرویو دیتے ہوئے کہتا ہے: "دس سال میں ہمارا بھی معیارِ زندگی وہی ہو گا جو تم جرمنوں، فرانسیسیوں اور انگریزوں کا ہے۔"

جنابِ عالی، کیا آپ واقعی یہ سمجھتے ہیں کہ دس سال میں ایسا کر پائیں گے؟ اخبار کا

نمائندہ حیران ہو کر پوچھتا ہے۔

"بے شک!"

مگر، حیرت زدہ صحافی کہتا ہے، مغرب کو تو اس معیارِ زندگی تک پہنچنے میں کئی نسلوں کا عرصہ لگا تھا۔ کیا آپ اس سارے عرصے کو پھلانگ جائیں گے؟

"بے شک!"

اب، جب محمد رضا اس ملک سے رخصت ہو چکا ہے، میں اس انٹرویو کے بارے میں سوچتا ہوں، اور شیراز کے پاس ایک گاؤں میں سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے نیم برہنہ بچّوں کے گھیرے میں، غلیظ کچّی جھونپڑیوں کے درمیان گوبر اور کیچڑ سے بھرے راستے پر چل رہا ہوں۔ ایک جھونپڑی کے سامنے ایک عورت گائے کے گوبر سے اُپلے تھاپ رہی ہے، جو خشک ہونے کے بعد (تیل اور گیس کے اس ملک میں!) اس کے گھر کے واحد ایندھن کا کام دیں گے۔ خیر، اس غمناک قدیم گاؤں سے گزرتے اور چند سال پہلے کے اُس انٹرویو کو یاد کرتے ہوئے، میرے ذہن میں پامال ترین خیال آتا ہے: کوئی انتہائی درجے کی لغویت بھی انسانی طبعِ ایجاد کی رسائی سے باہر نہیں ہے۔

لیکن اُس وقت تو مطلق العنان فرماں روا نے خود کو محل میں بند کر لیا اور سینکڑوں ایسے فرمان جاری کرنے لگا جنھوں نے اس کے پورے ملک کو کھنچاؤ میں مبتلا کر دیا اور آخر پانچ برس بعد اس کی معزولی پر منتج ہوئے۔ اس نے سرمایہ کاری کو دُگنا کرنے کا حکم دیا، بہت بڑے پیمانے پر ٹیکنولوجی کی درآمد شروع کرا دی اور دنیا کی تیسری سب سے زیادہ ترقی یافتہ فوج قائم کر دی۔ اس نے فرمان جاری کیا کہ جدید ترین مشینیں منگوائی جائیں اور انھیں نصب کر کے کام میں لایا جائے۔ جدید مشینیں جدید اشیا تیار کرتی ہیں، اور ایران اپنی اعلیٰ پیداوار کی بدولت دنیا بھر پر چھا جانے والا ہے۔ اس نے ایٹمی بجلی گھر، الیکٹرونکس کی فیکٹریاں، اسٹیل ملیں اور عظیم الشان صنعتی کمپلیکس قائم کرنے کا حکم دیا، اور خود یوروپ کے لذیذ موسمِ سرما سے لطف اندوز ہونے اور سینٹ مورٹز میں اسکی اِنگ کرنے کے لیے روانہ ہو گیا۔ لیکن سینٹ مورٹز میں اس کی دلکش اور نفیس قیام گاہ نے خاموش اور پُرسکون پناہ گاہ اور تعطیلات کا مقام ہونے سے انکار کر دیا، کیوں کہ ایک نئے ایلدورادو کی دریافت کی خبر تب تک پوری دنیا میں پھیل چکی تھی اور دنیا کے تمام طاقت ور تجارتی مقامات میں ہلچل شروع ہو گئی تھی اور ہر جگہ لوگ اس حساب کتاب میں جُٹ گئے تھے کہ ایران سے کس قدر

رقم بٹوری جا سکتی ہے۔ ویسے سنجیدہ اور باعزت سمجھے جانے والے ملکوں کی بظاہر معزز اور دولت مند حکومتوں کے وزرائے اعظم اور وزیر شاہ کی سوئس قیام گاہ کے باہر قطاریں لگانے لگے۔ شاہ آرام کرسی پر آتش دان کے سامنے بیٹھا ہاتھ تاپتے ہوئے تجویزوں، منصوبوں، پیش کشوں اور معاہدوں کی تفصیلات سنا کرتا۔ اب پوری دنیا اس کے قدموں میں تھی۔ اس کے سامنے جھکے ہوئے سر، خمیدہ گردنیں اور پھیلے ہوئے ہاتھ تھے۔ "دیکھیے،" وہ وزرائے اعظم اور وزیروں سے کہا کرتا، "آپ لوگ حکمرانی کے فن سے ناواقف ہیں، اسی لیے آپ کی حکومتیں قلاش ہیں۔" وہ لندن اور روم سے مخاطب ہو کر وعظ کرتا، پیرس کو نصیحتیں کرتا اور میڈرڈ کو ڈانٹتا ڈپٹتا۔ دنیا بڑی سعادت مندی سے اس کی باتیں سنا کرتی اور اس کی سخت ترین تنبیہیں بھی مسکینوں کی طرح برداشت کر جاتی، کیوں کہ وہ سونے کے اس عظیم ڈھیر پر نظریں جمائے ہوئے تھی جو ایرانی ریگستان میں بلند ہو رہا تھا۔ تہران میں متعین سفیر اپنی حکومتوں کی جانب سے آنے والے ان ٹیلیگراموں کے سیلاب سے حواس باختہ ہو گئے جن کا تعلق سونے کی اس لُوٹ سے تھا: شاہ سے ہم کیا حاصل کر سکتے ہیں؟ کتنی جلد اور کن شرائط پر؟ کیا کہا، ہمیں کچھ نہیں مل سکتا؟ کچھ دوڑ دھوپ کیجیے، سفیر صاحب! ہم عمدہ سروس اور بھرپور پبلسٹی کی ضمانت دیتے ہیں! ایران کے چھوٹے چھوٹے وزیروں کے کمروں کے باہر انتظار گاہوں میں شائستگی اور متانت کے بجائے دھکم پیل دکھائی دینے لگی، عقابی نظروں اور حریص ہاتھوں کی بِھیڑ لگ گئی۔ لوگ ایک دوسرے کی آستینیں کھینچتے، کہنیاں مارتے اور چیختے چلاتے۔ قطار میں آؤ! میری باری ہے! اس ہجوم میں ملٹی نیشنل کارپوریشنوں کے صدر، بے شمار کمپنیوں پر محیط گروپوں کے ڈائرکٹر، مشہور کمپنیوں کے نمائندے اور کم یا زیادہ معزز حکومتوں کے ایلچی شامل ہیں۔ اپنی اپنی باری پر ہر ایک اپنی تجویزیں اور منصوبے پیش کرتا ہے، ہوائی جہاز، کاریں، ٹیلی وژن، گھڑیاں تیار کرنے کے کارخانے فروخت کرنے کی سر توڑ کوشش کرتا ہے۔ ان معززین کے علاوہ -- جو عام حالات میں دنیا کے مالیاتی اور صنعتی سربراہوں کے طور پر ممتاز ہیں -- پورے ملک میں چھوٹی مچھلیوں، چھوٹے چھوٹے سودے کر کے پیسہ کمانے والوں اور نوسربازوں، سونے، جواہر، ڈسکوتیک، اسٹرِپ ٹیز، افیون، مے خانوں، ریزر کٹ اور سَرفنگ کے ماہروں کا سیلاب آ گیا ہے۔ یہ سب ایران میں داخل ہونے کے لیے ہاتھ پیر مار رہے ہیں، اور جب یوروپی شہروں کے ایرپورٹ پر نقاب پوش طلبا اُن کے ہاتھوں میں پمفلٹ تھمانے کی کوشش کرتے ہیں جن میں کہا گیا ہے

کہ لوگ اپنے وطن میں تشدّد سے ہلاک کیے جا رہے ہیں اور یہ کہ ساواک کے ہاتھوں میں جا پڑنے والوں کے بارے میں کوئی نہیں جانتا کہ وہ زندہ ہیں یا مر گئے، تو وہ ذرا بھی متاثر نہیں ہوتے۔ جب کمائی اچھی ہے اور ہر چیز شاہ کے عظیم تہذیب قائم کرنے کے نعرے کے سائے میں پیش آ رہی ہے تو ان باتوں کی کسے پروا ہے؟ اس عرصے میں محمّد رضا اپنی سرمائی تعطیل سے مطمئن اور ستایا ہوا لوٹ آیا ہے۔ آخر کار ہر طرف اس کی ستائش ہو رہی ہے: پوری دنیا میں اسے مثال بنا کر پیش کیا جا رہا ہے، اس کی عالی شان خصوصیات کو سراہا جا رہا ہے، اس بات کی خاص طور پر نشان دہی کی جا رہی ہے کہ دنیا کے اور مقامات پر گڑبڑ کرنے اور دھوکا دینے والے بہت سے لوگ ملتے ہیں لیکن شاہ کے ملک میں ایک بھی ایسا شخص نہیں ہے۔

بد قسمتی سے شاہ کی یہ طمانیت زیادہ عرصے برقرار رہنے والی نہیں ہے۔ ترقّی ایک دھوکے میں ڈالنے والا دریا ہے جیسا کہ اس دریا کی لہروں میں اترنے والے ہر شخص کو معلوم ہے۔ سطح پر پانی سکون سے اور روانی کے ساتھ بہتا جاتا ہے، لیکن جوں ہی کپتان سے ذرا بھی بے احتیاطی یا غلطی سرزد ہوئی اسے فوراً پتا چل جاتا ہے کہ اس پُرسکون سطح کے نیچے کتنے بھنور اور تہہ میں کتنے نوکیلے اُبھار موجود ہیں۔ جوں جوں جہاز ان رکاوٹوں کے نرغے میں آتا جاتا ہے، کپتان کی پیشانی پر لکیریں گہری ہوتی جاتی ہیں۔ وہ اپنے آپ کو دلاسا دینے کے لیے گنگناتا اور سیٹیاں بجاتا رہتا ہے۔ بظاہر جہاز بھی آگے بڑھتا محسوس ہوتا ہے، لیکن دراصل ایک ہی جگہ پر کھڑا حرکت کر رہا ہوتا ہے۔ سورما کے قدم کنارے کی ریت میں دھنس گئے ہیں۔ لیکن یہ سب بعد کی باتیں ہیں۔ فی الحال تو شاہ کروڑوں کی خریداری میں مشغول ہے، اور سامان سے لدے ہوئے جہاز بھاپ اُڑاتے ہر براعظم سے ایران کی سمت بڑھ رہے ہیں۔ لیکن ان جہازوں کے خلیج میں پہنچنے پر انکشاف ہوتا ہے کہ یہ چھوٹی چھوٹی ازکاررفتہ بندرگاہیں اس قدر بھاری سامان کے اتارنے کے لیے ناموزوں ہیں (شاہ کو اس کا اندازہ نہیں تھا)۔ سمندر میں سینکڑوں جہازوں کی بِھیڑ لگ گئی ہے اور چھ مہینے تک لگی رہتی ہے؛ اس مدّت کے لیے شاہ جہازراں کمپنیوں کو ایک بلین ڈالر سالانہ کے حساب سے ہرجانہ ادا کرتا ہے۔ بہرحال کسی نہ کسی طرح جہازوں پر سے سامان اتارا جاتا ہے، تب پتا چلتا ہے کہ بندرگاہوں پر اس سامان کے رکھنے کے لیے گودام نہیں ہیں (شاہ کو اس کا اندازہ نہیں تھا)۔ کھلی ہوا میں، ریگستان میں، ہولناک گرمی میں ہر قسم کا لاکھوں ٹن سامان پڑا ہوا ہے۔ اس میں سے آدھا

سامان، جو خراب ہو جانے والی کھانے کی چیزوں اور کیمیائی مادّوں پر مشتمل ہے، آخر پھینک دیا جاتا ہے۔ اب باقی سامان کو ملک کے مختلف حصّوں میں پہنچانے کا مرحلہ درپیش ہے، اور تب یہ معلوم ہوتا ہے کہ نقل و حمل کے ذرائع ناپید ہیں (شاہ کو اس کا اندازہ نہیں تھا)۔ صرف چند ٹرک اور ٹریلر دستیاب ہیں جو موجودہ ضرورت کو دیکھتے ہوئے بے حد ناکافی ہیں۔ چناں چہ یوروپ سے فوری طور پر دو ہزار ٹریکٹر ٹریلروں کا آرڈر دیا جاتا ہے؛ ان کے آنے پر پتا چلتا ہے کہ انھیں چلانے کے لیے ڈرائیور موجود نہیں ہیں (شاہ کو اس کا اندازہ نہیں تھا)۔ بہت مشاورت کے بعد ایک طیارہ سیول سے جنوبی کوریا کے ڈرائیوروں کو لانے کے لیے روانہ ہو جاتا ہے۔ اب ٹریلر سامان لاد کر حرکت میں آتے ہیں، مگر جوں ہی ڈرائیور فارسی کے تھوڑے بہت لفظ سیکھتے ہیں انھیں اندازہ ہو جاتا ہے کہ انھیں مقامی ڈرائیوروں کے مقابلے میں آدھی تنخواہ پر رکھا گیا ہے۔ وہ طیش میں آ کر سامان وہیں بیچ راستے میں چھوڑ کر کوریا لوٹ جاتے ہیں۔ یہ ٹریلر آج بھی غیر استعمال شدہ حالت میں بندر عباس سے تہران کو جانے والی سڑک پر ریت میں دھنسے کھڑے ہیں۔ بہرحال، رفتہ رفتہ نقل و حمل کی بیرونی کمپنیوں کی مدد سے فیکٹریاں اور مشینیں اپنی متعین جگہ پر پہنچا دی جاتی ہیں۔ اب انھیں جوڑ کر نصب کرنے کا وقت آتا ہے۔ مگر اس وقت معلوم ہوتا ہے کہ ایران میں انجینیروں اور ٹیکنیشینوں کا فقدان ہے (شاہ کو اس کا اندازہ نہیں تھا)۔ منطق کی رُو سے، عظیم تہذیب قائم کرنے کا عزم کرنے والے کو سب سے پہلے لوگوں پر توجہ دینی چاہیے، انھیں ہر میدان میں تربیت فراہم کرنی چاہیے تاکہ مقامی تعلیم یافتہ اور ہنرمند طبقے کی بنیاد پڑ سکے۔ لیکن ٹھیک یہی بات تو ناقابلِ برداشت تھی۔ نئی یونیورسٹیاں، نئے پولی ٹیکنک کھولے جائیں؟ بہت خوب! تاکہ ان میں سے ہر ایک شورشیوں کی پناہ گاہ بن جائے، ہر طالب علم باغی، ناکارہ اور آزاد خیال ہو جائے؟ اس میں تعجب کی کیا بات ہے کہ شاہ نے وہ دُرّہ تیار کرنے سے گریز کیا جس سے خود اُس کی کھال اُدھیڑی جانی تھی۔ شاہ کے پاس اس کا بہتر طریقہ موجود تھا -- اس نے ایرانی طلبا کی اکثریت کو وطن سے دور رکھا۔ اس نقطۂ نظر سے ایران ایک منفرد ملک تھا۔ ایک لاکھ سے زیادہ نوجوان ایرانی یوروپ اور امریکا میں پڑھ رہے تھے۔ اس پالیسی پر عمل کرنے کا خرچ مقامی یونیورسٹیاں قائم کرنے کے خرچ سے دُگنا تھا۔ لیکن اس سے حکومت کو قدرے سکون اور تحفظ کی ضمانت مل گئی۔ ان نوجوانوں میں سے اکثر ایران واپس نہیں آئے۔ آج سان فرانسسکو اور ہامبورگ میں پریکٹس کرنے والے ایرانی ڈاکٹروں کی تعداد تبریز

یا مشہد میں مقیم ڈاکٹروں کی نسبت کہیں زیادہ ہے۔ شاہ کی جانب سے خطیر مشاہروں کی پیش کش بھی انھیں لوٹنے پر آمادہ نہ کر سکی۔ وہ ساواک سے خوف زدہ تھے اور واپس جا کر ہر کسی کے تلوے چاٹنے پر مجبور ہونا نہیں چاہتے تھے۔ ایران میں مقیم ایرانی، ملک کے بہترین ادیبوں کی تحریریں پڑھنے سے محروم رہتے تھے (کیوں کہ یہ تحریریں صرف ملک سے باہر شائع ہوتی تھیں)، اپنے بہترین فلم ڈائرکٹروں کی فلمیں نہیں دیکھ سکتے تھے (کیوں کہ ایران میں ان کی نمائش ممنوع تھی)، اپنے دانشوروں کی باتیں نہیں سن سکتے تھے (کیوں کہ اُن کی زبان بند کردی گئی تھی)۔ شاہ نے لوگوں کے انتخاب کو ساواک اور ملاؤں کے درمیان محدود کردیا۔ اور انھوں نے ملاؤں کا انتخاب کیا۔ کسی آمریت کے زوال کے بارے میں سوچتے ہوئے کسی شخص کو اس گمان کا شکار نہیں ہونا چاہیے کہ اس زوال کے ساتھ پورا نظام، کسی بھیانک خواب کے ختم ہونے کی طرح، زمیں بوس ہو جاتا ہے۔ اس کا جسمانی وجود یقیناً ختم ہو جاتا ہے، لیکن اس کے نفسیاتی اور سماجی شاخسانے برسوں تک برقرار رہتے ہیں، یہاں تک کہ رویّوں کے تحت شعوری تسلسل میں باقی رہتے ہیں۔ دانشوری اور کلچر کو برباد کردینے والی آمریت اپنے پیچھے ایک خالی، بنجر زمین چھوڑ جاتی ہے جس میں فکر کا پودا جلد نہیں اگتا۔ اس زمین کے عقب میں بنی ہوئی باڑھوں، کونوں کھدروں اور کمیں گاہوں میں سے باہر آنے والے لازمی طور پر اعلیٰ ترین لوگ نہیں ہوتے، بلکہ اکثر وہ لوگ ہوتے ہیں جنھوں نے خود کو دوسروں کے مقابلے میں زیادہ مضبوط ثابت کیا؛ ان میں اکثر وہ لوگ نہیں ہوتے جو نئی اقدار کو جنم دے سکیں بلکہ موٹی کھال والے ہوتے ہیں جو اپنی سخت جانی کی بدولت زندہ بچ گئے۔ ایسے حالات میں تاریخ ایک المناک دائرۂ شر میں چکر کاٹنے لگتی ہے اور اس چکر سے آزاد ہونے میں ایک پورا عہد گزر جاتا ہے۔

لیکن یہاں ہمیں کچھ توقف کرنا چاہیے کیوں کہ واقعات کے آگے آگے جست لگانے کے سبب ہم نے اس عظیم تہذیب کو اس کے وقت سے پہلے ہی ختم کردیا ہے: ابھی تو وہ پوری طرح تعمیر بھی نہیں ہوئی۔ لیکن اسے یہاں کس طرح تعمیر کیا جائے؟ یہاں ماہرین کا کال ہے اور قوم اگر سیکھنے کا شوق رکھتی بھی ہو تو اسے سکھانے والے تعلیمی ادارے تو موجود ہی نہیں ہیں۔ اپنے رویا کو حقیقت میں لانے کے لیے شاہ کو سات لاکھ ماہرین کی فوری ضرورت ہے۔ کسی شخص کے ذہن میں محفوظ ترین اور بہترین ترکیب آتی ہے: انھیں درآمد کرلیا جائے۔ اس خیال میں سلامتی کے سوال کو سب سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے

کیوں کہ غیر ملکی اپنا کام کرنے، پیسہ بنانے اور لوٹ جانے کی فکر میں لگے رہیں گے اور انھیں سازشیں اور بغاوتیں کرنے اور ساواک کے سامنے آکھڑے ہونے سے کوئی دل چسپی نہیں ہوگی۔ عمومی طور پر، دنیا بھر میں انقلابوں کا راستا روکنے کا اس سے بہتر طریقہ کیا ہوسکتا ہے کہ مثلاً ایکوادور کے لوگ پیراگوے کی اور ہندوستان کے لوگ سعودی عرب کی تعمیر میں مشغول رہیں! اگر لوگوں کو ہِلا ہِلا کر ایک دوسرے کے ساتھ گوندھ دیا جائے، بکھیر دیا جائے، پھیلا دیا جائے، تو ہر طرف امن قائم ہوسکتا ہے۔ دسیوں ہزار غیر ملکیوں کی آمد شروع ہو گئی۔ طیارے ایک کے بعد ایک تہران کے ایرپورٹ پر اترنے لگے: گھریلو ملازم فلپینز سے، ہائیڈرولک انجینیئر یونان سے، الیکٹریشیئن ناروے سے، اکاؤنٹنٹ پاکستان سے، مکینک اٹلی سے، فوجی ماہرین ریاست ہائے متحدہ سے۔ آئیے شاہ کی اُس زمانے کی تصویروں پر ایک نگاہ ڈالیں: میونخ سے آئے ہوئے ایک انجنیئر کے ساتھ: میلان سے آئے ہوئے ایک فورمین کے ساتھ: بوسٹن سے آئے ہوئے ایک کرین آپریٹر کے ساتھ: کزنیتسک سے آئے ہوئے ایک ٹیکنیشیئن کے ساتھ۔ اور ان تصویروں میں نظر آنے والے ایرانی کون ہیں؟ وزرا، اور ساواک کے ایجنٹ جو شاہ کی حفاظت پر متعیّن ہیں۔ ان کے ہم وطن، جو ان تصویروں سے غائب ہیں، ان تمام منظروں کو حیرت سے پھیلتی ہوئی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ غیر ملکیوں کا یہ لشکر ـــ جس میں ہر شخص کو تکنیکی مہارت کی بدولت امتیاز حاصل ہے: یہ لوگ جانتے ہیں کہ کون سا بٹن دبانا ہے، کس لیور کو کھینچنا ہے، کن تاروں کو جوڑنا ہے ـــ اپنے انکسار کے باوجود، ایرانیوں پر فوقیت حاصل کر لیتا ہے اور انھیں احساسِ کمتری میں مبتلا کر دیتا ہے۔ غیر ملکی سب کچھ جانتے ہیں، اور میں کچھ نہیں جانتا! ایرانی غیرت مند لوگ ہیں اور اپنے وقار کے بارے میں حددرجہ حساس ہیں۔ کوئی ایرانی کبھی یہ اعتراف نہیں کرے گا کہ وہ کسی کام سے نابلد ہے: اس کے نزدیک یہ اعتراف شرم کی بات ہے اور اسے اس میں ہتک محسوس ہوتی ہے۔ وہ کُڑھنے لگے گا، بددل ہو جائے گا اور آخر کار نفرت کرنے لگے گا۔ ایرانیوں کو یہ بات محسوس کرنے میں ذرا دیر نہیں لگی کہ ان کا شہنشاہ کس تصوّر پر عمل کر رہا ہے۔ تم سب وہیں مسجد کی دیوار کے سائے میں بیٹھو اور اپنی بھیڑ بکریوں کی دیکھ بھال کرو، کیوں کہ تمھیں کار آمد بنانے میں سو سال چاہییں! میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے: مجھے غیر ملکیوں کی مدد سے دس سال کے اندر اندر ایک عالمی درجے کی سلطنت قائم کرنی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ عظیم تہذیب ایرانیوں کو اپنی عظیم توہین محسوس

ہوئی۔

فوٹوگراف ۱۰

یہ دراصل کوئی فوٹوگراف نہیں بلکہ ایک روغنی تصویر کا عکس ہے جس میں قصیدہ ساز مصوّر نے شاہ کو نپولین کے سے پوز میں پیش کیا ہے (وہی پوز جب فرانس کا یہ فرماں روا گھوڑے پر سوار، ایک فاتحانہ جنگ میں اپنی فوج کی قیادت کر رہا تھا)۔ یہ عکس ایران کی وزارت اطلاعات نے یقیناً شاہ کی منظوری کے ساتھ جاری کیا تھا جسے اس قسم کے موازنوں سے بڑی تسکین حاصل ہوتی تھی۔ بے شمار سنہری اور نُقرئی پٹّیاں، ڈھیروں تمغے، اور سینے پر ڈوریوں کی ایک نہایت پیچیدہ ترتیب؛ عمدہ سلی ہوئی یونیفارم محمّد رضا کے پُرکشش، ورزشی جسم کو نمایاں کر رہی ہے۔ یہ عکس اسے اس کے محبوب کردار میں پیش کرتا ہے: فوج کا کمانڈر۔ بے شک شاہ کو ہر وقت اپنی رعایا کی بہبود کی فکر رہتی تھی، وہ تیز رفتار ترقی کے مسائل سے نمٹنے میں مشغول رہتا تھا، وغیرہ وغیرہ، لیکن یہ سب کچھ وطن کے باپ کی حیثیت سے اس کے ناگزیر فرائض کا حصّہ تھا۔ اس کا اصل شوق، اس کا بنیادی شغف فوج سے تھا۔ اور یہ کوئی غیر متعلّق شغف نہیں تھا۔ فوج ہی ہمیشہ اس کے تخت کا سب سے اہم سہارا تھی، اور جوں جوں وقت گزرتا گیا اسے شاہ کے واحد سہارے کی حیثیت حاصل ہوتی گئی۔ اگر فوج بے ترتیب ہو جاتی تو شاہ کا وجود باقی نہ رہتا۔ لیکن مجھے اس ادارے کے لیے ''فوج'' کا لفظ استعمال کرتے ہوئے جھجک محسوس ہو رہی ہے، کیوں کہ اس سے آپ کے ذہن میں غیر حقیقی تلازمے جنم لے سکتے ہیں؛ دراصل یہ اندرونِ ملک دہشت کے ایک ذریعے کے سوا کچھ نہ تھی، یہ ایک طرح کی پولیس تھی جو بیرکوں میں رہا کرتی تھی۔ اس وجہ سے لوگ فوج کے مزید ترقّی پانے سے خوف اور دہشت میں مبتلا ہو جاتے تھے اور سمجھتے تھے کہ شاہ ایک اَور زیادہ خوفناک کوڑا تیار کر رہا ہے جو جلد یا بدیر لوگوں ہی کی پیٹھ پر برسایا جائے گا۔ فوج اور آٹھ قسم کی پولیس کے درمیان تقسیم محض رسمی تھی۔ پولیس کی ان آٹھ قسموں کی سربراہی شاہ کے مقرّب فوجی جنرلوں کے پاس تھی۔ فوج کو ساواک سے کم مراعات حاصل نہیں تھیں۔

(''فرانس میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد،'' ایک ایرانی ڈاکٹر نے یاد کیا، ''میں ایران واپس آ گیا تھا۔ میں اور میری بیوی فلم دیکھنے گئے اور ٹکٹ لینے کے لیے قطار میں کھڑے اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ ایک نان کمیشنڈ فوجی افسر نمودار ہوا اور قطار میں کھڑے لوگوں کے پاس

سے گزرتا ہوا سیدھا ٹکٹ گھر کی کھڑکی پر جا پہنچا۔ اس پر میرے منھ سے کوئی فقرہ نکل گیا۔ وہ چل کر میرے پاس آیا اور میرے منھ پر زور کا تھپڑ رسید کیا۔ مجھے ساکت کھڑے رہ کر اسے برداشت کرنا پڑا، کیوں کہ قطار میں کھڑے ہوئے لوگوں کی نظروں نے مجھے بتا دیا کہ احتجاج کیا تو مجھے قید میں ڈال دیا جائے گا۔") اس لیے شاہ کو فوجی یونیفارم پہن کر بہت سکون ملتا تھا اور اس کا بیشتر وقت فوج کے معاملات کی دیکھ بھال میں گزرتا تھا۔ مغربی ملکوں سے شائع ہونے والے اُن ڈھیروں رسالوں کی ورق گردانی برسوں تک شاہ کا محبوب ترین مشغلہ رہا جن میں جدید ترین ہتھیار بنانے اور بیچنے والے اپنی مصنوعات کے باتصویر اشتہار دیا کرتے ہیں۔ محمد رضا ایسے تمام رسالوں کا خریدار تھا اور ان کے ایک ایک صفحے کو غور سے دیکھتا تھا۔ نگاہ میں کُھب جانے والا ہر کھلونا خریدنے کی استطاعت حاصل کرنے سے پہلے، برسوں تک وہ ان رسالوں پر نظر جمائے، یہ خواب دیکھنے میں منہمک رہتا کہ شاید امریکی یہ ٹینک یا وہ جہاز اسے بخش دیں۔ اور امریکا نے اسے واقعی بے شمار چیزیں فراہم کیں، لیکن کوئی نہ کوئی سینیٹر کھڑا ہو کر پینٹاگون پر اعتراض شروع کر دیتا کہ شاہ کو اس قدر ہتھیار کیوں دیے جا رہے ہیں۔ اس سے فراہمی میں کچھ عرصے کے لیے کمی ہو جایا کرتی۔ لیکن اب، جبکہ شاہ تیل کی دولت سے مالامال تھا، اس کی محرومیاں ختم ہو چکی تھیں۔ وہ یہ رسالے اور ہتھیاروں کے کیٹلاگ اور زیادہ استغراق سے پڑھنے لگا۔ تہران سے انتہائی انوکھے آرڈر مسلسل جاری ہونے لگے۔ برطانیہ کے پاس کتنے ٹینک ہیں؟ پندرہ سو؟ ٹھیک ہے، شاہ کہتا، میں دو ہزار ٹینک منگواؤں گا۔ جرمن فوج کے پاس کتنی توپیں ہیں؟ ایک ہزار؟ خوب! ہمیں پندرہ سو بھجوا دیجیے۔ لیکن برطانوی اور جرمن فوجوں سے مقابلہ کس لیے؟ کیوں کہ ہمیں دنیا کی تیسری بڑی فوج تیار کرنی ہے۔ افسوس کہ ہم پہلا یا دوسرا مقام حاصل نہیں کر سکتے، لیکن تیسرا مقام یقیناً ہماری دسترس میں ہے اور اسے ہم ضرور حاصل کریں گے۔ اس طرح ایک بار پھر جہاز بھاپ اُڑانے لگے، طیارے پرواز کرنے لگے، اور ٹرک ایران کی سمت روانہ ہو گئے: ان سب پر انسان کے ایجاد اور تیار کیے ہوئے جدید ترین ہتھیار لدے ہوئے تھے۔ کارخانے قائم کرنے میں جتنی دقتوں کا سامنا ہوتا ہے، ٹینکوں کی آمد اتنی ہی دلکش محسوس ہونے لگتی ہے۔ یوں بہت جلد ایران نے خود کو ہر قسم کے ہتھیاروں اور فوجی آلات کی ایک بہت بڑی نمائش گاہ میں تبدیل کر لیا۔ یہاں "نمائش گاہ" ہی موزوں ترین لفظ ہے کیوں کہ اس تمام سامان کو محفوظ رکھنے کے لیے ملک میں گوداموں، مخزنوں اور ہینگروں کی بے حد قلّت ہے۔ یہ ایک بے نظیر

نمائش ہے۔ اگر آج بھی آپ شیراز سے سڑک کے راستے اصفہان جائیں تو ہائی وے کے داہنے ہاتھ سینکڑوں ہیلی کوپٹر کھڑے دیکھ سکتے ہیں۔ بے حرکت مشینوں کے پُرزوں میں ریت رفتہ رفتہ جمتی جا رہی ہے۔

فوٹوگراف ۱۱

مہر آباد ایرپورٹ پر کھڑا ہوا لفتانزا ایرلائن کا ایک جہاز۔ یہ کوئی اشتہار معلوم ہوتا ہے، مگر اس جہاز کو اشتہار بازی کی کوئی ضرورت نہیں ہے کیوں کہ اس کی تمام نشستیں فروخت ہو چکی ہیں۔ یہ جہاز ہر روز تہران سے پرواز کرتا اور دوپہر کے وقت میونخ پہنچتا ہے۔ منتظر لیموزین کاریں مسافروں کو لے کر عمدہ ریستورانوں میں کھانا کھلانے لے جاتی ہیں۔ کھانے کے بعد وہ سب اسی جہاز میں سوار ہو کر تہران واپس آ جاتے ہیں اور رات کا کھانا اپنے گھر پر کھاتے ہیں۔ یہ کوئی ایسی مہنگی تفریح نہیں ہے: فی کس صرف دو ہزار ڈالر خرچ آتا ہے۔ جنھیں شاہ کی خوشنودی حاصل ہے اُن کے لیے یہ رقم کیا حیثیت رکھتی ہے۔ درحقیقت یہ لوگ محل کے ادنیٰ ملازم ہیں جو دوپہر کا کھانا میونخ جا کر کھاتے ہیں۔ نسبتاً اونچی حیثیت کے لوگوں کی طبیعت اتنے طویل سفر کی صعوبتیں اٹھانے پر آمادہ نہیں ہوتی۔ اُن کے لیے ایرفرانس کا ایک طیارہ پیرس کے ماکسیم ریستوراں سے ہر روز کھانا، مع باورچیوں اور ویٹروں کے، لے کر پہنچتا ہے۔ یہ کوئی ایسا غیر معمولی شوق نہیں ہے۔ پریوں کی کہانیوں کے سے اُن خزانوں کے مقابلے میں جو شاہ اور اس کے لوگ جمع کر رہے ہیں، اس شوق کی قیمت ایک کوڑی سے زیادہ نہیں ہے۔ عام ایرانیوں کی نظر میں یہ عظیم تہذیب، شاہ کا برپا کیا ہوا انقلاب، دراصل ان مراعات یافتہ افراد کے ہاتھوں ایک بہت بڑی لوٹ کھسوٹ تھی۔ ہر شخص جسے تھوڑا بہت اختیار حاصل تھا اس چوری میں شریک تھا۔ جو شخص کسی بڑے عہدے پر ہونے کے باوجود چوری نہیں کرتا تھا اس کے اردگرد کی زمین بنجر ہو جاتی؛ ہر شخص اس پر شک کرنے لگتا۔ لوگ اسے ایجنٹ سمجھنے لگتے جسے یہ دیکھنے کی غرض سے بھیجا گیا ہو کہ کون کتنی چوری کر رہا ہے، کیوں کہ ان کے دشمنوں کو ایسی اطلاعات کی ہمیشہ ضرورت رہتی تھی۔ جوں ہی ممکن ہوتا ایسے شخص سے فوراً نجات حاصل کی جاتی کیوں کہ وہ کھیل بگاڑتا تھا۔ اس طرح تمام قدروں نے اپنے برعکس معنی اختیار کر لیے۔ جو کوئی ایمانداری سے کام کرتا اسے تنخواہ دار ایجنٹ سمجھا جاتا۔ اگر کسی کے ہاتھ صاف ہوتے تو اسے ان کو

احتیاط سے چھپانا پڑتا کیوں کہ پاکیزگی ایک شرمناک اور ناشائستہ چیز سمجھی جانے لگی تھی۔ عہدہ جتنا اونچا ہوتا جیبیں اُتنی ہی پُر ہوتیں۔ جو شخص کوئی فیکٹری لگانے، کاروبار شروع کرنے یا کپاس اگانے کا ارادہ کرتا اسے اپنے سرمائے کا ایک حصّہ شاہ کے خاندان یا حکومت کے کسی بااثر اہلکار کو نذر کرنا پڑتا۔ لوگ ایسی نذریں ہنسی خوشی دیا کرتے تھے، کیوں کہ کوئی بھی کاروبار چلانے کے لیے دربار کی پُشت پناہی حاصل کرنا ضروری تھا۔ پیسے اور اثرورسوخ سے سب رکاوٹیں دور ہوجاتیں۔ دولت خرچ کرنے سے اثرورسوخ بڑھتا جسے استعمال کرکے مزید دولت حاصل کی جاتی۔ شاہ، اس کے خاندان اور دربار کے لوگوں کے خزانوں میں داخل ہونے والی دولت کے بہاو کو تصوّر میں لانا دشوار ہے۔ شاہ کے خاندان کو دی جانے والی رشوت سو ملین ڈالر یا اس سے زیادہ ہوتی تھی۔ وزیراعظم اور جنرل تیس سے پچاس ملین ڈالر تک رشوت لیتے تھے۔ نیچے آتے آتے رشوت کی رَقم کم ہوتی جاتی تھی لیکن ختم کہیں نہیں ہوتی تھی۔ جوں جوں قیمتیں بڑھتیں رشوت کی رقم بھی بڑھتی جاتی؛ اور عام لوگوں کی آمدنی کا زیادہ سے زیادہ حصّہ بدعنوانی کے دیوتا کی نذر ہونے لگتا۔ پرانے زمانے میں ایران میں اونچے عہدوں کی نیلامی کا دستور تھا۔ بادشاہ گورنر کے عہدے کی سرکاری قیمت کا اعلان کرتا اور جس کی بولی سب سے زیادہ ہوتی اسے گورنری سونپ دی جاتی۔ بعد میں گورنر رعایا کو لُوٹ کر اپنی رقم (مع سود کے) حاصل کرلیتا۔ یہ دستور ایک نئی صورت میں زندہ کیا گیا: شاہ لوگوں کو خریدنے کی غرض سے انھیں فوجی اور دیگر سامان کی خریداری کے معاہدے طے کرنے کے لیے بیرونِ ملک بھیجا کرتا۔

شاہ کی اس عظیم دولت نے ایک نئے طبقے کو جنم دیا جس سے تاریخ اور عمرانیات کے ماہر اب تک ناواقف رہے تھے: پیٹرو۔بُورژوازی۔ یہ عجیب الخلقت طبقہ کچھ بھی پیدا نہیں کرتا تھا اور اس کی تمام تر مصروفیت بے محابا اصراف تک محدود تھی۔ کسی شخص کا اس طبقے میں شامل ہونا نہ تو جاگیرداری کی طرح سماجی کش مکش پر منحصر تھا اور نہ صنعت اور تجارت کی طرح مسابقت پر: ان کی تمام کش مکش اور مسابقت صرف شاہ کی خوشنودی اور مہربانی حاصل کرنے کے لیے تھی۔ کوئی شخص ایک دن میں، بلکہ چند منٹ میں، ترقی پاکر اس طبقے میں پہنچ سکتا تھا: اس کے لیے صرف شاہ کے حکم یا دستخط کی ضرورت تھی۔ جو شخص شاہ کو سب سے زیادہ خوش رکھ سکے، سب سے بہتر طریقے سے اور سب سے زیادہ لگن کے ساتھ اس کی چاپلوسی کرسکے، اسے اپنی وفاداری اور تابعداری کا یقین دلاسکے، اس طبقے میں شامل ہوسکتا تھا۔

یہ مفت خور طبقہ بہت جلد تیل کی آمدنی کے خاصے بڑے حصّے پر قابض ہو کر ملک کا مالک بن بیٹھا۔ یہ لوگ اپنی نفیس ولاؤں میں غیر ملکی مہمانوں کو مدعو کرتے اور ایران کے بارے میں ان کی رائے کی تشکیل کرتے (اگرچہ خود میزبانوں کی ایران کے کلچر سے واقفیت اکثر سرسری ہوتی تھی)۔ ان کے ادب آداب عالمی درجے کے ہوتے اور وہ یوروپی زبانیں بولا کرتے -- یوروپ کے لوگوں کو ان پر اعتماد کرنے کے لیے اور کیا چاہیے تھا؟ لیکن یہ میزبانیاں کتنی گمراہ کن تھیں، یہ ولائیں اُن مقامی حقائق سے کس قدر دور واقع تھیں جو بہت جلد اپنی آواز پا کر پوری دنیا کو جھنجھوڑ دینے والے تھے! جس طبقے کی ہم بات کر رہے ہیں اس کے ارکان خود حفاظتی کی جبلّت کی روشنی میں جانتے تھے کہ ان کی خوش قسمتی اپنی چمک دمک کے باوجود نہایت عارضی ہے۔ وہ سب پہلے دن سے اپنے سوٹ کیس تیار رکھا کرتے اور رقم باہر بھیج بھیج کر یوروپ اور امریکا میں جائیدادیں خریدا کرتے۔ لیکن اتنی بڑی رقم کا تھوڑا سا حصّہ ان کو ایران میں ایک پُرآسائش زندگی مہیا کرنے کے لیے کافی تھا۔ تہران میں انتہائی تعیّشانہ بستیاں آباد ہونے لگیں جن کا طمطراق اور آسائشیں دیکھنے والے کو حیرت زدہ کر دیتی تھیں۔ ان میں ہر مکان ایک ملین ڈالر سے زیادہ مالیت کا تھا۔ یہ بستیاں شہر کے اُن علاقوں سے صرف چند قدم کے فاصلے پر واقع تھیں جہاں پورے پورے خاندان تنگ و تاریک کوٹھریوں میں، بجلی اور پانی کی سہولت سے محروم، رہا کرتے تھے۔ اس قسم کے مراعات یافتہ اصراف کے سلسلے میں ہونا تو یہ چاہیے کہ پوری احتیاط اور رازداری برتی جائے -- لے لو، چھپا لو، کچھ نظر نہ آئے؛ دعوت ضرور ہو، مگر پہلے کھڑکیوں کے پردے برابر کر دو؛ محل ضرور بناؤ مگر آبادی سے دور تاکہ کوئی اسے دیکھ کر مشتعل نہ ہو -- کسی دوسری جگہ یہی ہوتا، لیکن یہاں نہیں۔ یہاں کا رواج یہ ہے کہ اپنی دولت کی بھرپور نمائش کرو تاکہ دیکھنے والوں کا سانس رک جائے، ہر چیز لوگوں کی نظروں کے سامنے رہے، ساری بتّیاں جلتی رہیں، سب کی آنکھیں خیرہ کر دو، سب کو اپنے احترام میں جھکنے پر مجبور کر دو! اگر چُھپا کر رکھنا ہو تو دولت جمع کرنے کا فائدہ ہی کیا! یہ تو صرف دولت کی افواہ ہوئی۔ نہیں، اس طرح دولت رکھنا بے کار ہے۔ اگر دولت ہے تو چاہیے کہ لوگ آئیں، دیکھیں، یہاں تک کہ اُن کی آنکھیں اُبل پڑیں۔ یوں خاموش اور روز بروز مشتعل ہوتے ہوئے عوام کی آنکھوں کے سامنے اس نئے طبقے نے اپنی تعیّشانہ زندگی کی نمائش جاری رکھی؛ اس طبقے کی بے راہ روی، غارت گری اور کلبیت کی کوئی حد نہیں تھی۔ اسی طرزِ عمل سے وہ آگ بھڑکی جس میں یہ طبقہ، اپنے خالق اور محافظ

سمیت، جل کر خاک ہو جانے والا تھا۔

فوٹو گراف ۱۲

یہ ایک کیری کیچر کا عکس ہے جو حزبِ مخالف کے کسی آرٹسٹ نے انقلاب کے دوران بنایا تھا۔ اس میں تہران کی ایک سڑک دکھائی گئی ہے جس پر سے لمبی چمک دار امریکی کاریں —— بے تحاشا تیل پینے والی بلائیں —— گزرتی جا رہی ہیں۔ سڑک کے کناروں پر مایوس چہروں والے لوگ کھڑے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کے ہاتھ میں کار کا کوئی نہ کوئی حصّہ ہے: دروازے کا ہینڈل، فین بیلٹ، یا گیئر۔ کارٹون کے نیچے لکھا ہے: "ہر ایک کے لیے ایک پیکان!" (پیکان ایک ارزاں ایرانی کار کا نام ہے۔) جب شاہ کے پاس بے پناہ دولت آئی تو اس نے دعویٰ کیا کہ ہر ایرانی اپنی ذاتی کار خرید سکے گا۔ یہ کارٹون بتاتا ہے کہ یہ عہد کس طرح پورا کیا گیا۔ سڑک کے اوپر ایک بادل تیر رہا ہے جس پر شاہ غصّے میں بھرا بیٹھا ہے۔ شاہ کے سر کے اوپر یہ تحریر لکھی ہوئی ہے: "محمد رضا اس قوم سے ناخوش ہے کیوں کہ وہ ترقی کو تسلیم نہیں کرتی۔" یہ ایک دلچسپ ڈرائنگ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایرانیوں کے نزدیک شاہ کی تخلیق کی ہوئی عظیم تہذیب ایک عظیم ناانصافی تھی۔ ایرانی معاشرے میں مساوات کا یوں تو کبھی کوئی تصوّر نہیں رہا تھا، لیکن شاہ کی بنائی ہوئی تہذیب نے طبقوں کے درمیان کی خلیج کو بے پناہ وسیع کر دیا۔ شاہوں کے پاس رعایا سے زیادہ دولت کا ہونا تو قرینِ قیاس بات تھی لیکن شاہ کا ایک بہت بڑے تاجر کے طور پر تصوّر کرنا دشوار تھا۔ شاہوں کو دربار کا مقام برقرار رکھنے کے لیے کچھ نہ کچھ رعایتیں فروخت کرنی پڑتی تھیں۔ شاہ نصرالدین پیرس کے قحبہ خانوں میں اس قدر مقروض ہو گیا تھا کہ اسے قرض خواہوں سے جان چھڑا کر واپس ایران آنے کے لیے فرانسیسیوں کو یہ اختیار دینا پڑا کہ وہ ایرانی آثارِ قدیمہ کی کھدائی کر سکتے ہیں اور اس عمل کے درمیان جو اشیا برآمد ہوں انھیں اپنے ساتھ لے جا سکتے ہیں۔ لیکن یہ ماضی کی بات تھی۔ اب سن ستّر کے بعد کی دہائی کے وسط میں ایران میں دولت کے انبار جمع ہو گئے تھے۔ اور شاہ اس دولت کا کیا کر رہا تھا؟ آدھی دولت فوج پر خرچ ہوتی تھی، کچھ حصّہ بااثر لوگوں کے پاس چلا جاتا تھا، اور باقی ترقی پر صرف ہوتا تھا۔ لیکن اس لفظ "ترقی" کا کیا مطلب ہے؟ ترقی کسی الگ تھلگ، مجرّد تصور کا نام نہیں ہے۔ اس کا تعلق کسی نہ کسی شخص، کسی نہ کسی چیز سے ہوتا ہے۔ ترقی کسی معاشرے میں زندگی کو

بہتر، زیادہ خوش حال، زیادہ آزاد، زیادہ منصفانہ بنا سکتی ہے -- لیکن ترقی اس کے برعکس نتائج بھی پیدا کر سکتی ہے۔ آمرانہ معاشروں میں (جہاں مراعات یافتہ لوگ اپنے مفادات ریاست کے ساتھ پیوست کر لیتے ہیں جو ان کے اقتدار کی ضامن ہوتی ہے) یہی صورتِ حال پیدا ہوتی ہے۔ ایسے معاشروں میں ترقی کا مطلب ریاست اور اس کی جابرانہ مشینری کو مزید طاقتور کر کے آمریت، محکومیت، بنجرپن، ابہام اور وجود کے خالی پن کو مستحکم کرنا ہوتا ہے۔ جس ترقی کو عظیم تہذیب کے نام پر تیار کر کے ایران کے ہاتھ فروخت کیا گیا اسی قسم کی ترقی تھی۔ کیا اس کے ردِ عمل میں ایرانیوں کا اٹھ کھڑا ہونا اور بے پناہ قربانیاں دے کر اس ترقی کو تباہ و برباد کر ڈالنا قابلِ ملامت بات تھی؟

نوٹس ٦

(تلخیص)

شیعہ بنیادی طور پر ہمیشہ سے حزبِ مخالف رہے ہیں۔ اس کا سبب ان کا یہ احساس ہے کہ مسلمانوں کی سنّی اکثریت کے ہاتھوں ان کی حق تلفی ہوتی رہی ہے۔ خلافت کے اختلافات اور کربلا کے سانحے کے بعد اقتدار سنّی بنوامیہ اور بنوعبّاس کے ہاتھوں میں رہا اور آخر ترکی کے عثمانیوں تک پہنچا۔ خلافت، جس کا ابتدائی تصوّر ایک سادہ اور منکسر ادارے کے طور پر کیا گیا تھا، رفتہ رفتہ نسلی ملوکیت میں تبدیل ہو گئی۔ یہی حالات تھے جن کے سبب فرومایہ اور دیندار شیعوں نے فتح مند سنّی شہنشاہوں کے ستم اٹھا کر حزبِ مخالف کی شکل اختیار کر لی۔

ان سب واقعات کا تعلّق ساتویں صدی عیسوی سے ہے، لیکن ان کی یاد ایک زندہ اور جذبے سے دھڑکتی ہوئی تاریخ کی صورت میں آج بھی موجود ہے۔ اپنے عقائد کے بارے میں بات کرتے ہوئے شیعہ بار بار اس دورِ دراز کی تاریخ کی طرف پلٹتے ہیں اور کربلا کے سانحے کو یاد کرتے ہوئے آنکھوں میں آنسو لے آتے ہیں۔ تشکیک پسند یوروپی سوچتے ہیں کہ ان سب واقعات کا آج کی دنیا سے کیا تعلّق ہے، لیکن ان خیالات کا اظہار شیعوں کے غصّے اور نفرت کا موجب بن سکتا ہے۔

شیعوں کے نصیب میں ایک الم ناک تاریخ آئی ہے، اور تاریخی ناانصافیوں اور بدقسمتیوں کا گہرا احساس ان کے شعور کا حصّہ ہے۔ دنیا میں ایسی کئی برادریاں موجود ہیں

جن کے ساتھ کچھ بھی ٹھیک نہیں ہوا۔۔ ہر چیز ان کے ہاتھوں سے نکلتی اور امید کی ہر کرن پیدا ہوتے ہی تاریکی میں ڈوب جاتی رہی۔۔ ان کی تقدیروں پر گویا شکست کی مُہر لگی ہوئی ہے۔ شیعوں کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہے۔ ممکن ہے ان کی گھری سنجیدگی، اپنے دلائل اور اصولوں پر جامد اصرار اور غم ناکی کی یہی وجہ ہو۔

مسلمانوں کی آبادی کے تقریباً دسویں حصے پر مشتمل اس برادری کے مخالفت اختیار کرنے کے بعد ان پر ظلم و ستم کا صدیوں طویل سلسلہ شروع ہو گیا جس کی یاد آج بھی ان کے ذہنوں میں باقی ہے۔ رفتہ رفتہ انھوں نے خود کو اپنی تنگ و تاریک بستیوں میں قید کر لیا، ایسے اشارے استعمال کرنا شروع کر دیے جنھیں ان کے سوا کوئی نہ سمجھ سکتا تھا اور ساز باز سے ملتا جلتا طرزِ عمل اختیار کر لیا۔ لیکن اس کے باوجود انھیں حملوں سے نجات نہ مل سکی۔

اس پر انھوں نے ایسے مقامات کی تلاش شروع کر دی جہاں وہ ستم کی زد سے باہر زندگی گزار سکیں۔ دشوار اور سست رفتار رابطوں کے اُس زمانے میں جب جغرافیائی دوری سلامتی کا وسیلہ بن سکتی تھی، شیعوں نے اقتدار کے مرکزوں (پہلے دمشق اور پھر بغداد) سے دور جا بسنے کا ارادہ کیا۔ وہ پہاڑوں اور ریگستانوں کو عبور کر کے دنیا بھر میں پھیل گئے، اور قدم بہ قدم زیرِ زمین اترتے چلے گئے۔ شیعوں کا رزمیہ ہجرت، حوصلے اور روحانی قوت کے ناقابلِ یقین واقعات سے بھرپور ہے۔ شیعوں کے ایک گروہ نے مشرق کا رخ کیا اور دجلہ اور فرات عبور کر کے کوہِ زگروس کے پار ایرانی سطح مرتفع تک جا پہنچا۔

اُس زمانے میں ایران، بزنطیم کے ساتھ صدیوں طویل جنگ سے بے حال اور تباہ ہو کر عربوں کے قبضے میں آ چکا تھا۔ ایران کے ساسانی خاندان کے قدیم زرتُشتی مذہب کے مقابلے میں فتح مند عرب سنی اسلام کی تبلیغ کر رہے تھے۔ یہ عمل سست رفتاری سے جاری تھا۔ ایرانیوں کے لیے فاتح قوم کا غیر ملکی مذہب قبول کرنا دشوار تھا اور وہ اس کی مسلسل مزاحمت کر رہے تھے۔

عین اس موقعے پر مفلس اور خستہ حال شیعوں کا گروہ اپنے بدنوں پر ستم کے نشان لیے وارد ہوا۔ ایرانیوں پر انکشاف ہوا کہ یہ بھی مسلمان ہیں، بلکہ دوسرے فرقے سے بہتر مسلمان ہونے کا دعویٰ رکھتے ہیں اور اپنے عقائد پر قائم رہنے کے لیے ہر طرح کی قربانی دینے کو تیار ہیں۔ ایرانیوں کو معلوم ہوا کہ مسلمان ہوتے ہوئے بھی مقتدر مسلمانوں کی مخالفت میں ڈٹے رہنا ممکن ہے۔ اس طرح مفتوح اور شکست خوردہ ایرانیوں کو خستہ حال شیعوں سے ہمدردی

ہو گئی اور ان کی تبلیغ کے اثر سے انھوں نے رفتہ رفتہ شیعہ اسلام اختیار کر لیا۔

ان واقعات سے ایرانیوں کی اس صلاحیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے جس کی مدد سے انھوں نے ہمیشہ محکومیت کے زمانے میں اپنی آزادروی کو برقرار رکھا ہے۔ ایران صدیوں سے جارحیت، شکست اور انتشار کا شکار تھا۔ غیر ملکی، یا غیر ملکیوں کی حمایت سے برسرِ اقتدار آنے والی مقامی، حکومتیں انھیں اپنا محکوم بنائے ہوئے تھیں۔ اس کے باوجود انھوں نے اپنی تہذیب اور زبان، اپنی شاندار شخصیت اور راکھ ہو کر دوبارہ جی اٹھنے کی صلاحیت پر آنچ نہ آنے دی۔ پچیس صدیوں پر پھیلی ہوئی ایرانی تاریخ بتاتی ہے کہ انھوں نے خود کو محکوم بنانے کی ہر کوشش کو آخرکار ناکام کر دیا۔ اس مقصد کے لیے انھیں کبھی بغاوت اور انقلاب کا راستا اختیار کرنا پڑا اور انھوں نے اپنے خون سے اس کی قیمت ادا کی۔ کبھی انھوں نے انفعالی مزاحمت کا طریقہ چنا اور اس پر ہوشیاری اور ثابت قدمی سے قائم رہے۔ جب کبھی کوئی حکومت ایرانیوں کے لیے ناقابل برداشت ہو جاتی ہے تو پورا ملک گویا منجمد ہو کر نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ حکمراں حکم جاری کرتے ہیں جن کی کوئی تعمیل نہیں کرتا، وہ غیظ و غضب کا اظہار کرتے ہیں لیکن کوئی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا، حکمراں اپنی آواز بلند کرتے ہیں جو صدا بصحرا ثابت ہوتی ہے۔ تب حکمرانی کا پورا نظام تاش کے پتّوں سے بنے محل کی طرح زمین پر آ رہتا ہے۔ لیکن ان دونوں طریقوں سے بڑھ کر ایرانیوں کی یہ تکنیک ہے کہ وہ غیر ملکی فاتحوں کو اپنے معاشرے میں جذب کر کے اُن کی تلوار کو ایرانی تلوار میں تبدیل کر دیتے ہیں۔

عربوں کے ہاتھوں ایران کی فتح کے بعد یہی معاملہ پیش آیا۔ ایرانیوں نے اسلام کو اختیار کر لیا لیکن اس میں اپنا قومی رنگ اور آزاد، باغیانہ انداز شامل کر دیا۔ اس طرح ان کا مذہب ان کی روح، ان کی تہذیب اور ان کی آزادی کا اظہار بن گیا۔ انھوں نے شیعوں کے مسلک کو قبول کیا جو خود کو مظلوم اور مفتوح سمجھتے تھے، اپنے عقائد کو مزاحمت کے ہتھیار کے طور پر برتتے تھے اور اپنے اصولوں پر قائم رہنے کے لیے ہر زحمت اٹھانے کو تیار تھے۔ شیعہ اسلام ایرانیوں کے لیے نہ صرف ان کا مذہب بلکہ ان کی پناہ گاہ اور ان کی قومی حیات کا تسلسل بھی ثابت ہوا۔

ایران مسلمان سلطنت کا سب سے مضطرب صوبہ بن گیا جہاں سے ہمیشہ سازشیں اور بغاوتیں اٹھا کرتیں؛ نقاب پوش پیغام رساں نمودار ہوتے اور غائب ہوتے رہتے؛ خفیہ

تحریریں گردش میں رہا کرتیں۔ سلطانوں کے بھیجے ہوئے عرب گورنر سختی برتتے جس کا نتیجہ ان کی خواہش کے برعکس نکلتا۔ سرکاری دہشت کے جواب میں ایرانی شیعوں نے مسلّح مزاحمت کا راستا اختیار کیا لیکن یہ راستا دوبدو مقابلے کا نہیں تھا کیوں کہ اس کی ان میں طاقت نہیں تھی۔ اس زمانے کے بعد سے ایرانی شیعوں میں ایک گروہ ہمیشہ ایسا رہنے لگا جو مسلّح مزاحمت پر آمادہ رہتا ہے۔ آج بھی ایران میں ایسی چھوٹی چھوٹی دہشت پسند تنظیمیں کام کر رہی ہیں جن کے ارکان خوف یا رحم سے ناواقف ہیں۔ جتنی ہلاکتوں کا الزام ملّاؤں پر عائد کیا جاتا ہے ان میں سے نصف سے زیادہ ایسی ہی تنظیموں کے حکم پر انجام دی گئی ہیں۔ عمومی اعتبار سے تاریخ شیعوں کا حزبِ مخالف کی جانب سے مزاحمت کے ہتھیار کے طور پر انفرادی دہشت پسندی کے نظریے اور عمل کا بانی خیال کرتی ہے۔

ستائے ہوئے اور پناہ کی تلاش میں مارے مارے پھرنے والے ہر گروہ کی طرح شدید جذبہ، راسخ العقیدگی، اور نظریاتی درستی پر سخت اصرار شیعوں کی بھی بنیادی خصوصیات ہیں۔ کوئی ستایا ہوا شخص اپنے انتخاب کے درست ہونے پر غیر متزلزل ایمان رکھے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ اسے ہر قیمت پر اُن اقدار کی حفاظت کرنی ہوتی ہے جنھوں نے اسے اس راستے کے انتخاب پر آمادہ کیا۔ اس گروہ میں پیدا ہونے والے تمام تفرقوں میں ایک بات مشترک رہی ہے: یہ سب، آج کل کی سیاسی اصطلاح میں، انتہائی بائیں بازو سے تعلق رکھتے تھے۔ کچھ عرصہ گزرنے پر کوئی نہ کوئی شدّت پسند شاخ پھوٹ نکلتی جو باقی اکثریت کو تن آسانی، مفاہمت اور مصلحت کوشی کا طعنہ دیا کرتی۔ اس کا اثر یہ ہوتا کہ پُرجوش جوانوں کا ایک نہ ایک گروہ اکثریت کی بے عملی کی اپنے خون سے تلافی کرنے کے لیے تلواریں سونت کر اسلام کے دشمنوں کو ختم کرنے نکل کھڑا ہوتا اور اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھتا۔

ایرانی شیعہ آٹھ سو سال تک زیرِزمین اور سردابوں میں پناہ لینے پر مجبور رہے ہیں۔ کبھی کبھی خیال ہوتا کہ ان کو مکمّل طور پر نیست و نابود کر دیا جائے گا۔ انھیں برسوں تک پہاڑوں اور غاروں میں روپوش رہنا اور بھوکوں مرنا پڑا۔ لیکن اس دوران نسبتاً پُرسکون وقفے بھی آتے رہے، اور ان وقفوں کے دوران ایران مسلمان سلطنت کے تمام مخالفوں کی پناہ گاہ بن گیا جو دنیا کے ہر کونے سے پناہ، مدد اور حوصلہ افزائی کی تلاش میں آنے لگے۔ ان سب کو شیعوں کی جانب سے رازدارانہ عمل، تقیہ اور کِتمان کی تربیت بھی حاصل ہونے لگی۔ اس طرح ایران، بیزار عناصر، باغیوں، راہبوں، صوفیوں، مبلّغوں، کاہنوں اور فال گیروں کا مرکز

بن گیا جو دور دور سے کھنچ کر تبلیغ، عبادت اور پیش گوئی کی غرض سے یہاں پہنچنے لگے۔ اسی سے ایران کا مخصوص ماحول پیدا ہوا جس میں مذہبیت، سرشاری اور تصوّف کے عناصر نمایاں ہیں۔ میں بچپن میں مدرسے کا بہت نیک طالب علم ہوا کرتا تھا، ایک ایرانی کہتا ہے، اور میرے ہم سبقوں کا خیال تھا کہ میرے سر کے گرد نور کا ہالہ ہے۔ کسی یوروپی رہنما کے قلم سے اس قسم کے الفاظ کے نکلنے کا ذرا تصوّر تو کیجیے کہ ایک بار گھڑسواری کے دوران میں ایک چٹان پر سے گر گیا، اور مر ہی گیا ہوتا اگر ایک بزرگ ہاتھ بڑھا کر مجھے بچا نہ لیتے۔ لیکن آخری شاہ نے اس طرح کا منظر اپنی کتاب میں بیان کیا اور پورے ایران نے اسے سنجیدگی سے پڑھا۔ توہمانہ عقائد -- مثلاً اعداد، شگونوں، علامتوں، پیش گوئیوں اور کشفوں پر ایمان -- کی جڑیں یہاں بہت گہری ہیں۔

سولھویں صدی میں صفویوں نے شیعہ اسلام کو ایران کے سرکاری مذہب کا درجہ دے دیا۔ جو نظریہ اب تک عمومی حزبِ مخالف کے کام آتا رہا تھا، اب سلطنت عثمانیہ کی مخالف ایک ریاست کا نظریہ بن گیا۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ شاہی اور شیعیت کے باہمی تعلقات بد سے بدتر ہوتے چلے گئے۔

نکتہ یہ ہے کہ شیعہ نہ صرف خلافت کی حاکمیت کو رد کرتے ہیں بلکہ وہ کسی ایسی طاقت کو برداشت نہیں کرتے جو ان پر تسلّط قائم کرنے کی کوشش کرے۔ ایران اس اعتبار سے دنیا کا واحد ملک ہے جہاں کے لوگ حاکمیت کو اپنے مذہبی رہنماؤں، یعنی اماموں، کا حق سمجھتے ہیں، جن میں سے آخری امام نویں صدی میں دنیا سے رخصت، اور شیعہ عقیدے کی رُو سے دوبارہ لوٹ آنے کے لیے غائب ہو گئے تھے۔

اب ہم اس تصوّر تک پہنچ گئے ہیں جو شیعہ نظامِ فکر کا جوہر اور اس کے ماننے والوں کا بنیادی ایمان ہے۔ خلافت کے حصول سے ناامید ہو کر شیعوں نے امامت کو جزوِ ایمان بنا لیا اور اماموں کا یہ سلسلہ بارھویں امام تک جاری رہا۔ ان میں سے ہر امام کو خلافت پر متمکّن حکمرانوں کے ہاتھوں پُرتشدد انداز میں قتل کیا گیا۔ مگر شیعوں کا عقیدہ ہے کہ بارھویں اور آخری امام قتل نہیں ہوئے بلکہ عراق میں سامرّہ کے مقام پر بنی ہوئی مسجد کے غار میں غائب ہو گئے۔ یہ سن ۸۷۸ عیسوی کی بات ہے۔ انھیں غائب امام، یا امامِ منتظر کہا جاتا ہے اور یقین کیا جاتا ہے کہ وہ قیامت سے کچھ پہلے کسی مناسب موقعے پر مہدی کی شکل میں نمودار ہوں گے۔ شیعوں کا خیال ہے کہ اگر بارھویں امام کا وجود نہ ہوتا تو دنیا اب تک ختم ہو گئی

ہوتی۔ شیعہ اسی عقیدے سے اپنی روحانی قوت اخذ کرتے ہیں اور اسی عقیدے پر جیتے اور مرتے ہیں۔ یہ ایک ستائے ہوئے مظلوم کی سادہ انسانی آرزو ہے جسے اس خیال سے امید، اور سب سے بڑھ کر، زندگی کا احساس حاصل ہوتا ہے۔ منتظر امام کے دوبارہ ظاہر ہونے کا وقت کسی کو معلوم نہیں ہے؛ وہ کبھی بھی نمودار ہو سکتے ہیں، اور یہ وقت آج بھی آسکتا ہے۔ ان کے آنے پر آنسو تھم جائیں گے اور ناانصافیاں ختم ہو جائیں گی۔

شیعوں کی اطاعت کا بلند ترین درجہ امام کے لیے وقف ہے، اس کے بعد وہ اپنے مذہبی عالموں کی حاکمیت تسلیم کرتے ہیں، اور سب سے کم درجے پر شاہ کو مانتے ہیں۔

صفویوں کے زمانے سے ایران میں محل اور مسجد کی دُہری حاکمیت قائم ہے۔ ان دونوں اداروں کے باہمی تعلقات میں اتار چڑھاو آتے رہے ہیں لیکن یہ تعلقات بہت دوستانہ کبھی نہیں رہے۔ جب کبھی ان دونوں قوتوں کا توازن بگڑتا ہے تو شاہ اپنی مکمل حاکمیت نافذ کرنے کی کوشش کرتا ہے (اور وہ بھی بیرونی طاقتوں کی مدد سے)؛ تب لوگ مسجد میں جمع ہو جاتے ہیں اور مقابلہ شروع ہو جاتا ہے۔

شیعوں کے نزدیک مسجد کی حیثیت عبادت گاہ سے کہیں بڑھ کر ہے۔ یہ ایک ایسی جنت ہے جہاں وہ طوفان سے پناہ لے کر اپنی جان بچا سکتے ہیں۔ ایک ایسا احاطہ ہے جسے امان حاصل ہے، جہاں داخل ہونے کا شاہ کے کارندوں کو کوئی اختیار نہیں۔ قدیم رواج کی رُو سے، اگر کوئی باغی شاہ کے سپاہیوں کے تعاقب سے بچ کر مسجد میں پناہ لے لیتا تو محفوظ ہو جاتا اور اسے بہ زور وہاں سے نہیں نکالا جا سکتا تھا۔

مسجد کی تعمیر مسیحی گرجا کی تعمیر سے بہت نمایاں طور پر مختلف ہوتی ہے۔ گرجا ایک بند عمارت ہے جو عبادت، مراقبے اور خاموشی کے لیے وقف ہے۔ وہاں اگر کوئی بولنے لگے تو دوسرے لوگ اسے خاموش کرا دیتے ہیں۔ مسجد کا ماحول اس سے مختلف ہے۔ مسجد کی عمارت کا سب سے بڑا رقبہ ایک کھلا صحن ہوتا ہے جہاں لوگ عبادت کر سکتے ہیں، چل پھر سکتے ہیں، بات چیت کر سکتے ہیں، یہاں تک کہ جلسے بھی منعقد کر سکتے ہیں۔ یہ سماجی اور سیاسی زندگی کا مقام ہے۔ کوئی ایرانی جو اپنے دفتر میں جھڑکیاں سہتا ہے، جس کا سابقہ قدم قدم پر تُند خو افسروں سے پڑتا ہے جو اس سے رشوت مانگتے اور دھمکاتے ہیں، جسے ہر طرف پولیس کی نگرانی میں رہنا پڑتا ہے، وہ مسجد میں داخل ہو کر گویا سکون اور توازن پا لیتا ہے اور اپنی عزتِ نفس کو بحال کر لیتا ہے۔ یہاں اسے دھمکانے یا جھڑکنے والا کوئی نہیں ہے؛ یہاں

بڑے چھوٹے کی تفریق نہیں ہے، سب برابر ہیں، سب بھائی ہیں؛ اور چوں کہ مسجد بات چیت اور مکالے کی جگہ ہے، اس لیے یہاں دل کی بات کہی اور سنی جا سکتی ہے۔ یہ کیسی نایاب تسکین ہے، اور ہر شخص اس کا کتنا ضرورت مند ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کوئی آمریت اپنا شکنجہ کستی ہے اور پہلے سے زیادہ خاموشی اور گھٹن گلیوں اور کارگاہوں پر چھا جاتی ہے، تو مسجدیں لوگوں اور آوازوں سے اَور زیادہ بھر جاتی ہیں۔ یہاں آنے والے تمام لوگ پُرجوش مسلمان نہیں ہوتے، نہ دینداری کی کوئی اچانک لہر انھیں یہاں تک لے آتی ہے -- وہ سانس لینا چاہتے ہیں، خود کو انسان محسوس کرنا چاہتے ہیں۔ یہاں ساواک تک کا اختیار محدود ہو جاتا ہے۔ اس کے باوجود جبر کے خلاف آواز اٹھانے والے بہت سے ملّاؤں کو گرفتاری اور اذیّت کا سامنا کرنا پڑا۔ آیت اللہ ساعدی کو تشدّد کے دوران "فرائنگ پین" پر جان دینی پڑی۔ آیت اللہ آذرشہری کو ساواک کے کارندوں نے کھَولتے ہوئے تیل میں پھینک دیا، جس کے کچھ عرصے بعد وہ چل بسا۔ آیت اللہ طالیقانی کو قید کے دوران اس قدر اذیّت کا سامنا کرنا پڑا کہ رہائی کے بعد وہ زیادہ دن زندہ نہ رہ سکا۔ وہ پپوٹوں سے محروم تھا۔ جب اس کی نظروں کے سامنے ساواک والے اس کی بیٹی کی بے حرمتی کر رہے تھے تو اس نے بےاختیار آنکھیں بند کر لی تھیں اور انھوں نے اس کے پپوٹوں کو سگریٹ سے داغ دیا تھا تاکہ وہ یہ منظر دیکھنے پر مجبور ہو جائے۔ یہ سب واقعات ۱۹۷۰ کی دہائی میں پیش آئے۔ لیکن مسجد کے بارے میں شاہ کی حکمتِ عملی بےحد تضادات کا شکار تھی۔ ایک طرف وہ مخالف ملّاؤں پر تشدّد کر رہا تھا اور دوسری طرف خود کو پُرجوش مسلمان ظاہر کرتے ہوئے بار بار مقدّس مقامات کی زیارت کو جاتا تھا، نمازیں پڑھتا تھا اور ملّاؤں سے اعانت کا طلبگار ہوتا تھا۔ پھر کیوں کر ممکن تھا کہ وہ مسجدوں کے خلاف کھلی جنگ کا اعلان کر سکے؟

لوگ مسجدوں میں اس وجہ سے بھی آسانی سے جا سکتے ہیں کہ وہ ہر جگہ سے قریب پڑتی ہیں۔ تہران میں ایک ہزار مسجدیں ہیں۔ سیّاح کی ناآشنا نظر ان میں سے صرف چند کو شناخت کر سکتی ہے جن کی تعمیر بہت نمایاں ہے۔ لیکن اکثر مسجدیں، خصوصاً غریب محلّوں میں، معمولی قسم کی عمارتوں میں واقع ہیں جنھیں غریبوں کے خستہ حال مکانوں سے الگ پہچاننا دشوار ہے۔ انھیں مکانوں کی سی مٹّی سے بنی یہ مسجدیں تنگ گلیوں، پچھواڑوں اور نکڑوں کے عام یکساں منظر کا حصّہ بن کر نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہیں۔ اس طرح لوگوں اور مسجدوں کے درمیان ایک قریبی تعلق قائم رہتا ہے۔ مسجد جانے کے لیے کوئی لمبا راستا طے

کرنے کی ضرورت نہیں، نہ کوئی تکلف کا لباس درکار ہے: مسجد روزمرہ زندگی کا حصہ ہے، خود زندگی ہے۔

پہلے پہل ایران پہنچنے والے شیعہ شہروں کے باسی، چھوٹے تاجر اور کاریگر تھے۔ انھوں نے خود کو تنگ محلوں میں قید کر لیا، وہیں مسجدیں بنائیں، اور انہیں محلوں میں اپنی چھوٹی چھوٹی دکانیں کھول لیں۔ کاریگروں کی کارگاہیں بھی قریب ہی کھل گئیں۔ چوں کہ مسلمانوں کے لیے عبادت سے پہلے اپنے بدن کو پاک کرنا ضروری ہے، اس لیے جگہ جگہ حمام بھی بن گئے، اور نماز سے واپسی پر چائے یا قہوہ پینے کے لیے چائے خانے اور قہوہ خانے بھی کھل گئے۔ اس طرح ایرانی زندگی کے ایک منفرد مظہر یعنی بازار کی ابتدا ہوئی، جو ایک رنگارنگ، پُرہجوم، پُرشور جگہ ہے اور تصوف، تجارت اور کھانے پینے کی سرگرمیوں سے ہمیشہ معمور رہتی ہے۔ اگر کوئی کہے کہ میں بازار جا رہا ہوں، تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوگا کہ وہ لازماً کچھ خریدنے جا رہا ہے۔ بازار جانے کا مقصد نماز ادا کرنا، دوستوں سے ملنا، خرید و فروخت کرنا، یا قہوہ خانے میں بیٹھنا، کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ کوئی شخص وہاں گپ شپ کرنے یا تازہ حالات سے باخبر ہونے بھی جا سکتا ہے اور کسی مخالفانہ مظاہرے میں شریک ہونے بھی۔ ایرانیوں کو بازار کی صورت میں وہ سب چیزیں ایک ساتھ دستیاب ہو جاتی ہیں جو دنیوی اور دینی زندگی کی ضرورت ہیں۔

نوٹس ۷

محمود آذری ۱۹۷۷ کے شروع میں ایران واپس آیا۔ وہ آٹھ سال سے لندن میں رہ رہا تھا اور مختلف ناشروں کے لیے ترجمے اور اشتہاری اداروں کے لیے کاپی رائٹنگ کر کے گزر بسر کرتا تھا۔ وہ درمیانی عمر کا تنہا شخص تھا اور اپنا فرصت کا وقت چہل قدمی اور اپنے ہم وطنوں سے ملنے جلنے میں گزارتا تھا۔ ان ملاقاتوں میں بات چیت صرف انگلستانی موضوعات تک محدود رہا کرتی: ساواک ہر جگہ موجود تھی، لندن میں بھی، اور عقلمند لوگ اپنے وطن کے مسائل کو زیرِ بحث لانے سے گریز کرتے تھے۔

لندن میں اپنے قیام کے آخر آخر میں اسے تہران سے اپنے بھائی کے کئی خط ملے جو جاننے والوں کے ہاتھوں اس تک پہنچے۔ اس کے بھائی نے اسے لکھا تھا کہ ایران میں بہت دلچسپ دن آنے والے ہیں اور اس سے واپس آنے کو کہا تھا۔ محمود کو دلچسپ دنوں سے ڈر

لگتا تھا، لیکن چوں کہ اس کے بھائی کی بات کو کنبے میں بڑی اہمیت دی جاتی تھی، اس لیے اس نے اپنا اسباب باندھا اور تہران لوٹ آیا۔

وہ اس شہر کو پہچان نہ سکا۔

یہ مقام جو کبھی ریگستان کے درمیان ایک مختصر سا نخلستان ہوا کرتا تھا، اب حیران کر دینے والا پُرہجوم جدید شہر تھا جس کی آبادی پچاس لاکھ سے بڑھ چکی تھی۔ تنگ سڑکوں پر دس لاکھ گاڑیوں کا ہجوم تھا جو اگلے چوک پر ٹریفک جام ہونے کے باعث بے حرکت کھڑی تھیں۔ اس چوک پر داہنی اور بائیں جانب سے، شمال مشرق اور جنوب مغرب کی سمتوں سے، ٹریفک کی بے شمار قطاریں آ کر ایک دوسرے سے مل رہی تھیں اور ہر گلی میں گویا ٹریفک کا ایک اژدہا دھواں اُگلتا اور غرّاتا ہوا بل کھا رہا تھا۔ فضا صبح سے شام تک کاروں کے بے مقصد بجتے ہوئے ہارنوں کی آوازوں سے بھری رہتی تھی۔

اس نے محسوس کیا کہ لوگ جو کبھی کم گو اور خوش خُلق ہوا کرتے تھے، اب ذرا سی بات پر ایک دوسرے سے لڑ پڑتے ہیں، بلاوجہ غصّے میں آ کر برسنے لگتے ہیں، اور ایک دوسرے کا گریبان پکڑ کر چیخنے چلّانے لگتے ہیں۔ یہ لوگ کہانیوں میں بیان کی ہوئی عجیب مخلوق کی مانند معلوم ہوتے تھے جس کا سر اور دھڑ مختلف جانداروں کے جسموں سے مل کر بنا ہو۔ ان کا اوپر کا دھڑ طاقت یا اہمیت رکھنے والے ہر شخص کے سامنے احترام سے جھکتا جبکہ پیر اپنے سے کمزور لوگوں کو کچلتے رہتے۔ اس سے بظاہر ایک اندرونی توازن پیدا ہوتا تھا، جو کتنا ہی سِفلہ اور قابلِ رحم کیوں نہ ہو، مگر ان کے زندہ رہنے کے لیے ضروری تھا۔

اس عجیب مخلوق کا سامنا ہونے پر محمود کو اس خیال سے اپنے اندر دہشت کی ایک لہر اٹھتی محسوس ہوئی کہ اس کے جسم کا کون سا حصّہ پہلے حرکت میں آئے گا۔ لیکن جلد ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ کچلنے کا عمل جھکنے کی نسبت زیادہ عام ہے؛ یہ زیادہ فطری طور پر سامنے آتا ہے اور صرف سخت دباؤ پڑنے پر ختم ہوتا ہے۔

اپنی واپسی کے چند ہی روز بعد وہ شہر کے ایک باغ میں گیا، بنچ پر بیٹھے ہوئے ایک شخص کے برابر میں جا بیٹھا اور گفتگو شروع کرنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ آدمی جواب دیے بغیر فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور تیز قدموں سے چلتا ہوا وہاں سے دور ہو گیا۔ کچھ دیر بعد محمود نے دوسرے راہ گیروں سے بات کرنے کی کوشش کی جو اسے یوں دہشت سے دیکھنے لگے جیسے وہ کوئی دیوانہ ہو۔ اس نے کوشش ترک کر دی اور اپنے ہوٹل لوٹ آیا۔

کاؤنٹر پر کھڑے ہوئے تُرش رو اور بدمزاج شخص نے اسے اطلاع دی کہ اسے پولیس نے طلب کیا ہے۔ آٹھ سال میں پہلی بار اسے حقیقی دہشت محسوس ہوئی، اور اسے فوراً پتا چل گیا کہ محض عمر بڑھ جانے کا مطلب اس دہشت سے نجات پا لینا نہیں ہے: یہ ننگی پیٹھ پر برف کا وہی جانا پہچانا لمس تھا، پیروں میں سیسے کا وہی بھاری پن جس سے وہ برسوں پہلے واقف رہا تھا۔

پولیس کا دفتر ہوٹل کی گلی کے کونے پر ایک پُراسرار اور متعفن عمارت میں واقع تھا۔ محمود نے انتظار کرتے ہوئے گمبھیر اور بےروح لوگوں کی قطار میں اپنی جگہ سنبھال لی۔ جنگلے کے دوسری طرف پولیس والے بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔ اس بڑے سے پُرہجوم ہال میں مکمل سناٹا تھا: پولیس والے اخبار پڑھنے میں مشغول تھے اور کوئی شخص سرگوشی تک کرنے کی ہمت نہیں کر رہا تھا۔ پھر ایک دم دفتر میں کام شروع ہونے کے آثار دکھائی دینے لگے۔ پولیس کے اہلکاروں نے اپنی کرسیاں آگے پیچھے کھسکائیں، میزوں پر پڑے کاغذوں کو الٹا پلٹا، اور انتظار کرتے ہوئے لوگوں کو غلیظ گالیوں سے مخاطب کرنے لگے۔

یہ گنوارپن کہاں سے آ گیا، محمود خوف زدہ ہو کر سوچنے لگا۔ جب اُس کی باری آئی تو اسے ایک سوال نامہ تھما دیا گیا اور اسے فوراً پُر کرنے کو کہا گیا۔ وہ سوال نامے کے ہر جز کا جواب لکھتے ہوئے تذبذب کا شکار ہو جاتا اور سوچنے لگتا کہ پورا ہال اسے مشکوک نظروں سے گھور رہا ہے۔ اس خیال سے دہشت زدہ ہو کر وہ گھبرائے ہوئے انداز میں تیزی سے لکھنے لگتا اور لکھتے ہوئے یوں اٹکنے لگتا جیسے کوئی نیم خواندہ شخص ہو۔ اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے پھوٹ آئے، اسے احساس ہوا کہ وہ اپنا رومال بھول آیا ہے، اور اس احساس پر پسینا اَور زیادہ بہنے لگا۔

اس نے سوال نامہ پُر کر کے پولیس والے کے حوالے کیا اور جلدی سے عمارت سے باہر نکل آیا۔ گلی میں بےدھیانی سے چلتے ہوئے وہ ایک راہ گیر سے ٹکرا گیا۔ وہ اجنبی چونک کر اسے گالیاں دینے لگا۔ کچھ دوسرے راہ گیر دیکھنے کے لیے رک گئے، اور اس طرح محمود کے ہاتھوں ایک جرم سرزد ہو گیا۔۔ اس کا طرزِ عمل لوگوں کے اجتماع کا سبب بنا۔ قانون کی رو سے بلااجازت اجتماع ممنوع تھا۔ ایک پولیس والا کہیں سے نمودار ہو گیا اور محمود کو صفائی پیش کرنی پڑی کہ یہ سب محض ایک حادثہ ہے اور ان لوگوں میں سے کسی نے شاہ کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں کہا ہے۔ اس کے باوجود پولیس والے نے اس کا نام پتا درج کر لیا اور

سو تومان کا نوٹ ہتھیا کر چلتا بنا۔

محمود نڈھال ہو کر ہوٹل واپس آیا۔ پولیس نے ایک دن میں دو بار اس کا نام پتا درج کیا تھا۔ اسے خیال آیا کہ اگر یہ دونوں اندراج کہیں ایک جگہ جمع ہو گئے تو کیا ہو گا۔ پھر اس نے خود کو یہ کہہ کر تسلّی دی کہ یہ قصہ دفتری بھول بھلیوں میں کہیں گم ہو جائے گا۔

اگلی صبح محمود کا بھائی آیا تو اس نے فوراً اسے اطلاع دی کہ پولیس دو بار اس کا نام پتا درج کر چکی ہے۔ اس صورت میں کیا یہ دانش مندانہ بات نہیں ہو گی، اس نے پوچھا، کہ وہ لندن واپس چلا جائے؟

محمود کا بھائی بات کرنا چاہتا تھا لیکن اس نے کمرے میں لگے ہوئے فانوس، ٹیلی فون، بجلی کے سوئچ اور نائٹ لیمپ کی طرف اشارہ کیا اور بولا کہ چلو، شہر کے باہر چل کر سیر کرتے ہیں۔ بھائی کی پرانی ٹوٹی پھوٹی کار میں دونوں شہر کے باہر پہاڑی علاقے کی طرف روانہ ہو گئے۔ کافی آگے جا کر جب سڑک سنسان ہو گئی تو محمود کے بھائی نے گاڑی روک لی۔ مارچ کا مہینا تھا، تیز سرد ہوا چل رہی تھی اور ہر طرف برف جمی ہوئی تھی۔ وہ ایک بڑی سی چٹان کی اوٹ میں کھڑے ہو گئے اور سردی سے کپکپانے لگے۔

("تب میرے بھائی نے مجھے بتایا کہ مجھے یہیں ٹھہرنا ہو گا کیوں کہ انقلاب کا آغاز ہو چکا ہے اور میری ضرورت پڑ سکتی ہے۔ کیسا انقلاب؟ میں نے اس سے پوچھا۔ تمھارا دماغ تو ٹھیک ہے؟ مجھے ہر طرح کے ہنگاموں سے خوف آتا تھا، اور یوں بھی سیاست میری برداشت سے باہر کی چیز ہے۔ میں روزانہ یوگا کی مشق کرتا ہوں، شاعری پڑھتا ہوں اور ترجمے کے کام میں مشغول رہتا ہوں۔ مجھے سیاست سے کیا لینا دینا؟ لیکن میرے بھائی نے کہا کہ تمھیں کچھ پتا نہیں ہے کہ کیا حالات رونما ہونے والے ہیں، اور پھر ان حالات کی تفصیل بتانے لگا۔ اس نے بتایا کہ واشنگٹن میں ہماری قسمت کا ایک اہم فیصلہ کیا جا رہا ہے، جہاں اس وقت جمی کارٹر نے انسانی حقوق کی باتیں کرنی شروع کر دی ہیں۔ شاہ کو ان باتوں پر تھوڑا بہت دھیان دینا ہی ہو گا۔ اسے تشدد روک کر کچھ قیدیوں کو رہا کرنا پڑے گا اور جمہوریت کا تھوڑا بہت ڈھونگ رچانا پڑے گا۔ اس طرح ہمیں اپنی جدوجہد شروع کرنے کا موقع مل جائے گا۔ میرا بھائی جوش میں آنے لگا، اور مجھے اس کو احتیاط برتنے کی تنبیہ کرنی پڑی حالاں کہ آس پاس کوئی موجود نہیں تھا۔ اس ملاقات میں اس نے دو سو سے زیادہ صفحوں کا، ٹائپ کیا ہوا ایک مسودہ مجھے دیا۔ یہ علی اصغر جوادی کی لکھی ہوئی ایک یادداشت تھی۔۔ شاہ

کے نام ایک کھلا خط۔ اس میں جوادی نے ملک کے حالیہ بحران، ایران کی محکومیت اور شاہی نظام کی بدعنوانیوں کا ذکر کیا تھا۔ میرے بھائی نے بتایا کہ یہ مسوّدہ آج کل خفیہ طور پر گردش کر رہا ہے اور لوگ اس کی زیادہ سے زیادہ نقلیں تیار کر رہے ہیں۔ اب ہم اس انتظار میں ہیں، اس نے بتایا، کہ اس پر شاہ کیا ردِ عمل ظاہر کرتا ہے۔ جوادی کو جیل میں ڈالا جاتا ہے یا نہیں۔ فی الحال تو اسے دھمکانے والے فون موصول ہو رہے ہیں لیکن اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوا ہے۔ وہ ایک چائے خانے میں آیا کرتا ہے۔۔ ممکن ہے تمھاری اس سے ملاقات بھی ہو جائے۔ میں نے جواب دیا کہ مجھے کسی ایسے شخص سے ملتے ہوئے خوف آتا ہے جس کی یقیناً نگرانی کی جا رہی ہو گی۔")

وہ دونوں شہر واپس آگئے جہاں محمود نے ہوٹل کے کمرے میں بند ہو کر رات بھر میں وہ مسوّدہ پڑھ ڈالا۔ جوادی نے شاہ کو ملک کی اخلاقی بنیادیں تباہ کر دینے کا مجرم ٹھہرایا تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ ہر طرح کی فکر کو ختم کیا جا رہا ہے اور روشن خیال لوگوں کی زبان بند کی جا رہی ہے۔ کلچر کو یا تو سلاخوں کے پیچھے دھکیل دیا گیا ہے یا زیرِزمین رہنے پر مجبور کر دیا گیا ہے۔ جوادی نے خبردار کیا تھا کہ ترقی کا اندازہ ٹینکوں اور مشینوں کی تعداد سے نہیں لگایا جا سکتا: ترقی کا پیمانہ انسان اور اس کا آزادی اور وقار کا احساس ہے۔ مسوّدہ پڑھتے ہوئے محمود کو اپنے کمرے کے باہر راہداری میں قدموں کی چاپ سنائی دی۔

اگلے دن اسے یہ فکر لگی ہوئی تھی کہ اس مسوّدے کا کیا کرے۔ وہ اسے کمرے میں چھوڑنا نہیں چاہتا تھا اس لیے اپنے ساتھ باہر لے گیا۔ لیکن باہر گلی میں چلتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ کاغذ کا پلندا بہت مشتبہ چیز معلوم ہو رہا ہو گا: اس نے ایک اخبار خریدا اور مسوّدے کو اس میں لپیٹ لیا۔ اس کے باوجود اسے خوف لاحق تھا کہ کہیں بھی روک کر اس کی تلاشی لی جا سکتی ہے۔ سب سے زیادہ ڈر اسے ہوٹل کی لابی میں مسوّدے کے ساتھ دیکھ لیے جانے کا تھا۔ اس نے احتیاط کی غرض سے باہر آنا جانا بہت کم کر دیا۔

اس دوران محمود نے اپنے پرانے دوستوں، یونیورسٹی کے ہم جماعتوں کے بارے میں معلومات جمع کرنے کی کوشش کی۔ ان میں سے کچھ مر چکے تھے، کچھ ملک سے باہر چلے گئے تھے، اور کچھ جیل میں تھے۔ مگر آخرکار وہ چند ایک دوستوں کا پتا چلانے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ یونیورسٹی جا کر علی قاعدی سے ملا جو کبھی کوہ پیمائی میں اس کا ساتھی رہا تھا۔ قاعدی اب نباتیات کا پروفیسر بن چکا تھا اور اسکلیرو فیلکس پودوں کا ماہر تھا۔ محمود نے بہت احتیاط کے

ساتھ اس سے ملک کی صورتِ حال دریافت کی۔ قاعدی کچھ دیر سوچتا رہا کہ اس نے پچھلے کئی برسوں میں اپنا تمام وقت اسکلیرو فیلس پودوں کے مطالعے میں گزارا ہے۔ وہ اسی موضوع پر بات کرتا رہا: کہ اس قسم کے پودے ایک خاص طرح کی آب و ہوا والے خطوں ہی میں پائے جاتے ہیں، ایسے خطوں میں جہاں سردیوں میں بارش ہوتی ہو اور گرمیاں سخت اور خشک ہوتی ہوں۔ پھر وہ بتانے لگا کہ جاڑوں میں سبز پودے پھلتے پھولتے ہیں جبکہ گرمیوں میں ایسے پودے جو اپنی نمی برقرار اور محفوظ رکھ سکیں۔ محمود کے لیے یہ باتیں اور قاعدی کی تکنیکی اصلاحیں ناقابلِ فہم تھیں، اس لیے اس نے پوچھا کہ کیا اُس کے خیال میں بہت اہم واقعات ہونے والے ہیں۔ یہ سوال سن کر قاعدی پھر سوچ میں ڈوب گیا، اور بہت دیر بعد جب دوبارہ بولا تو اوقیانوس کے صنوبر کی شاندار چھتری کی بات کرنے لگا۔ ''لیکن میں نے ہمالیہ کا صنوبر بھی دیکھا ہے جو ہمارے ملک میں پیدا ہوتا ہے،'' وہ اس موضوع پر اچانک گرم جوش ہو کر بولنے لگا۔ ''صنوبر کی یہ قسم اوقیانوسی صنوبر سے بھی اعلیٰ درجے کی ہے۔''

اس کے بعد ایک روز محمود کی ملاقات اپنے ایک پُرانے دوست سے ہوئی جس کے ساتھ مل کر اس نے اسکول کے دنوں میں ایک ڈراما لکھنے کی کوشش کی تھی۔ اب اس کا دوست کرج شہر کا میئر بن چکا تھا۔ میئر نے محمود کو ایک عمدہ ریستوراں میں کھانے پر مدعو کیا، اور جب کھانا ختم ہونے لگا تو محمود نے اُس سے معاشرے کی کیفیت کے بارے میں سوال کیا۔ میئر اپنے شہر کے معاملات سے بڑھ کر کسی موضوع پر بات کرنے کو تیار نہیں تھا۔ وہ بتانے لگا کہ آج کل کرج شہر کی بڑی سڑکیں پختہ بنوائی جا رہی ہیں۔ انھوں نے پانی کے نکاس کا بھی منصوبہ شروع کیا ہے اور ایسا منصوبہ تہران تک میں نہیں ہے۔ اعداد اور اصطلاحوں کے بے تحاشا سیلاب سے محمود کو یقین ہو گیا کہ وہ غلط سوال کر بیٹھا ہے۔ لیکن اس نے اپنی بات پر زور دینے کا فیصلہ کیا اور پوچھا کہ اس کے شہر کے لوگوں کی گفتگو کا سب سے عام موضوع کیا ہے۔ ''میں کیا بتا سکتا ہوں؟ غالباً اپنے ذاتی مسائل پر بات چیت کرتے ہوں گے۔ یہ لوگ سوچنے کی صلاحیت سے محروم ہیں۔ ان پر کسی بات کا اثر نہیں ہوتا۔ سب کے سب کاہل اور سیاست سے بے بہرہ ہیں اور اپنی ناک سے آگے نہیں دیکھ سکتے۔ ایران کے مسائل، ہنہ! انھیں ان باتوں کی کیا پروا؟'' پھر وہ دوبارہ اسی موضوع پر شروع ہو گیا کہ ان کے شہر میں پیر لڈ ہائیڈ کیمیکل کا ایک کارخانہ قائم ہوا ہے اور بہت جلد اس کی مصنوعات پورے ملک پر چھا جائیں گی۔ محمود نے خود کو احمق محسوس کیا کیوں کہ اسے اس لفظ کے معنی کی کچھ خبر نہ

تھی۔ اس نے اپنے دوست سے پوچھا: "کیا تم اس سے بڑے مسائل کے بارے میں نہیں سوچتے؟" اس کا دوست جواب میں بولا: "کیوں نہیں!" پھر اس نے آگے کو جھک کر سرگوشی کی: "دراصل اس کارخانے کی تمام پیداوار پھینک دینے کے لائق ہے۔ محض کوڑا کرکٹ! لوگ کام کرنا ہی نہیں چاہتے، اور انھیں ذرا بھی پروا نہیں کہ وہ جو کچھ بنا رہے ہیں اس کا معیار کیسا ہے۔ ہر طرف اسی طرح مُردنی چھائی ہوئی ہے، شاید کوئی مبہم سی، نامعلوم سی مزاحمت! پورا ملک دلدل میں دھنسا ہوا لگتا ہے۔" "مگر کیوں؟" محمود نے سوال کیا۔ "مجھے کیا معلوم؟" اس کا دوست سنبھل کر بیٹھ گیا اور ویٹر کو بلانے لگا۔ "میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔۔۔" اور محمود نے اپنے بے تکلف اور ڈراما نگار دوست کی روح کو ایک لمحے کے لیے نمودار ہو کر دوبارہ غیر دلچسپ موضوعات کے پیچھے چُھپ جاتے ہوئے دیکھا: وہ دوبارہ جنریٹروں، کنویئروں اور کنٹرول پینل کے بٹنوں کی باتیں کرنے لگا تھا۔

("ان لوگوں کے واسطے ٹھوس چیزوں کے بارے میں گفتگو ایک طرح کی پناہ گاہ بن گئی تھی، نجات کا راستا۔ صنوبر اور پختہ سڑکیں۔۔ یہ ٹھوس چیزیں ہیں۔ ان چیزوں کے بارے میں دل کھول کر باتیں کی جا سکتی ہیں۔ ان چیزوں میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کی واضح اور محفوظ سرحدیں ہیں، اور سرحدوں کے پاس خطرے کی گھنٹیاں لگی ہوئی ہیں۔ جوں ہی باتوں میں مصروف ذہن بھٹک کر دور جانے لگتا ہے تو گھنٹیاں بج اٹھتی ہیں کہ خبردار، اس سے آگے عام خیالات، غور و فکر اور منطقی نتائج کی خطرناک سرزمین شروع ہو جاتی ہے! اس آواز پر چونک کر ذہن ایک دم سمٹ جاتا ہے اور دوبارہ محفوظ، ٹھوس چیزوں کی باتیں شروع کر دیتا ہے۔ ہم اپنے مخاطب کے چہرے سے اس پورے عمل کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ وہ پورے جوش و خروش اور زندہ دلی کے ساتھ باتیں کر رہا ہے، اعداد و شمار اور فی صد شرحیں گنوا رہا ہے، تاریخوں کا ذکر کر رہا ہے۔ ہم صاف دیکھ سکتے ہیں کہ وہ ٹھوس چیزوں کے محفوظ خطّے میں شہسواری کر رہا ہے۔ پھر اچانک ہم اس سے سوال کرتے ہیں: یہ سب تو ٹھیک ہے، مگر لوگ پوری طرح مطمئن کیوں دکھائی نہیں دیتے؟ اس سوال پر ہمیں اس کا چہرہ واضح طور متغیر ہوتا نظر آتا ہے۔ خطرے کی گھنٹیاں ایک دم بج اٹھتی ہیں: خبردار! تم سرحد کے دوسری طرف جانے والے ہو! وہ بالکل چپ ہو جاتا ہے اور ٹھوس چیزوں کے موضوع پر واپس آنے کا موقع ڈھونڈنے لگتا ہے۔ یہ موقع پاتے ہی اس کے چہرے پر تسکین کی سی کیفیت لوٹ آتی ہے، اور وہ کسی ٹھوس چیز، ٹھوس وجود، ٹھوس مخلوق یا ٹھوس مظہر

کے بارے میں پورے جوش سے بات کرنے لگتا ہے۔ ٹھوس چیزوں کی یہ خاصیت ہے کہ وہ ایک دوسرے سے فطری طور پر جُڑ کر عام قسم کے تصوّرات پیدا نہیں کرتیں۔ مثال کے طور پر، منفی نوعیت کی دو ٹھوس چیزیں خواہ برابر برابر پڑی ہوئی ہوں، لیکن جب تک انسان کا ذہن انھیں آپس میں جوڑنے کا عمل نہ کرے ان سے کوئی مشترکہ خیال پیدا نہیں ہوتا۔ خطرے کی گھنٹیاں اسی عمل کو بروقت روکتی ہیں، اور یوں منفی ٹھوس چیزیں، کوئی پریشان کن خیال پیدا کیے بغیر، ایک انبار کی صورت ایک دوسرے پر ڈھیر ہوتی چلی جاتی ہیں۔ ہر شخص کو اس کے ٹھوس وجود کی سرحدوں میں قید کر دینے کا طریقہ یہی ہے کہ ایسا بکھرا ہوا معاشرہ پیدا کر دیا جائے جو ٹھوس وجود والے باشندوں پر مشتمل ہو، اور یہ تمام باشندے ایک دوسرے سے کوئی رشتہ پیدا کر کے اجتماعی طور پر فعال نہ ہو سکیں۔")

البتہ محمود نے خود کو سطحی قسم کے مسئلوں سے الگ کر کے تخیّل اور جذبے کے دھاروں میں تیرنے کا ارادہ کیا۔ اس نے اپنے ایک اَور دوست کو ڈھونڈ نکالا جس کے بارے میں اسے اطلاع ملی تھی کہ وہ ایک معزز شاعر بن گیا ہے۔ حسن رضوانی نے ایک پُر تعیش جدید ولا میں اس کا خیر مقدم کیا۔ وہ سوئمنگ پُول کے کنارے بیٹھ گئے (گرمیاں شروع ہو چکی تھیں) اور برف آلود گلاسوں سے جِن کی چسکیاں لینے لگے۔ حسن کو سخت تکان کی شکایت تھی: وہ ایک ہی روز پہلے مونٹریال، شکاگو، پیرس، جنیوا اور ایتھنز کے سفر سے لوٹا تھا۔ اس نے ہر شہر میں عظیم تہذیب، اور شاہ اور ایرانی قوم کے انقلاب سفید کے بارے میں لیکچر دیے تھے۔ اس نے اقرار کیا کہ یہ سخت محنت کا کام تھا، کیوں کہ شور مچاتے ہوے مخالف نے بار بار اس کی بات کاٹ کر اسے گالیاں دیتے رہے تھے۔ حسن نے محمود کو اپنا نیا مجموعۂ کلام دکھایا جس کا انتساب شاہ کے نام تھا۔ کتاب کی پہلی نظم کا عنوان تھا: "جہاں اُس کی نگاہ پڑتی ہے، پھول کھِلنے لگتے ہیں۔" نظم میں کہا گیا تھا کہ جس مقام پر شاہ کی نظر اُچٹتی ہوئی پڑتی ہے، لالہ یا صد برگ پھوٹ نکلتا ہے، اور جس جگہ کو وہ نظر بھر کر دیکھ لے وہاں گلاب کھِل اٹھتے ہیں۔ ایک اَور نظم کا عنوان تھا: "اس کے قدموں سے چشمے پھوٹتے ہیں۔" اس نظم کے مصرعوں میں شاعر پڑھنے والوں کو یقین دلاتا تھا کہ شہنشاہ جہاں کہیں قدم رکھ دے وہاں سے شفاف پانی کا چشمہ جاری ہو جاتا ہے اور جس جگہ وہ کچھ دیر تک کھڑا رہے وہاں میٹھے پانی کا دریا بہنے لگتا ہے۔

یہ نظمیں ریڈیو پر نشر ہو چکی تھیں اور اسکولوں میں پڑھائی جاتی تھیں۔ شاہ نے خود ان

کی تعریف کی تھی اور شاعر کو پہلوی فاؤنڈیشن کی فیلوشپ سے نوازا تھا۔

ایک دن سڑک پر چلتے ہوئے محمود کو ایک شخص درخت کے نیچے کھڑا دکھائی دیا۔ قریب پہنچ کر اس نے پہچانا کہ وہ محسن جلاور ہے جس کے ساتھ برسوں پہلے محمود کی تحریریں پہلی بار طلبا کے ایک رسالے میں چھپی تھیں۔ محمود جانتا تھا کہ اپنے فلیٹ میں شاہ کے مخالف کسی کارکن کو پناہ دینے کی پاداش میں محسن کو قید اور تشدّد سے گزرنا پڑا ہے۔ محمود اس کے پاس جا کر رکا اور مصافحے کے لیے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ محسن خالی نگاہوں سے اسے تکتا رہا۔ محسن نے اسے اپنا نام بتایا، مگر جواب میں محسن نے صرف اتنا کہا: ''مجھے پروا نہیں۔'' وہ وہیں زمین پر قدم جمائے، سر جھکائے کھڑا رہا۔ ''چلو کہیں چلتے ہیں،'' محمود نے کہا، ''میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔'' محسن نے اسی طرح سر جھکائے ہوئے دوبارہ کہا: ''مجھے پروا نہیں۔'' محمود کو اپنے بدن میں سردی کی ایک لہر سی دوڑتی محسوس ہوئی۔ ''دیکھو،'' وہ بولا، ''کیوں نہ ہم بات کرنے کے لیے کوئی وقت اور جگہ طے کر لیں؟'' محسن نے کچھ جواب نہیں دیا، اس کا سر اَور جھک گیا۔ آخر بہت دیر بعد اس کے ہونٹوں سے دبی ہوئی سرگوشی نکلی: ''چوہوں کو ہٹا دو۔''

کچھ دنوں بعد محمود نے مرکزِ شہر میں ایک فلیٹ کرائے پر لے لیا۔ ابھی وہ اپنا اسباب کھول ہی رہا تھا کہ تین آدمی اندر چلے آئے۔ انھوں نے نئے آنے والے کے طور پر اسے خوش آمدید کہا، اور پوچھا کہ کیا وہ رستاخیز پارٹی کا رکن ہے جو شاہ نے قائم کی تھی۔ محمود نے نفی میں جواب دیا اور وجہ یہ بتائی کہ وہ کئی سال گزار کر ابھی حال ہی میں یوروپ سے لوٹا ہے۔ اس بات نے آنے والوں میں شک پیدا کر دیا: جسے باہر جانے کا موقع مل جائے وہ مشکل ہی سے واپس آتا ہے۔ انھوں نے محمود سے ایران واپس آنے کی وجہ پوچھی اور اُن میں سے ایک اس کے جواب ایک نوٹ بک میں درج کرتا رہا۔ محمود کو اس بات پر شدید دہشت محسوس ہوئی کہ اس کا نام تیسری بار ریکارڈ میں درج کیا جا رہا ہے۔ جب آنے والوں نے اسے رستاخیز پارٹی کی رکنیت کا فارم دیا تو اس نے کہا کہ اسے سیاست سے زندگی بھر کوئی دلچسپی نہیں رہی ہے اور وہ رکن نہیں بننا چاہتا۔ وہ سناٹے میں آ کر محمود کو گھورنے لگے۔۔ غالباً یہ سوچ رہے ہوں گے کہ اس نئے کرایہ دار کو معلوم نہیں ہے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ انھوں نے اسے ایک پمفلٹ دیا جس میں شاہ کا ایک بیان جلی حرفوں میں چھپا ہوا تھا: ''رستاخیز کی رکنیت حاصل نہ کرنے والے یا تو غدّار ہیں، جن کی جگہ جیل ہے، یا وہ لوگ ہیں

جنھیں شاہ سے، قوم سے اور وطن سے کوئی دلچسپی نہیں، اور انھیں اس سلوک کی توقع نہیں کرنی چاہیے جو دوسروں سے کیا جاتا ہے۔" اسے پڑھنے کے باوجود محمود نے ہمّت سے کام لے کر کہا کہ اسے غور کرنے اور اپنے بھائی سے مشورہ کرنے کے لیے ایک دن کی مہلت چاہیے۔

"یہ انتخاب کا معاملہ نہیں ہے،" اس کے بھائی نے کہا۔ "ہم سب رکن ہیں! رستاخیز کی رکنیت حاصل کرنا ہر شخص پر فرض ہے۔" محمود گھر واپس چلا گیا اور اگلے دن جب رستاخیز کے کارکن دوبارہ اس کے پاس آئے تو اس نے رکنیت کا فارم بھر دیا۔ اس طرح وہ عظیم تہذیب کے کارکنوں میں شامل ہو گیا۔

چند روز بعد اسے رستاخیز کے مقامی مرکز کی طرف سے ایک دعوت نامہ ملا۔ فنونِ لطیفہ سے تعلق رکھنے والے ارکان کا ایک اجلاس منعقد کیا جا رہا تھا اور ان سب لوگوں کو شرکت کے لیے کہا گیا تھا جو شاہ کی تاج پوشی کی سینتیسویں سالگرہ کے موقعے پر اپنی تخلیقات پیش کرنا چاہتے ہوں۔ سلطنت کی زندگی ایک سالگرہ سے دوسری سالگرہ کی طرف نرمی، آراستگی اور وقار کے ساتھ بہتی چلی جاتی تھی، اور شاہ اور اس کے شاندار کارناموں -- عظیم تہذیب اور انقلابِ سفید -- سے متعلق ہر تاریخ کو شان دار طور پر منایا جاتا تھا۔ بے شمار لوگ ہاتھوں میں کیلنڈر لیے احتیاط کے ساتھ دنوں کا حساب رکھا کرتے تھے کہ کہیں شاہ کی سالگرہ، اس کی تازہ ترین شادی کی سالگرہ، اس کی تاج پوشی کی سالگرہ اور ولی عہد اور دوسری شاہی اولاد کی سالگرہوں کے دن فراموش نہ ہو جائیں۔ یہ تمام جشن روایتی تعطیلات کے علاوہ تھے۔ ایک جشن ابھی ختم نہ ہونے پاتا کہ دوسرے کی تیاریاں شروع ہو جاتیں، فضا مسرّت اور جوش و خروش سے بھر جاتی، تمام کام رک جاتا، اور سب لوگ اُس آنے والے دن کا انتظار کرنے لگتے جسے نہایت شان و شوکت سے منایا جانے والا ہوتا تھا۔

جس وقت محمود اجلاس سے رخصت ہو رہا تھا، غلام قاسمی نامی ایک ادیب اور مترجم اس کے پاس آیا۔ وہ برسوں سے ایک دوسرے سے نہیں ملے تھے۔ جب محمود لندن میں تھا، قاسمی وطن میں بیٹھا انقلابِ سفید کی توصیف میں کہانیاں لکھ رہا تھا۔ اس کا طرزِ زندگی نہایت شاندار تھا؛ اسے محل تک رسائی حاصل تھی اور اس کی کتابیں چرمی جلدوں میں شائع کی جاتی تھیں۔ وہ محمود کو کچھ بتانا چاہتا تھا۔ وہ اسے ایک آرمینی قہوہ خانے میں کھینچ لے گیا، وہاں میز پر ایک ہفتہ وار اخبار پھیلا دیا اور فخر سے کہنے لگا: "دیکھو میری کیا چیز چھپی ہے!" یہ

پال ایلوار کی ایک نظم کا ترجمہ تھا۔ محمود نے اس پر ایک نظر ڈالی اور قاسمی سے بولا: "اس میں کیا خاص بات ہے کہ تم اتنے فخر سے اس کا تذکرہ کر رہے ہو؟" "کیا؟" قاسمی پھٹ پڑا۔ "تمھیں اس میں کوئی بات ہی نظر نہیں آتی؟ ذرا اسے غور سے پڑھو:

اندوہ کا وقت ہے، تاریک ترین رات چھائی ہوئی ہے

ایسے وقت میں اندھوں کو بھی باہر نہیں نکلنا چاہیے۔"

نظم کو پڑھتے ہوئے وہ اس کی ایک ایک سطر پر انگلی پھیرتا رہا۔ "اسے چھپوانے میں مجھے کس قدر مشکل پیش آئی ہے،" وہ پُرجوش لہجے میں بولا، "کتنی دقت سے میں نے ساواک کو یقین دلایا ہے کہ یہ نظم چھپ سکتی ہے! اس ملک میں جہاں ہر طرف امیدوں، پھولوں اور مسکراہٹوں کے انبار لگے ہیں، میں نے اندوہ کا وقت کے لفظ استعمال کیے ہیں۔ کیا تم اس کا تصوّر کر سکتے ہو؟" قاسمی کے چہرے پر کسی فاتح کا سا تاثر تھا اور وہ اپنے حوصلے پر نازاں تھا۔

اس لمحے، قاسمی کے مکّار چہرے کو دیکھتے ہوئے محمود کو پہلی بار احساس ہوا کہ انقلاب واقعی آنے کو ہے۔ اسے لگا کہ ہر بات اس کی سمجھ میں آ گئی ہے۔ قاسمی کو آنے والی قیامت کا اندازہ ہو چکا تھا۔ اس نے بڑی چالاکی سے اس طرح کی کوششیں شروع کر دی تھیں کہ آنے والے مشکل وقت میں ایسی تحریریں پیش کر کے اپنی جان بچا سکے جن میں اس نے انقلاب کی قوتوں کو خراج پیش کیا تھا۔ اس نے گویا شاہ کی نشست کی گدّی میں ایک پِن چبھو دی تھی۔ یہ کوئی بم نہیں تھا اور شاہ کا اس سے کچھ بھی بگڑنے والا نہیں تھا، لیکن یہ قاسمی کی تسکین کے واسطے کافی تھا۔۔ اس طرح اس نے، نہایت بالواسطہ طور پر، خود کو شاہ کی مخالف قوتوں کے ساتھ جوڑ لیا تھا۔ اب وہ اس پِن کو فخریہ اٹھا کر اپنے دوستوں کو دکھا سکتا تھا اور ان سے اپنی ہمّت کی تعریف کرا سکتا تھا۔

لیکن اُسی دن شام کے وقت محمود کے شکوک دوبارہ لوٹ آئے۔ وہ اپنے بھائی کے ساتھ گلیوں میں چل رہا تھا جو تیزی سے سنسان ہوتی جا رہی تھیں اور وہاں موجود لوگوں کے چہرے زندگی سے یکسر عاری تھے۔ تھکے ہوئے راہگیر تیزی سے گھروں کی طرف چلے جا رہے تھے یا بس اسٹاپ پر بس کے انتظار خاموش میں کھڑے تھے۔ کچھ لوگ ایک دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھے اونگھ رہے تھے اور ان کے سر گھٹنوں پر جھکے جا رہے تھے۔ محمود نے ان کی طرف اشارہ کر کے پوچھا: "انقلاب کون لائے گا؟ یہ سب تو سو رہے ہیں۔" اس کے بھائی نے جواب دیا: "یہی لوگ انقلاب لائیں گے۔ ایک روز ان کے پَر نکل آئیں گے۔" لیکن یہ محمود

کے تصوّر سے باہر کی بات تھی۔

("مگر گرمیوں کے شروع ہی میں مجھے کسی تبدیلی کے آثار محسوس ہونے لگے، لوگوں کے اندر کوئی چیز بیدار ہو رہی تھی، فضا میں کسی تغیر کا اشارہ تھا۔ اس ماحول کو بیان کرنا مشکل ہے، یہ بالکل ایسا تھا جیسے کسی طویل بھیانک خواب کے بعد بیداری کی ہلکی سی جھلک دکھائی دے رہی ہو۔ سب سے پہلے تو امریکیوں کے مجبور کرنے پر شاہ نے کچھ دانشوروں کو قید سے رہا کیا۔ لیکن شاہ کا یہ عمل فریب سے خالی نہ تھا: اس نے انھیں آزاد کر کے کچھ دوسرے لوگوں کو قید کر دیا۔ مگر اہم بات یہ تھی کہ شاہ کو مجبور ہونا پڑا؛ جامد نظام میں پہلی بار بہت باریک سی درز ظاہر ہوئی۔ اس درز میں اُن لوگوں نے قدم رکھ دیا جو ایرانی ادیبوں کی انجمن کو بحال کرنے کا مطالبہ کر رہے تھے جس پر شاہ نے ۱۹۶۹ میں پابندی لگا دی تھی۔ تمام انجمنوں کو، خواہ وہ کتنی ہی بے ضرر کیوں نہ ہوں، ممنوع قرار دے دیا گیا تھا۔ صرف دو تنظیمیں باقی رہ گئی تھیں: رستاخیز اور مسجد۔ ان کے سوا ہر چیز کا گلا گھونٹ دیا گیا۔ حکومت ادیبوں کی انجمن پر سے پابندی ہٹانے کے مطالبے کو مسترد کرتی رہی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نجی مکانوں میں، خصوصاً تہران کے مضافات میں واقع مکانوں میں، جہاں رازداری برتنا نسبتاً آسان تھا، خفیہ نشستوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ان نشستوں کو "ادبی شاموں" کا نام دیا جاتا تھا۔ پہلے نظمیں پڑھی جاتیں، اور پھر تازہ صورتِ حال پر گفتگو شروع ہو جاتی۔ ان نشستوں میں پہلی بار مَیں اُن لوگوں سے ملا جو قید میں رہے تھے۔ ان میں ادیب، سائنس داں اور طلبا شامل تھے۔ میں نے ان کے چہروں کو غور سے دیکھ کر یہ جاننے کی کوشش کی کہ خوف اور تشدّد اپنے پیچھے کس طرح کے نشان چھوڑ جاتے ہیں۔ مجھے ان لوگوں کا طرزِ عمل عجیب سا معلوم ہوا۔ وہ بہت متذبذب انداز میں حرکت کرتے تھے، جیسے روشنی اور دوسرے لوگوں کی موجودگی کے باعث ان کی آنکھیں چُندھیا رہی ہوں۔ وہ دوسروں سے ذرا فاصلے پر رہنے کی کوشش کرتے، جیسے کسی کے قریب آنے پر انھیں حملے کا خوف ہو۔ ان میں سے ایک شخص تو بہت ہیبت ناک معلوم ہوتا تھا: اس کے چہرے اور ہاتھوں پر جلنے کے داغ تھے اور وہ چھڑی کا سہارا لے کر چلتا تھا۔ وہ قانون کا طالبِ علم تھا اور تلاشی کے دوران اس کے گھر سے فدائین کے پمفلٹ برآمد ہوئے تھے۔ جس طرح اس نے مجھے اپنا قصّہ سنایا مجھے اب بھی یاد ہے۔ ساواک کے کارندے اسے ایک بڑے سے کمرے میں لے گئے جس کی ایک دیوار دہکتے ہوئے سفید لوہے کی تھی۔ کمرے کے فرش پر لوہے کی پٹریاں بچھی ہوئی تھیں اور ان پٹریوں پر دھات

کی بنی ہوئی ایک کرسی اُس دیوار کی سمت آگے پیچھے حرکت کرتی تھی۔ اسے اس کرسی پر بٹھا کر باندھ دیا گیا۔ پھر انھوں نے ایک بٹن دبایا اور کرسی آہستہ آہستہ، جھٹکے لیتی ہوئی دیوار کی طرف بڑھنے لگی۔ اس کی رفتار ایک انچ فی منٹ سے زیادہ نہ تھی۔ اس نے حساب لگایا کہ دیوار تک پہنچنے میں دو گھنٹے لگیں گے، لیکن ایک ہی گھنٹا گزرا ہو گا کہ تپش اس کی برداشت سے باہر ہو گئی اور وہ چلّا چلّا کر ہر چیز کا اعتراف کرنے لگا، حالاں کہ اس کے پاس اعتراف کرنے کو کچھ نہیں تھا۔۔ وہ پمفلٹ اسے باہر گلی میں پڑے ہوئے ملے تھے۔ جب وہ روتے ہوئے یہ سب کچھ سنا رہا تھا تو ہم سب دم بخود ہو کر سن رہے تھے۔ اس کے بعد اس نے جو کچھ کہا وہ مجھے عمر بھر یاد رہے گا۔ خدایا! وہ بولا، تو نے مجھے سوچنے کے خطرناک عیب میں کیوں مبتلا کیا؟ مجھے سوچنے کی صلاحیت کے بجاے مویشیوں کی سی مسکینی کیوں نہیں بخشی؟ آخر اس پر غشی طاری ہو گئی اور ہم اسے اٹھا کر دوسرے کمرے میں لے گئے۔ قید سے باہر آنے والے دوسرے لوگ زیادہ تر خاموش تھے۔")

لیکن ساواک نے جلد ہی ان نشستوں کے مقام کا پتا لگا لیا۔ ایک رات جب وہ مکان سے روانہ ہو کر باہر سڑک کے کنارے چلتے ہوئے گھر واپس جا رہے تھے تو محمود کو پاس کی جھاڑیوں میں سرسراہٹ سی سنائی دی۔ ایک لمحے کی اُلجھن کے بعد چیخنے کی آوازیں آئیں۔ پھر اسے اپنے سر کی پُشت پر ایک ضرب پڑتی محسوس ہوئی اور آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ وہ لڑکھڑا کر پتھریلے فٹ پاتھ پر منھ کے بل گر پڑا اور بے ہوش ہو گیا۔ جب اسے ہوش آیا تو اس کا سر اس کے بھائی کی گود میں تھا۔ اندھیرے میں اپنی سُوجی ہوئی اور خون آلود آنکھوں سے وہ بمشکل اپنے بھائی کے چہرے کے نقوش پہچان سکا جس پر خراشیں پڑی ہوئی تھیں۔ پھر اسے کراہنے کی آواز سنائی دی، کسی نے مدد کے لیے پکارا، اور فوراً ہی وہ اُس طالبِ علم کی آواز پہچان گیا جو شاید اچانک ذہنی صدمے سے حواس کھو بیٹھا تھا اور وہی بات بار بار دُہرا رہا تھا: "تو نے مجھے سوچنے کی صلاحیت کیوں بخشی؟ تو نے مجھے اس ہولناک عیب میں کیوں مبتلا کیا؟" اب محمود کو اندازہ ہوا کہ پاس کھڑے ہوئے ایک ساتھی کا بازو الگ ہو کر جُھول رہا ہے۔ ایک اَور شخص زمین پر جھکا ہوا بیٹھا تھا اور اس کے منھ سے خون بہہ رہا تھا۔ وہ سب خوف کے عالم میں ساتھ ساتھ بڑی سڑک کی طرف چلنے لگے، کہ حملہ کسی بھی وقت دوبارہ ہو سکتا تھا۔

محمود کے ماتھے پر ٹانکے آئے اور سر سُوج گیا۔ اگلی صبح وہ اپنے بستر میں لیٹا ہوا تھا کہ

ملازم لڑکے نے اسے ایک اخبار لا کر دیا جس میں پچھلی رات کے واقعے کی خبر اس طرح درج تھی: "کل رات کان کے قریب عادی مجرم سماج دشمنوں نے ایک مقامی بنگلے میں عیش و عشرت کی ایک محفل برپا کی۔ علاقے کے محب وطن باشندے ان لوگوں کے نامناسب اور مکروہ رویّے کی کئی بار شکایت کر چکے تھے۔ لیکن ہنگامہ پسندوں کے اس گروہ نے پُرامن باشندوں کی شکایت پر دھیان دینے کے بجاے مشتعل ہو کر ان پر پتھروں اور لاٹھیوں سے حملہ کر دیا۔ علاقے کے محب وطن باشندوں نے اپنا دفاع کرتے ہوے انھیں مار بھگایا اور علاقے میں امن قائم کر دیا۔" محمود کا سر چکرا گیا اور وہ بخار کے سے عالم میں کراہنے لگا۔

"شاہ کا وقت پورا ہو چکا ہے،" چند روز بعد محمود کا بھائی مضبوط لہجے میں کہہ رہا تھا۔ "بےمدافعت قوم پر ظلم و ستم ہمیشہ جاری نہیں رہ سکتا۔" "وقت پورا ہو چکا ہے؟" محمود نے اپنا پٹیوں میں بندھا سر حیرت سے اٹھا کر پوچھا۔ "تمھارا دماغ تو درست ہے؟ تم نے اس کی فوج نہیں دیکھی؟" ظاہر ہے، اس کے بھائی کو شاہ کی فوج کے بارے میں علم تھا، محمود کا یہ سوال محض اپنی بات پر زور دینے کے لیے تھا۔ محمود نے ٹیلی وژن اور فلموں میں شاہی فوج کے ڈویژنوں کو بار بار دیکھا تھا: پریڈ، قواعد، جنگی طیارے، راکٹ، اور دیکھنے والے کے دل کا نشانہ لیتی ہوئی توپوں کے دہانے۔ اس نے شاہ کے سامنے سلامی دیتے ہوے معمّر جنرلوں کو بمشکل تن کر کھڑے ہوتے بڑی نفرت سے دیکھا تھا۔ وہ سوچنے لگتا تھا کہ اگر پاس ہی کوئی بم پھٹ جائے تو یہ جنرل کیسا طرزِ عمل اختیار کریں گے؛ غالباً انھیں دل کا دورہ پڑ جائے گا۔ ٹی وی اسکرین کا گھیراو کرنے والے ٹینکوں اور توپوں کی تعداد ماہ بہ ماہ بڑھتی جاتی تھی۔ محمود کے خیال میں یہ ایک زبردست قوّت تھی جو کسی بھی مخالفت کو کچل ڈالنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔

سخت گرمی کے مہینوں کا آغاز ہو گیا۔ تہران کے جنوب میں واقع ریگستان سے شعلے اٹھنے لگے۔ محمود کے زخم اب ٹھیک ہو چلے تھے اور اس نے اپنی شام کی سیر کی عادت دوبارہ شروع کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ وہ سیر کے لیے نکل گیا۔ شام گہری ہو چکی تھی۔ وہ ایک بہت بڑی، ہیبت ناک زیرِ تعمیر عمارت کے پاس ایک نیم تاریک گلی میں چل رہا تھا۔ یہ عمارت رستاخیز پارٹی کا نیا ہیڈکوارٹر تھا جسے بہت تیز رفتاری سے مکمّل کیا جا رہا تھا۔ محمود کو خیال ہوا کہ اس نے اندھیرے میں کسی سائے کو حرکت کرتے دیکھا ہے اور جھاڑیوں میں سے کسی کے باہر نکلنے کی سرسراہٹ سنی ہے۔ لیکن وہاں جھاڑیاں تھیں ہی نہیں! اس نے

اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش کی مگر ناکام رہا اور خوف کے عالم میں برابر کی سڑک پر مڑ گیا۔ وہ سخت خوف زدہ تھا، حالاں کہ جانتا تھا کہ اس کا خوف بے بنیاد ہے۔ اسے سردی کی لہر سی بدن میں دوڑتی محسوس ہوئی اور اس نے فوراً واپس ہونے کا ارادہ کیا۔ وہ مرکزِ شہر میں ایک ڈھلواں سڑک سے نیچے اترنے لگا۔ اچانک اسے اپنے پیچھے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ وہ چونک پڑا کیوں کہ اسے یقین تھا کہ سڑک پر کوئی نہیں ہے۔ اس کے قدم بے اختیار تیز ہو گئے اور اس کے ساتھ ساتھ پیچھے آنے والے قدموں کی چاپ بھی تیز ہو گئی۔ وہ دونوں کچھ دور تک تیز تیز، گارڈ آف آنر کے دو سپاہیوں کی طرح قدم سے قدم ملا کر چلتے رہے۔ پھر محمود نے اپنی رفتار اَور بڑھا دی۔ اس کا تعاقب کرنے والے نے بھی ایسا ہی کیا، بلکہ وہ اَور قریب پہنچ گیا۔ محمود نے کچھ سوچنے کی مہلت پانے کے لیے اپنی رفتار ذرا کم کی، لیکن جلد ہی خوف عقل پر غالب آ گیا اور وہ تیز تیز بھاگنے لگا۔ اسے اپنے بدن میں دہشت کی جھرجھری محسوس ہو رہی تھی۔ اسے ڈر لگ رہا تھا کہ اس کے کسی عمل سے پیچھا کرنے والا شخص مشتعل نہ ہو جائے۔ اس کا خیال تھا کہ بھاگنے سے وہ حملے کو ملتوی کر رہا ہے، لیکن جو کوئی بھی اس کا پیچھا کر رہا تھا ایک پتلی سی گلی میں اس کے بالکل پاس پہنچ گیا اور محمود کو گلی میں پڑتے ہوئے قدموں کی گونج کے ساتھ ساتھ اس کے سانسوں کی آواز بھی سنائی دینے لگی۔ آخر محمود خود پر قابو بالکل کھو بیٹھا اور بے تحاشا دوڑنے لگا۔ دوسرا شخص بھی دوڑ پڑا اور محمود کی جیکٹ کا کالر سیاہ جھنڈے کی طرح ہوا میں پھڑپھڑانے لگا۔ اچانک اسے احساس ہوا کہ اب اس کے پیچھے ایک نہیں بلکہ بہت سے لوگ دوڑ رہے ہیں، درجنوں قدموں کی آواز کسی سیلاب کی طرح اس کے تعاقب میں آ رہی تھی۔ محمود کا سانس اکھڑ چلا تھا مگر وہ پھر بھی دوڑتا رہا۔ اس کا بدن پسینے میں تر تھا، ذہن معطّل تھا اور لگ رہا تھا کہ وہ ابھی زمین پر گر پڑے گا۔ اپنی باقی ماندہ طاقت جمع کر کے اس نے ایک قریبی مکان کا پھاٹک تھام لیا اور چھلانگ لگا کر کھڑکی کی سلاخوں سے لٹک گیا۔ اسے اپنا دل پھٹتا محسوس ہو رہا تھا، اور کوئی اجنبی ہاتھ اس کے سینے پر متواتر گھونسے مار رہا تھا۔ رفتہ رفتہ اس نے خود پر قابو پا کر اِدھر اُدھر نظر ڈالی۔ آس پاس موجود واحد جاندار ایک بلّی تھی جو دیوار کے ساتھ ساتھ لپکتی چلی جا رہی تھی۔ وہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر بڑی دقّت سے گھسٹتا ہوا اپنے فلیٹ تک پہنچا۔ اسے سخت دل گرفتگی محسوس ہو رہی تھی اور وہ بالکل ٹوٹ چکا تھا۔

("یہ سب کچھ اُس رات سے شروع ہوا جب ہم نشست سے واپس آ رہے تھے۔ اس

کے بعد سے میں مسلسل خوف کا سایہ محسوس کرنے لگا۔ یہ خوف اچانک، بالکل غیر متوقع طور پر مجھے آلیتا۔ مجھے اس پر بڑی ندامت ہوتی تھی لیکن میں اس خوف پر قابو نہ پا سکتا تھا۔ اس نے مجھے دھیرے دھیرے کھانا شروع کر دیا۔ یہ سوچ کر مجھے ہَول آنے لگتا کہ اس خوف کو یوں اپنے سینے میں اٹھائے ہوئے میں غیر ارادی طور پر ایک نظام کا حصّہ بن گیا ہوں جس کی بنیاد خوف پر ہے۔ میرے اور اس مطلق العنان فرماں روا کے درمیان ایک دہشت ناک، مگر نہ مٹنے والا رشتہ، ایک طرح کا مریضانہ ربط قائم ہو گیا تھا۔ اس خوف کے ذریعے میں اس نظام کو گویا سہارا دیے ہوئے تھا جس سے شعوری طور پر نفرت کرتا تھا۔ یہی خوف، میرا خوف، شاہ کی قوّت کا باعث تھا، وہ اس پر بھروسا کر سکتا تھا کہ جب تک میرا یہ خوف باقی ہے وہ کسی خطرے کا شکار نہیں ہو سکتا۔ اس خوف کا خاتمہ کر کے میں شاہ کے تخت کی بنیاد پر ضرب لگا سکتا تھا، لیکن ابھی ایسا کرنے کے قابل نہیں تھا۔")

اس پورے موسمِ گرما کے دوران محمود کی یہی حالت رہی۔ وہ اپنے بھائی کی لائی ہوئی خبریں بڑی بے حسی سے سنا کرتا۔

اُن دنوں ہر شخص گویا آتش فشاں کے دہانے پر رہ رہا تھا جو کسی بھی لمحے پھٹ سکتا تھا۔ کرمان شاہ میں ایک گھوڑا پاگل ہو کر لوگوں پر چڑھ دوڑا: کوئی کسان اس گھوڑے کو شہر میں لے آیا تھا اور اسے بڑی سڑک کے کنارے ایک درخت کے تنے سے باندھ دیا تھا۔ اس نے کچھ گزرتی ہوئی گاڑیوں کو دولتّیاں ماریں، رسیاں تڑا کر بھاگ نکلا اور کئی راہگیروں کو حملہ کر کے زخمی کر دیا۔ آخر ایک سپاہی نے اسے گولی مار دی۔ لوگ گھوڑے کی لاش کے گرد جمع ہو گئے۔ پولیس آئی اور ہجوم کو منتشر کرنے لگی۔ کسی شخص نے چلّا کر کہا: "اُس وقت پولیس کہاں تھی جب یہ لوگوں کو کچل رہا تھا؟" اس پر لڑائی شروع ہو گئی۔ پولیس نے گولی چلا دی، لیکن ہجوم بڑھتا گیا۔ لوگ غصّے سے پاگل ہو رہے تھے؛ انھوں نے سڑک پر رکاوٹیں کھڑی کرنا شروع کر دیا۔ پھر فوج آ گئی اور شہر پر کرفیو نافذ کر دیا گیا۔ محمود کے بھائی نے سوال کیا: "کیا تمھارے خیال میں لاوا پھٹ پڑنے کے لیے اس سے زیادہ بڑے واقعے کی ضرورت تھی؟" لیکن محمود نے ہمیشہ کی طرح سوچا کہ وہ مبالغہ کر رہا ہے۔

ستمبر میں ایک روز خیابانِ رضا شاہ پر چلتے ہوئے محمود کو آگے کچھ دور پر کسی ہنگامے کے آثار دکھائی دیے۔ یونیورسٹی کے پھاٹک کے سامنے فوجی ٹرک، ہیلمٹ، بندوقیں اور ہری وردیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ طلبا کو پکڑ پکڑ کر ٹرکوں میں ڈال رہے تھے۔ محمود کو

چیخیں سنائی دیں اور اس نے کچھ نوجوانوں کو سڑک پر دوڑتے دیکھا۔ اچانک سائرن بج اٹھے اور گرفتار طلبا سے بھرے ہوئے ٹرک چل پڑے۔ وہ کھچاکھچ بھرے ہوئے ٹرکوں میں فوجیوں کے گھیرے میں کھڑے تھے اور ان کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ بظاہر چھاپا ختم ہو چکا تھا اور محمود نے جا کر اپنے بھائی کو اطلاع دینے کا ارادہ کیا کہ فوج نے یونیورسٹی پر چڑھائی کر دی ہے۔ بائی اسکول کا ایک نوجوان استاد فریدون گنجی، جس سے محمود کی ملاقات اُس ادبی نشست میں ہوئی تھی، اتفاق سے اس کے بھائی کے پاس آیا ہوا تھا۔ محمود کے بھائی کے کہنے کے مطابق جھاڑیوں میں سے کیے گئے حملے کے اگلے دن جب فریدون اسکول گیا تو پرنسپل نے، جسے ساواک کی جانب سے ٹیلی فون موصول ہو چکا تھا، بلوے اور فساد کا الزام لگا کر اسے نوکری سے نکال دیا۔ پرنسپل نے چلّا کر کہا کہ اسے اس بات پر شرم آتی ہے کہ اسکول کے معصوم شاگرد ایسے کسی شخص کی شکل بھی دیکھیں۔ فریدون اب بہت دنوں سے بے روزگار تھا اور کام کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا تھا۔

محمود کے بھائی نے کہا کہ وہ تینوں رات کا کھانا بازار جا کر کھائیں گے۔ بازار کی ایک پُرہجوم، تنگ گلی میں محمود کو کچھ نوجوان افیون کے سے نشے میں لڑکھڑاتے دکھائی دیے۔ ان میں سے بعض فٹ پاتھ پر بیٹھے کانچ کی سی خالی آنکھوں سے اپنے سامنے تک رہے تھے اور بعض راہگیروں کو ستاتے ہوئے ان پر آوازے کس رہے تھے اور گھونسے دکھا دکھا کر دھمکا رہے تھے۔ "پولیس یہ سب کچھ کس طرح برداشت کر رہی ہے؟" اس نے اپنے بھائی سے پوچھا۔ "بہت آسانی سے،" اس نے جواب دیا۔ "اس طرح کے لوگ ان کے بہت کام آتے ہیں۔ آج انھیں تھوڑی بہت رقم اور کچھ لاٹھیاں دی جائیں گی اور طلبا پر چھوڑ دیا جائے گا۔ کل کے اخبار میں صحت مند، محبِ وطن نوجوانوں کا ذکر ہو گا کہ انھوں نے رستاخیز کی آواز پر لبیک کہا اور یونیورسٹی کی چاردیواری میں پلنے والے سماج دشمن عناصر کو سبق سکھایا۔"

وہ ایک ریستوراں میں داخل ہوئے اور وسط کی ایک میز پر بیٹھ گئے۔ ابھی وہ ویٹر کا انتظار ہی کر رہے تھے کہ محمود کو برابر کی میز پر دو ہٹے کٹے آدمی دکھائی دیے۔ ساواک! اس خیال کی گونج اس کے دماغ میں دوڑ گئی۔ "کیا کہتے ہو؟" اس نے اپنے بھائی اور فریدون سے پوچھا۔ "میرا خیال ہے ہمیں دروازے کے پاس کی میز پر بیٹھنا چاہیے۔" وہ اس میز پر چلے گئے اور ویٹر فوراً ہی آ گیا۔ لیکن اس کا بھائی ابھی آرڈر دے ہی رہا تھا کہ محمود کی نظر دو خوش وضع اور خوش لباس آدمیوں پر پڑی جنھوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ ساواک

کے ایجنٹ جو ہم جنس پرست ہونے کا ناٹک کر رہے ہیں! اس نے دہشت کے ساتھ سوچا۔ "میرا خیال ہے کھڑکی کے پاس چل کر بیٹھنا چاہیے،" اس نے بھائی سے کہا۔ "میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ باہر کیا ہو رہا ہے۔" وہ کھڑکی کے پاس کی میز پر جا بیٹھے۔ ابھی انھوں نے کھانا شروع ہی کیا تھا کہ تین آدمی ریستوراں میں داخل ہوئے اور گویا سوچے سمجھے ارادے سے اُسی کھڑکی کے پاس کی دوسری میز پر آ کر بیٹھ گئے جس کھڑکی سے محمود باہر بازار کو دیکھ رہا تھا۔ "ہماری نگرانی کی جا رہی ہے،" وہ سرگوشی میں بولا، اور اسی لمحے اسے اندازہ ہوا کہ ویٹر جوان کے بار بار میز بدلنے کا مشاہدہ کر رہا تھا انھیں مشکوک نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ اسے احساس ہوا کہ ویٹروں کی نظر میں وہ تینوں ساواک کے کارندے ہوں گے جو اپنے شکار کی تلاش میں بار بار میزیں بدل رہے ہیں۔ اس کی بھوک اڑ گئی اور نوالہ حلق میں اٹکنے لگا۔ اپنی پلیٹ کو ایک طرف کھسکاتے ہوئے اس نے سر ہلا کر چلنے کا اشارہ کیا۔

وہ تینوں محمود کے بھائی کے گھر پہنچے اور انھوں نے کار میں شہر کی گھٹی ہوئی فضا سے دور نکل کر تازہ ہوا میں سانس لینے کا ارادہ کیا۔ وہ نودولتیوں کی بستی شمیران کی سیمنٹ کی بُو سے بوجھل فضا سے گزرتے ہوئے شمال کی سمت بڑھنے لگے۔ سڑک کے دونوں جانب عالی شان بنگلے، بھڑک دار ولائیں، پُرتعیش ریستوراں اور بوتیک، وسیع باغ اور محدود رکنیت والے کلب تھے جن کے احاطوں میں سوئمنگ پول اور ٹینس کورٹ بنے ہوئے تھے۔ ہر طرف پھیلے ہوئے ریگستان کے اس حصّے کی ایک مربع فٹ زمین کی قیمت ہزاروں نہیں تو سینکڑوں ڈالر ضرور تھی اور اس کے باوجود اس کی طلب میں کمی نہیں ہوتی تھی۔ یہ دربار سے وابستہ، مراعات یافتہ حلقے کا علاقہ تھا، ایک اَور دنیا، ایک اَور سیّارہ۔

o o o

آنے والے ہفتوں میں مظاہروں، احتجاجی خطوں، اور خفیہ گفتگوؤں اور تقریروں کی تعداد بڑھتی گئی۔ نومبر میں انسانی حقوق کے تحفظ کی ایک کمیٹی اور طلبا کی ایک زیرِزمین یونین قائم ہوئی۔ کبھی کبھار محمود پڑوس کی مسجد میں جاتا تو اسے وہاں لوگوں کا ہجوم دکھائی دیتا، لیکن پُرجوش مذہبیت کی فضا اس کے لیے اجنبی تھی اور وہ نہیں جانتا تھا کہ اُس دنیا سے کس طرح رابطہ پیدا کرے۔ خود ہی سے پوچھنا پڑتا ہے، وہ سوچتا، کہ یہ سب لوگ کہاں جا رہے ہیں۔ ان لوگوں کی اکثریت پڑھنے لکھنے سے نابلد تھی۔ وہ خود کو ایک ناقابلِ فہم، خشم ناک دنیا میں پاتے تھے جو ان کے ساتھ فریب، استحصال اور تحقیر سے پیش آ رہی تھی۔ انھیں

کوئی پناہ گاہ درکار تھی، سکون اور تحفظ کی ضرورت تھی۔ وہ صرف ایک ہی بات جانتے تھے: حقیقت کے اس غیر دوستانہ ماحول میں صرف خدا ایسی حقیقت کے طور پر موجود تھا جو تغیر سے عاری اور اور اپنی جگہ اٹل تھی۔

محمود آج کل بہت پڑھ رہا تھا اور جیک لنڈن اور رڈیارڈ کپلنگ کا ترجمہ کر رہا تھا۔ جب اسے اپنے لندن کے دن یاد آتے تو وہ یوروپ اور ایشیا کے فرق کی بابت سوچنے لگتا اور کپلنگ کا مقولہ دُہراتا: "مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب، اور دونوں۔۔۔" ہاں واقعی، دونوں کبھی نہیں مل سکتے! اور کبھی ایک دوسرے کو نہیں سمجھ سکتے! ایشیا کی زمین یوروپ سے درآمد کیے ہوئے ہر پیوند کو مسترد کر دے گی۔ یوروپ کے لوگ صدمے اور اشتعال میں مبتلا ہوں گے، لیکن ایشیا کو تبدیل کرنے سے قاصر رہیں گے۔ یوروپ میں ادوار ایک کے بعد ایک آتے ہیں، اور ہر آنے والا دور پچھلے دور کو منسوخ کرتا چلا جاتا ہے؛ زمین خود کو اپنے ماضی کے آثار سے پاک کرتی رہتی ہے، اسی لیے ہماری نسل کے لوگ اپنے آباواجداد کو سمجھنے میں دقت محسوس کرتے ہیں۔ یہاں معاملہ مختلف ہے؛ یہاں ماضی بھی اُسی قدر زندہ اور موجود ہے جتنا زمانۂ حال؛ پتھر کے وحشی اور سفاک زمانے کی باقیات الیکٹرونکس کے سرد، حسابی دور کے پہلو بہ پہلو موجود ہیں۔ یہ دونوں زمانے ایک ہی شخص میں موجود ہو سکتے ہیں جو بیک وقت چنگیز خاں کا وارث اور ایڈیسن کا طالبِ علم ہے۔۔۔ بشرطے کہ وہ ایڈیسن کی دنیا کے رابطے میں آسکا ہو۔

جنوری کے اوائل میں ایک رات محمود کو اپنے دروازے پر زور کی دستک سنائی دی۔ وہ چونک کر بستر سے نکل آیا۔

("آنے والا میرا بھائی تھا۔ اسے دیکھتے ہی میں سمجھ گیا کہ وہ سخت ہیجان کے عالم میں ہے۔ راہداری میں کھڑے ہوئے اس کے منھ سے صرف ایک لفظ نکلا: قتلِ عام! وہ بیٹھنے پر آمادہ نہیں تھا اور متواتر کمرے کے اندر چکر لگاتے ہوئے ہذیانی انداز میں بول رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ پولیس نے قُم میں شہریوں پر زبردست فائرنگ شروع کر دی ہے۔ اس نے پانچ سو آدمیوں کے مارے جانے کا ذکر کیا۔ بہت سی عورتیں اور بچّے بھی ہلاک ہو گئے۔ یہ معاملہ بظاہر ایک چھوٹی سی بات سے شروع ہوا تھا۔ اخبار "اطلاعات" میں ایک مضمون شائع ہوا تھا جس میں خمینی کی مذمت کی گئی تھی۔ یہ مضمون محل یا حکومت سے تعلق رکھنے والے کسی شخص نے تحریر کیا تھا۔ جب یہ اخبار خمینی کے شہر قم پہنچا تو لوگ سڑکوں پر جمع ہو کر

اس کے بارے میں گفتگو کرنے لگے۔ پولیس نے ہجوم پر گولی چلادی۔ چوک میں بھگدڑ مچ گئی ۔۔ لوگ جان بچا کر بھاگنا چاہتے تھے لیکن کوئی راستا نہیں تھا کیوں کہ پولیس نے تمام سڑکیں بند کر رکھی تھیں اور مسلسل فائرنگ کر رہی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ اگلے دن پورا تہران سخت اشتعال میں تھا۔ تاریک اور دہشت ناک دنوں کو آتے ہوئے محسوس کیا جا سکتا تھا۔")

۳
بُجھا ہوا شعلہ

انقلاب نے شاہ کی فرماں روائی کا خاتمہ کر دیا۔ اس نے محل کو تباہ اور شاہی کو دفن کر دیا۔ اس کا آغاز شاہی حکام کی بظاہر چھوٹی سی غلطی سے ہوا۔ اس ایک غلط اقدام کے ذریعے شاہی نے خود اپنی موت کے پروانے پر دستخط کر دیے۔

کسی انقلاب کے اسباب عموماً معروضی حالات میں تلاش کیے جاتے ہیں -- افلاس، جبر، شدید بد عنوانیاں۔ لیکن یہ نقطۂ نظر، درست ہونے کے باوجود، یک رخا ہے۔ آخر ایسے حالات بہت سے دوسرے ملکوں میں بھی موجود ہوتے ہیں، لیکن انقلاب تو شاذونادر ہی آتا ہے۔ اس کے آنے کے لیے جو چیزیں ضروری ہیں ان میں افلاس اور جبر کا شعور، اور یہ یقین شامل ہے کہ افلاس اور جبر دنیا کے فطری نظام کا حصّہ نہیں ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ اس سلسلے میں ان حالات کا تجربہ کرنا، خواہ وہ کتنا ہی دردناک ہو، کافی نہیں ہوتا۔ انقلاب کا جزوِ اعظم "لفظ" ہے، یعنی وہ خیال جو ہر شے کی وضاحت کر دے۔ چناں چہ بارود یا خنجروں

سے بڑھ کر لفظ۔۔ بے قابو اور آزادی سے گردش کرتے ہوئے لفظ، زیرِ زمین بغاوت پھیلاتے ہوئے لفظ، وردی یا شناخت سے عاری لفظ۔۔ ظالم بادشاہوں کو دہشت زدہ کر دیتے ہیں۔ لیکن بعض صورتوں میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ وردی میں ملبوس، شناخت یافتہ سرکاری لفظ انقلاب کے آنے کا باعث بن جاتے ہیں۔

o o o

انقلاب کو بغاوت، فوجی کودیتا یا محلاتی سازش کے ذریعے بادشاہ کی تبدیلی سے الگ پہچاننا ضروری ہے۔ کودیتا یا سازش کی منصوبہ بندی کی جا سکتی ہے مگر انقلاب کی منصوبہ بندی کبھی نہیں کی جا سکتی۔ انقلاب کا آغاز، اس آغاز کا وقت، ہر ایک کو، خود اُن کو بھی جو اس کے لیے جدوجہد کرتے رہے ہوں، چونکا دیتا ہے۔ وہ اس بے ساختگی پر حیران اور ساکت کھڑے رہ جاتے ہیں جو اچانک نمودار ہو کر اپنی راہ میں آنے والی ہر شے کو نیست و نابود کرتی چلی جاتی ہے۔ انقلاب کی پھیلائی ہوئی تباہی اس قدر شدید اور سفّاک ہوتی ہے کہ وہ آخر کار اُن آدرشوں کو بھی تباہ کر سکتا ہے جنھوں نے اسے پیدا کیا تھا۔

یہ ایک غلط مفروضہ ہے کہ تاریخ کی ناانصافی کا شکار ہونے والی قومیں (اور ایسی قومیں اکثریت میں ہیں) ہمیشہ انقلاب کے خیال میں رہتی ہیں اور اسے سادہ ترین حل کے طور پر دیکھتی ہیں۔ ہر انقلاب ایک ڈرامائی صورتِ حال ہے، اور انسانیت جبلّی طور پر ڈرامائی صورتِ حال سے گریزاں رہتی ہے۔ اگر ہم ایسی کسی صورتِ حال میں پھنس بھی جائیں تو فوراً اس سے فرار کا راستا ڈھونڈنے لگتے ہیں؛ ہم سکون کے، اور اکثر حالات میں روزمرّہ کی صورتِ حال کے، متلاشی رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انقلاب زیادہ عرصے تک باقی نہیں رہتے۔ یہ آخری اقدام ہے، اور لوگ انقلاب کا راستا تبھی اختیار کرتے ہیں جب طویل تجربے نے انھیں یقین دلا دیا ہو کہ یہی ایک حل باقی رہ گیا ہے؛ دوسری تمام کوششیں، دوسرے تمام راستے بے اثر ثابت ہو چکے ہیں۔

ہر انقلاب سے پہلے شدید تھکن اور بے بسی کا دور آتا ہے اور ہر انقلاب بے لگام جارحیت کے پس منظر میں رونما ہوتا ہے۔ حاکمیت ایسی قوم کو برداشت نہیں کر پاتی جو اس کے اعصاب پر سوار ہو گئی ہو؛ قوم ایسی حاکمیت کو برداشت نہیں کر پاتی جس سے اسے

نفرت ہو گئی ہو۔ حاکمیت اپنا تمام اعتبار کھو کر خالی ہاتھ ہو چکی ہوتی ہے؛ قوم اپنے صبر سے محروم ہو کر بند مٹھی کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ شدید تناؤ اور بڑھتے ہوئے حبس کا ماحول طاری ہو جاتا ہے۔ ہم دہشت کے پاگل پن میں اترنے لگتے ہیں۔ لاوا پھوٹ بہنے کو ہے۔ ہم اسے محسوس کر سکتے ہیں۔

o o o

جہاں تک جدوجہد کی تکنیک کا سوال ہے، تاریخ نے آج تک دو قسم کے انقلاب دیکھے ہیں۔ پہلا انقلاب بذریعۂ یورش اور دوسرا انقلاب بذریعۂ محاصرہ۔ پہلی قسم کے انقلاب کی کامیابی، اس کے مستقبل کی ظفرمندی کا فیصلہ پہلی ہی ضرب سے ہو جاتا ہے۔ پیش قدمی کرو اور ایک سانس میں جس قدر زمین پر قبضہ کر سکتے ہو کر لو! یہ بے حد اہم بات ہے، کیوں کہ اس قسم کا انقلاب جتنا پُرزور ہوتا ہے اُتنا ہی سطحی بھی ثابت ہوتا ہے۔ مخالف کو شکست ہو چکی ہے لیکن وہ پسپا ہوتے ہوئے بھی اپنی قوّت کا ایک بڑا حصّہ بچا لے گیا ہے۔ وہ دوبارہ حملہ کرے گا اور فاتح قوّت کو پسپائی پر مجبور کرنے کی کوشش کرے گا۔ اس لیے پہلے ہلّے میں جتنا کچھ قبضے میں آ سکے گا، بعد کے حملوں میں اُسی تناسب سے زیادہ حصّہ قبضے میں برقرار رہ سکے گا۔ یورش کے ذریعے برپا کیے گئے انقلاب کا پہلا ہی مرحلہ سب سے زیادہ پُرقوّت ہوتا ہے۔ بعد کے مرحلے دراصل بتدریج پسپائی کے مرحلے ہوتے ہیں، یہاں تک کہ ایسا مقام آ جاتا ہے جہاں حاکم اور باغی قوّتوں کے درمیان حتمی سمجھوتا ہو جاتا ہے۔ انقلاب بذریعۂ محاصرہ اس سے بالکل مختلف ہے؛ اس کا پہلا مرحلہ عموماً کم زور ہوتا ہے اور اسے دیکھ کر یہ پیش گوئی نہیں کی جا سکتی کہ یہ کتنی بڑی تبدیلی کا اشارہ ثابت ہو گا۔ لیکن واقعات بہت تیزی سے رفتار پکڑنے لگتے ہیں اور ڈرامائی صورت حال پیدا ہو جاتی ہے۔ ان میں حصّہ لینے والے لوگوں کی تعداد تیزی سے بڑھنے لگتی ہے۔ حاکمیت کی پناہ گاہ کی دیواروں میں دراڑیں پڑنے لگتی ہیں اور آخرکار یہ دیواریں بھک سے اُڑ جاتی ہیں۔ محاصرے کے ذریعے لائے جانے والے انقلاب کی کامیابی باغیوں کی ثابت قدمی، ان کی قوّتِ ارادی اور قوّتِ برداشت پر منحصر ہوتی ہے۔ ایک دن اَور! ایک دھکّا اَور! آخرکار پھاٹک ٹوٹ جاتے ہیں، ہجوم اپنے زور میں اندر داخل ہو جاتا ہے اور اپنی کامیابی کا جشن منانے لگتا ہے۔

انقلاب کو حرکت میں لانے کی ذمے دار حاکمیت ہوتی ہے۔ ظاہر ہے، وہ یہ عمل شعوری طور پر نہیں کرتی۔ مگر اس کا طرزِ زندگی اور طرزِ حکومت خود اشتعال کا سبب بن جاتے ہیں۔ یہ اُس وقت ہوتا ہے جب انجام سے بے پروائی حاکم طبقوں میں جڑ پکڑ لیتی ہے: ہمیں سب کچھ کرنے کا اختیار ہے، ہم سب کچھ کر سکتے ہیں۔ یہ خود فریبی ہے مگر عقلی مفروضوں پر بنیاد رکھتی ہے۔ کچھ عرصے تک یہی محسوس ہوتا ہے کہ یہ لوگ جو بھی چاہیں کر سکتے ہیں۔ ایک کے بعد ایک اسکینڈل اور ایک کے بعد ایک لاقانونیت سزا پائے بغیر سامنے آتی رہتی ہے۔ لوگ خاموش رہتے ہیں، صبر کرتے رہتے ہیں، احتیاط برتتے رہتے ہیں۔ وہ خوف زدہ ہیں اور ابھی اپنی طاقت کا احساس نہیں رکھتے۔ لیکن وہ ناانصافیوں کو فہرست میں درج کرتے جاتے ہیں، اور ایک نہ ایک لمحہ ایسا آتا ہے جب ان سب ناانصافیوں کا حاصل جمع نکالا جانا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ اس لمحے کا انتخاب تاریخ کے سامنے آنے والا سب سے لاینحل معما ہے۔ یہ واقعہ اُس خاص دن کیوں پیش آیا، کسی اَور دن کیوں نہیں؟ یہی واقعہ کیوں اس تبدیلی کا سبب بنا، کوئی اَور واقعہ کیوں نہیں؟ آخر یہی حکومت کل تک اس سے کہیں زیادہ بڑی زیادتیاں کرتی آ رہی تھی، اور ان پر کوئی ردِ عمل ظاہر نہیں ہوا تھا۔ "میں نے آخر کیا کیا ہے؟" آمر بے بس اور حیران ہو کر پوچھتا ہے۔ "اس سب لوگوں پر کیا جنون سوار ہو گیا ہے؟" دراصل اُس نے یہ کیا ہے کہ لوگوں کے صبر کی حد کو پامال کر دیا ہے۔ لیکن صبر کی حد کہاں ہوتی ہے؟ اس کی تعریف کیا ہے؟ اگر اس سوال کا جواب معلوم کیا بھی جا سکے تو یہ جواب ہر انقلاب کے سلسلے میں مختلف ہو گا۔ واحد بات جو یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے یہ ہے کہ جو حکمراں یہ جانتے ہیں کہ صبر کی حد وجود رکھتی ہے، اور یہ جانتے ہیں کہ اس حد کا احترام کس طرح کیا جاتا ہے، وہ بہت طویل عرصے تک اقتدار کو اپنے قبضے میں رکھ سکتے ہیں۔ لیکن ایسے حکمرانوں کی تعداد بہت کم ہوتی ہے۔

شاہ نے اس حد کو کس طرح پامال کیا، اور اپنی موت کے پروانے پر کیوں کر دستخط کیے؟ ایک اخباری مضمون کے ذریعے سے۔ حاکموں کو جاننا چاہیے کہ ایک بے احتیاط لفظ عظیم ترین سلطنت کو ڈھانے پر قادر ہوتا ہے۔ ظاہر یہی ہوتا ہے کہ وہ یہ بات جانتے ہیں، اس کے بارے میں بے حد چوکس ہیں، لیکن ایک خاص موقعے پر خود حفاظتی کی جبلت ناکام ہو جاتی ہے، اور خود اعتمادی اور خود سری کے اس لمحے میں وہ تکبر کی غلطی کر بیٹھتے ہیں اور

نیست و نابود ہو جاتے ہیں۔ ۸ جنوری ۱۹۷۸ کو سرکاری روزنامہ اخبار "اطلاعات" میں ایک مضمون شائع ہوا جس میں خمینی کی شخصیت پر حملہ کیا گیا تھا۔ اُن دنوں خمینی ملک سے باہر ایک جلاوطن کی حیثیت سے رہتے ہوئے شاہ کے خلاف جدوجہد کر رہا تھا۔ شاہ کی ستم رانیوں اور جبری جلاوطنی کا شکار خمینی، لوگوں کے ضمیر اور پرستش کی علامت تھا۔ خمینی کی حیثیت کی تباہی دراصل ایک مقدس شے کی تباہی، ظلم اور ذلت کے شکار لوگوں کی امیدوں کے خاتمے کے مترادف تھی۔ اس اخباری مضمون کی اشاعت کا یہی منشا تھا۔

اپنے مخالف کو ہم کیوں کر تباہ کر سکتے ہیں؟ اس کی بہترین صورت یہ ہے کہ یہ ثابت کر دیا جائے کہ وہ ہم میں سے نہیں ہے، اجنبی ہے، خارجی ہے۔ اس کے واسطے ہم ایک حقیقی خاندان کا زُمرہ تخلیق کرتے ہیں۔ میں اور تم، حاکم اور محکوم، ایک حقیقی کنبہ ہیں۔ ہم اپنے ہم جنسوں کی صحبت میں ہم آہنگی کے ساتھ رہتے ہیں۔ ہمارے سروں پر ایک مشترکہ چھت ہے، ہم ایک ہی میز پر بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں، ہم ایک دوسرے سے برتاو کرنا جانتے ہیں، ایک دوسرے کی مدد کرنا جانتے ہیں۔ بدقسمتی سے ہم کسی خلا میں نہیں رہتے۔ ہم چاروں طرف سے اجنبیوں، خارجیوں، غیروں میں گھرے ہوئے ہیں جو ہمارے امن و سکون کو غارت کرنا اور ہمارے گھر پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ اجنبی کون ہے؟ سب سے بڑھ کر یہ کہ اجنبی ہم سے بدتر ہے۔۔ اور بدتر ہونے کے ساتھ ساتھ خطرناک بھی ہے۔ کاش وہ ہم سے صرف بدتر ہوتا اور ہمارے لیے خطرہ پیدا نہ کرتا۔ افسوس، ایسا نہیں ہے! وہ ضرور پانی کو زہریلا کرے گا، فساد برپا کرے گا، تباہی پھیلائے گا۔ وہ ہمارے درمیان دشمنی پیدا کرے گا، ہمیں بےوقوف بنائے گا، ہمیں توڑ دے گا۔ اجنبی تمھاری تاک میں بیٹھا ہے۔ وہی تمھاری تمام مصیبتوں کا باعث ہے۔ اور اُس کی طاقت کا راز کیا ہے؟ یہ کہ غیر (اجنبی، خارجی، غیر ملکی) قوّتیں اس کی پشت پر ہیں۔ خواہ ان قوّتوں کو پہچاننا ممکن ہو یا نہ ہو، ایک بات یقینی ہے: وہ بہت طاقت ور ہیں۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہو گا کہ اگر ہمیں ان کی سنگینی کا احساس نہیں ہوا تو وہ بہت طاقت ور ثابت ہوں گی۔ لیکن اگر ہم چوکس اور مقابلے پر تیار رہیں تو ہماری طاقت اُن سے بڑھ جائے گی۔ اب اس خمینی کو دیکھو۔ یہ تمھارے لیے اجنبی ہے۔ اس کے آباواجداد ہندوستان سے آئے تھے، اس لیے ہمیں خود سے دریافت کرنا چاہیے: اُن غیر ملکی آباواجداد کا یہ خلف کس کے مفادات کو تقویت پہنچا رہا ہے؟ یہ اُس

مضمون کا پہلا حصّہ تھا۔ دوسرے حصّے کا تعلّق صحت سے تھا۔ کتنی خوش نصیبی کی بات ہے کہ ہم صحت مند ہیں! ہمارا حقیقی خاندان بھی صحت مند خاندان ہے۔ ہم جسمانی اور ذہنی طور پر صحت مند ہیں۔ اس صحت مندی کے لیے ہمیں کس کا شکر گزار ہونا چاہیے؟ حکومت کا، جس نے ہمارے لیے اس مسرور، عمدہ زندگی کا بندوبست کیا، اور اس لیے وہ دنیا میں سب سے اچھی حکومت ہے۔ ایسی حکومت کی مخالفت کون کر سکتا ہے؟ وہی جو عقل سے عاری ہو۔ چوں کہ ہماری حکومت دنیا بھر میں بہترین حکومت ہے اس لیے اس کی مخالفت کرنے والا دیوانہ ہی ہو سکتا ہے۔ صحت مند معاشرے کو چاہیے کہ ایسے احمقوں اور دیوانوں کو چُن چُن کر باہر نکال دے۔ اس لیے یہ بہت اچھی بات ہے کہ شاہ نے خمینی کو ملک سے باہر نکال دیا۔ ورنہ اسے ملک کے اندر ہی کسی پاگل خانے میں قید کر کے رکھنا پڑتا۔

جب یہ اخباری مضمون قم پہنچا تو لوگ اسے پڑھ کر غضب ناک ہو گئے۔ وہ سڑکوں اور چوکوں پر جمع ہونے لگے۔ جو لوگ پڑھنا جانتے تھے انھوں نے اسے دوسروں کو پڑھ کر سنایا۔ اس اضطراب کے زیرِ اثر لوگوں کا ہجوم بڑھتا گیا، وہ چلّا چلّا کر بحث کرنے لگے۔۔ متواتر بحث کرنے کا ایرانیوں کو یوں بھی بے حد شوق ہے، کہیں بھی، کسی بھی وقت، دن میں یا رات کو۔ اس بحث سے گرمائی ہوئی ٹولیاں مقناطیس کی طرح تھیں؛ سننے والے ان کے گرد جمع ہوتے چلے جا رہے تھے، یہاں تک کہ شہر کے مرکزی چوک میں ایک بہت بڑا مجمع اکٹھا ہو گیا۔ اور یہی چیز پولیس کو سب سے زیادہ ناپسند ہوتی ہے۔ اس مجمعے کی اجازت کس نے دی؟ کسی نے بھی نہیں۔ کوئی اجازت نہیں دی گئی۔ اور ان لوگوں کو چلّانے کی اجازت کس نے دی؟ ہاتھ لہرانے کی اجازت کس نے دی؟ پولیس جانتی ہے کہ یہ بے معنی سوالات ہیں اور اب چوک میں جمع لوگوں سے نمٹنے کا وقت آ گیا ہے۔

o o o

اہم ترین لمحہ۔۔ وہ لمحہ جو ملک کی، شاہ کی اور انقلاب کی تقدیر کا فیصلہ کرنے والا ہے۔۔ وہ ہے جب ایک پولیس والا اپنی چوکی سے اتر کر مجمعے کے کنارے پر کھڑے ہوئے ایک شخص کے پاس پہنچتا ہے اور چلّا کر اسے گھر جانے کو کہتا ہے۔ پولیس والا اور مجمعے کے کنارے پر کھڑا ہوا شخص، دونوں بہت معمولی اور گمنام افراد ہیں لیکن ان کی ملاقات تاریخی اہمیت کی حامل ہے۔ وہ دونوں بالغ ہیں، بعض مخصوص واقعات سے گزر کر آئے ہیں، اور اپنا

اپنا انفرادی تجربہ رکھتے ہیں۔ پولیس والے کا تجربہ یہ ہے: اگر میں کسی شخص کو چلّا کر مخاطب کروں اور اپنا ڈنڈا اٹھاؤں تو پہلے تو وہ دہشت سے جم جاتا ہے اور پھر ایک دم بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ مجمعے کے کنارے پر کھڑے ہوئے شخص کا تجربہ یہ ہے: کسی پولیس والے کو آتا دیکھ کر مجھ پر خوف طاری ہو جاتا ہے اور میں بھاگ کھڑا ہوتا ہوں۔ ان دونوں تجربوں کی بنیاد پر ہم ایک منظر تیار کر سکتے ہیں: پولیس والا چلّاتا ہے، آدمی بھاگنے لگتا ہے، دوسرے لوگ بھی بھاگنے لگتے ہیں، اور چوک خالی ہو جاتا ہے۔ لیکن اِس بار ہر چیز مختلف انداز میں پیش آتی ہے۔ پولیس والا چلّاتا ہے لیکن آدمی نہیں بھاگتا۔ وہ وہیں کھڑا پولیس والے کو دیکھتا رہتا ہے۔ اس کے دیکھنے کا انداز محتاط ہے، اس میں ابھی تک خوف کی جھلک موجود ہے لیکن یہ ایک سخت اور ضدّی انداز ہے۔ تو منظر اصل میں یوں ہے: مجمعے کے کنارے پر کھڑا ہوا آدمی وردی والے حاکم کی طرف سخت اور ضدّی انداز سے دیکھ رہا ہے۔ وہ اپنی جگہ سے جنبش نہیں کرتا۔ وہ گردن گھماتا ہے اور دوسرے لوگوں کے چہروں پر بھی اسی سختی اور ضدّی پن کا تاثر دیکھتا ہے۔ اس کی طرح دوسرے لوگوں کا انداز بھی محتاط ہے، اس میں بھی اب تک خوف کی جھلک موجود ہے، لیکن اس میں مضبوطی اور عزم بھی دکھائی دے رہا ہے۔ پولیس والا چلّاتا رہتا ہے لیکن کوئی نہیں بھاگتا، آخر پولیس والا چلّانا بند کر دیتا ہے۔ خاموشی کا ایک لمحہ آتا ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ پولیس والے اور مجمعے کے کنارے پر کھڑے ہوئے آدمی کو احساس ہے یا نہیں کہ کیا واقعہ پیش آیا ہے۔ آدمی نے خوف زدہ ہونا ترک کر دیا ہے -- اور یہی انقلاب کا آغاز ہے۔ انقلاب شروع ہو چکا ہے۔ اس لمحے سے پہلے، جب کبھی پولیس والا اور آدمی ایک دوسرے کے پاس پہنچتے تو ایک تیسرا وجود ان دونوں کے درمیان آ کھڑا ہوتا تھا۔ یہ خوف تھا۔ خوف پولیس والے کا مددگار اور مجمعے میں کھڑے ہوئے آدمی کا دشمن تھا۔ خوف ہی اپنے قوانین نافذ کر کے ہر چیز کا فیصلہ کرتا تھا۔ اب یہ دونوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھڑے ہیں، خوف ان کے درمیان سے غائب ہو چکا ہے۔ اب تک ان دونوں کے درمیان ایک جذباتی رشتہ موجود تھا، جو جارحیت، تحقیر، طیش اور غضب کا آمیزہ تھا۔ مگر اب، خوف کے ہٹ جانے کے بعد، یہ مکروہ، نفرت انگیز رشتہ اچانک ٹوٹ گیا ہے: کوئی چیز مٹ گئی ہے۔ اب یہ دونوں ایک دوسرے سے لاتعلق ہو چکے ہیں، ایک دوسرے کے لیے بے مصرف ہو چکے ہیں: دونوں اب اپنا اپنا راستا اختیار کر سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پولیس والا مڑ کر بھاری قدموں سے اپنی چوکی کی طرف واپس جا رہا ہے اور مجمعے کے کنارے پر

کھڑا ہوا آدمی اپنے دشمن کو غائب ہوتے دیکھ رہا ہے۔

خوف ایک غارت گر اور حریص جانور ہے جو ہمارے اندر بستا ہے۔ وہ ہمیں ایک لمحے کو یہ بات بھولنے نہیں دیتا کہ وہ موجود ہے۔ وہ ہمیں کھاتا رہتا ہے اور ہماری آنتوں کو مروڑتا رہتا ہے۔ اسے ہر وقت خوراک درکار ہوتی ہے اور ہم اسے نفیس ترین غذائیں مہیا کرتے ہیں۔ اس کی مرغوب خوراک میں مایوس کن گفتگو، بُری خبریں، مضطرب خیالات اور بھیانک خواب شامل ہیں۔ بات چیت، بدشگونیوں اور خیالوں کے ہزاروں اجزا میں سے ہم ہولناک ترین اجزا منتخب کرتے ہیں -- جو خوف کو سب سے زیادہ پسند آئیں۔ ہم اس عفریت کو مطمئن رکھنے کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔ یہ دیکھیے، سامنے ایک شخص کسی کی بات سن رہا ہے؛ اس کا چہرہ زرد ہے اور حرکات سے اضطراب ظاہر ہے۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟ یہ آدمی اپنے خوف کو خوراک مہیا کر رہا ہے۔ اور اگر ہم اسے خوراک مہیا نہ کر سکیں تو؟ تب ہم جلدی سے خود کوئی چیز تیار کر لیتے ہیں۔ اور اگر ہم خود بھی کوئی چیز تیار نہ کر سکیں (اگرچہ ایسی صورت شاذونادر ہی پیش آتی ہے) تو کیا ہوتا ہے؟ ہم دوسرے لوگوں کے پاس دوڑتے ہیں، ان سے سوال کرتے ہیں، کن سوئیاں لے کر بُری خبریں جمع کرتے ہیں، تاکہ کسی طرح خوف کے اس عفریت کا پیٹ بھر سکیں۔

o o o

انقلابوں کے بارے میں تمام کتابوں کے پہلے باب زوال آمادہ حاکمیت کی شکستگی یا لوگوں کے مصائب اور ان پر ہونے والے مظالم کو بیان کرتے ہیں۔ دراصل ان کتابوں کا آغاز ایک نفسیاتی باب سے ہونا چاہیے، جس میں دکھایا جائے کہ کس طرح ایک دہشت زدہ، ستایا ہوا شخص اچانک دہشت کے اس طلسم کو توڑ ڈالتا ہے، خوف سے آزاد ہو جاتا ہے۔ یہ غیر معمولی عمل، کسی صدمے یا پاکیزگی کی کسی مختصر سی رسم کی طرح، اکثر لمحے بھر پر محیط ہوتا ہے۔ آدمی اپنے خوف کو نکال پھینکتا ہے اور آزاد ہو جاتا ہے۔ اس کے بغیر کوئی انقلاب نہیں آ سکتا۔

پولیس والا اپنی چوکی پر واپس پہنچ کر اپنے کمانڈر کو آگاہ کرتا ہے۔ کمانڈر بندوق برداروں بلا کر انھیں چوک کے اردگرد واقع مکانوں کی چھتوں پر متعین کر دیتا ہے۔ وہ خود گاڑی

میں سوار ہو کر مرکزِ شہر تک پہنچتا ہے اور لاؤڈ سپیکر پر ہجوم سے منتشر ہونے کو کہتا ہے۔ لیکن کوئی اس کی بات سننے کو تیار نہیں ہے۔ اس لیے وہ لوٹ کر ایک محفوظ مقام پر آجاتا ہے اور فائر کھولنے کا حکم دیتا ہے۔ خود کار بندوقوں سے گولیاں نکل نکل کر لوگوں کے سروں میں پیوست ہونے لگتی ہیں۔ بھگدڑ مچ جاتی ہے، افراتفری پھیل جاتی ہے، جو لوگ بھاگ سکتے ہیں بھاگ نکلتے ہیں۔ پھر آخرکار فائرنگ رک جاتی ہے۔ مرنے والے چوک میں پڑے رہ جاتے ہیں۔

یہ بات معلوم نہیں ہے کہ آیا شاہ کو فائرنگ ختم ہونے کے بعد پولیس کی کھینچی ہوئی اس چوک کی تصویریں دکھائی گئی تھیں یا نہیں۔ ممکن ہے دکھائی گئی ہوں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ نہ دکھائی گئی ہوں۔ شاہ کو بہت کام کرنا پڑتا تھا، ممکن ہے اسے یہ تصویریں دیکھنے کا وقت نہ ملا ہو۔ اس کا دن صبح سات بجے شروع ہوتا تھا اور نصف شب تک جاری رہتا تھا۔ درحقیقت اسے آرام کرنے کا موقع صرف موسمِ سرما میں میسّر آتا تھا جب وہ سینٹ مورِٹز میں اسکی اِنگ کرنے چلا جاتا تھا۔ وہاں بھی وہ مشکل سے دو یا تین بار اسکی اِنگ کر کے اپنی قیام گاہ کو لوٹ کر کام میں مصروف ہو جاتا تھا۔ تعطیلات کے اُن دنوں کو یاد کرتے ہوئے خانم "ل" کہتی ہے کہ سینٹ مورِٹز میں ملکہ کا طرزِ عمل بے حد جمہوری انداز کا ہوتا تھا۔ اس کی شہادت کے طور پر اس نے ایک تصویر پیش کی جس میں ملکہ کو اسکی لفٹ کے انتظار میں قطار میں کھڑا دکھایا گیا تھا۔ ہاں، بالکل اسی طرح ۔۔ اسکی کی چھڑی کا سہارا لیے ہوئے، انتظار کرتی ہوئی ایک خوش وضع، خوشگوار عورت۔ حالاں کہ، خانم "ل" کہتی ہے، ان دونوں کے پاس اس قدر دولت تھی کہ وہ عورت خود اپنے لیے ایک اِسکی لفٹ قائم کرنے کا آرڈر دے سکتی تھی۔

مرنے والوں کو سفید کفن پہنا کر لکڑی کی چارپائیوں پر لٹا دیا گیا ہے۔ چارپائیاں اٹھائے ہوئے لوگ تیز قدموں سے چل رہے ہیں، بلکہ کبھی کبھی تو بھاگ پڑتے ہیں، جس سے لگتا ہے کہ وہ بے حد عجلت میں ہیں۔ پورا جلوس تیز تیز چل رہا ہے، چیخوں اور ماتمی کراہوں کی آوازیں آرہی ہیں، عزادار بے چین اور مضطرب ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ مرنے والے شخص کی موجودگی ہی ان کے اضطراب کا اصل سبب ہو، کہ وہ اسے جلد سے جلد زمین میں اتار دینا چاہتے ہوں۔ تدفین پوری ہوتے ہی قبر کے پاس دسترخوان بچھا دیا جاتا ہے اور جنازے کا

کھانا شروع ہو جاتا ہے۔ ہر گزرنے والے کو شامل ہونے کی دعوت دی جاتی ہے اور کھانا پیش کیا جاتا ہے۔ جنھیں بھوک نہیں ہے وہ محض ایک پھل، ایک سیب یا نارنگی، پر اکتفا کرتے ہیں لیکن شامل ہونا ہر شخص پر لازم ہے۔

اگلے دن سے عزاداری کی میعاد کا آغاز ہوتا ہے۔ لوگ مرنے والے کی زندگی پر، اس کے اچھے دل اور بلند کردار پر غور کرتے ہیں۔ یہ عزاداری چالیس دن تک جاری رہتی ہے۔ چالیسویں دن رشتے دار، دوست اور ملاقاتی مرنے والے کے گھر پر جمع ہوتے ہیں۔ پڑوسی بھی اکٹھے ہو جاتے ہیں —— پورا محلّہ یا پورا گاؤں، لوگوں کا ایک ہجوم۔ یہ عزاداری کا مجمع ہے، ماتم گساروں کا ہجوم ہے۔ درد اور رنج اپنی انتہا کو پہنچ جاتے ہیں، ماتم کرنے والوں کی کراہیں بلند ہوتی ہیں۔ اگر مرنے والا، سب انسانوں کی تقدیر کے مطابق، طبعی موت مرا ہو تو یہ اجتماع —— جو پورے چوبیس گھنٹے بھی جاری رہ سکتا ہے —— ماتم کی انتہا کو پہنچ کر رفتہ رفتہ ایک پُرملال صبر کے احساس پر لوٹ آتا ہے۔ لیکن اگر موت کا سبب کسی شخص کا ظلم رہا ہو تو لوگوں میں جوابی اقدام کرنے کی طلب، انتقام کی پیاس بھڑک اٹھتی ہے۔ بے پناہ طیش اور انتہا کو پہنچی ہوئی نفرت کے ماحول میں وہ اُس قاتل کا نام پکارتے ہیں جس نے ان پر یہ ظلم کیا ہو۔ کہا جاتا ہے کہ وہ شخص کہیں بھی کیوں نہ ہو، اس وقت خوف سے کپکپا اٹھتا ہے۔ ہاں، اس کے دن گنے جا چکے ہیں۔

آمریت کی روندی ہوئی، ذلیل کی ہوئی اور کسی شے میں تبدیل کر دی گئی قوم پناہ ڈھونڈتی ہے، کسی ایسے مقام کو تلاش کرتی ہے جہاں خود کو چھپا سکے، اپنے گرد دیواریں تعمیر کر سکے، اپنا آپ ہو سکے۔ یہ اس کی انفرادیت، اس کی شخصیت، یہاں تک کہ اس کی عمومیت، برقرار رکھنے کے لیے ناگزیر ہے۔ لیکن کوئی پوری قوم ہجرت کر کے کہیں اور نہیں جا سکتی، اس لیے وہ جغرافیے کے بجائے تاریخ میں پناہ لیتی ہے۔ مصائب اور حقائق کی ضربوں سے نڈھال ہو کر وہ اپنے ماضی میں فرار اختیار کرتی ہے جو اُسے گم شدہ جنت معلوم ہونے لگتا ہے۔ وہ اپنا تحفظ اُن رسموں میں پاتی ہے جو بے حد قدیم، اور اس لیے بے حد مقدس، ہیں اور آمریت کو ان کا سامنا کرتے ہوئے خوف محسوس ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر آمریت کے سائے میں قدیم رسموں، عقیدوں اور علامتوں کا نیا جنم ہوتا ہے —— آمریت کے خلاف، اس

کی مرضی کے خلاف۔ قدیم چیزیں نئے معنی، نئے اور اشتعال انگیز معنی، اختیار کر لیتی ہیں۔ یہ عمل پہلے پہل بڑی جھجھک، اور اکثر بڑی رازداری، کے ساتھ انجام پاتا ہے، لیکن جوں جوں آمریت کا جبر ناقابلِ برداشت ہوتا جاتا ہے، قدیم علامتوں کی طرف واپسی کے رجحان کی قوت اور وسعت بڑھتی جاتی ہے۔ بعض لوگ اسے ازمنۂ وسطیٰ کی جانب رجعت قرار دیتے ہیں۔ ممکن ہے ایسا ہی ہو۔ مگر اکثر اوقات لوگ ان علامتوں کے ذریعے اپنی مخالفت کا اظہار کرتے ہیں۔ چوں کہ حکمراں ترقی اور جدیدیت کی نمائندگی کا دعویٰ کرتے ہیں، ہم یہ بات پوری طرح واضح کر دیں گے کہ ہماری اقدار اس سے مختلف ہیں۔ یہ آباواجداد کی فراموش کردہ دنیا کو واپس لانے سے زیادہ سیاسی معاندت کے اظہار کا معاملہ ہے۔ حالات کو تھوڑا سا بہتر ہونے دیجیے، پھر دیکھیے کہ قدیم رسمیں کس طرح اپنے جذباتی رنگ سے محروم ہو کر دوبارہ اپنی اصل صورت، یعنی رسمی ہیئت، پر لوٹ آتی ہیں۔

o o o

اسی طرح کی ایک رسم، جس نے مخالفت کے بڑھتے ہوئے جذبے کے اثر سے منقلب ہو کر ایک سیاسی عمل کی صورت اختیار کر لی، وہ تھی جسے چہلم کہا جاتا ہے۔ یہ رسم جو عام حالات میں رشتے داروں اور پڑوسیوں کی ماتمی مجلس پر مشتمل ہوتی ہے، احتجاجی جلسے میں تبدیل ہو گئی۔ قم کے واقعے کے چالیس دن بعد بہت سے ایرانی شہروں کی مسجدوں میں لوگ اس قتلِ عام کے مارے جانے والوں کی یاد منانے کے لیے جمع ہوئے۔ تبریز میں تناؤ اتنا بڑھ گیا کہ یہ اجتماع جلوس کی شکل میں مسجد سے باہر نکل آیا۔ شہر کی سڑکوں سے گزرنے والا یہ جلوس ''مرگ بر شاہ'' کے نعرے لگانے لگا۔ فوج فوراً پہنچی اور اس نے شہر کو خون میں نہلا دیا۔ سینکڑوں لوگ مارے گئے اور ہزاروں زخمی ہوئے۔ اس کے چالیس دن بعد ایران کے شہر ایک بار پھر ماتم گسار ہو گئے ــ اس بار تبریز کے قتلِ عام میں مارے جانے والوں کے لیے۔ ایک اَور شہر، اصفہان، میں ایک مشتعل، غضب ناک جلوس سڑکوں پر نکل آیا۔ فوج نے جلوس کو گھیر کر فائرنگ شروع کر دی؛ اَور لوگ مارے گئے۔ چالیس دن پھر گزرے اور پھر درجنوں شہروں میں اصفہان کے قتلِ عام میں مارے جانے والوں کا ماتم ہوا۔ اس طرح قتلِ عام اور ماتمی جلوسوں کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ اگلی بار مشہد میں، پھر تہران میں، پھر ایک بار اَور تہران میں۔ رفتہ رفتہ تقریباً ہر شہر اور ہر قصبے کو چہلم کے ماتمی جلوسوں نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

یوں ایرانی انقلاب چالیس چالیس دن کے وقفے سے ہونے والے دھماکوں کی صورت میں آگے بڑھتا گیا۔ ہر چالیس دن بعد غم، غصّے اور خون کا ایک دھماکا ہوتا۔ ہر بار یہ دھماکا پہلے سے زیادہ ہولناک ہوتا ــ جلوس میں شامل لوگوں اور فائرنگ سے ہلاک ہونے والوں کی تعداد بڑھتی گئی۔ دہشت کی مشین اُلٹی سمت چلنے لگی۔ دہشت کا مقصد دہشت پھیلانا ہوتا ہے۔ لیکن اب حاکمیت کی عائد کی ہوئی دہشت لوگوں کو نئی قوت، نیا حوصلہ دینے لگی۔

شاہ کا ردِ عمل وہی ہے جو مطلق العنان حکمرانوں کا ایسے موقعوں پر عموماً ہوتا ہے: پہلے سختی سے مزاحمت کو کچل دو، اور پھر اس پر غور کرو کہ اب کیا کیا جائے۔ پہلے بازو کی قوت کا مظاہرہ کرو، اور پھر یہ دکھاؤ کہ تمھارے پاس دماغ بھی ہے۔ آمرانہ حاکمیت اس بات کو بہت اہمیت دیتی ہے کہ اسے طاقت ور خیال کیا جائے، اپنی دانشمندی کا اعتراف کرانا اسے اتنا اہم معلوم نہیں ہوتا۔ اور پھر ان کے لیے دانش کا مفہوم بھی کیا ہے؟ یہی کہ طاقت کو کس طرح مہارت سے استعمال کیا جائے۔ دانش مند آمر جانتا ہے کہ کب اور کیسی ضرب لگانی ہے۔ طاقت کا یہ مسلسل مظاہرہ لازمی ہے کیوں کہ اپنی جڑبنیاد میں ہر آمریت رعایا کے اسفل ترین جذبات سے خطاب کرتی ہے: خوف، اپنے ہم سایوں کے خلاف جارحیت، خوشامد۔ دہشت کا کام اِنھیں جبلّتوں کو تحریک دینا ہے، اور طاقت کا خوف ہی دہشت کا سرچشمہ ہے۔

آمر انسان کو ایک رذیل مخلوق خیال کرتا ہے۔ کیوں کہ رذیل لوگ ہی اس کے دربار میں بھرے ہوئے ہوتے ہیں اور اس کے ارد گرد کے ماحول کو آباد کرتے ہیں۔ دہشت زدہ معاشرہ بہت عرصے تک فکر سے عاری اور انفعالیت سے پُر انداز میں برتاو کرتا رہتا ہے۔ اس سے اطاعت کرانے کے عوض اسے صرف کھانا دینا کافی ہوتا ہے۔ محض تھوڑی سی تفریح مل جائے تو وہ خوش رہتا ہے۔ سیاسی بازی گری کے ترکش کے تیر صدیوں سے وہی پُرانے چلے آرہے ہیں۔ اسی لیے ہمیں سیاست کے میدان میں نوآموز لوگ اتنی تعداد میں دکھائی دیتے ہیں جنھیں یقین ہوتا ہے کہ اگر اقتدار ان کے ہاتھ آجائے تو وہ آسانی سے حکمرانی کر لیں گے۔ مگر اس کے باوجود بڑے حیران کن واقعات بھی پیش آجاتے ہیں۔ دیکھیے، آپ کے سامنے ایک ہجوم ہے جسے کھانا اور تفریح میسّر ہے لیکن اس نے اطاعت جاری رکھنے سے

انکار کر دیا ہے۔ اب وہ جس شے کا مطالبہ کر رہا ہے وہ تفریح سے بڑھ کر ہے۔ اسے آزادی چاہیے، انصاف چاہیے۔ آمر حیران رہ جاتا ہے۔ وہ انسان کو اس کے پورے وجود، اس کی پوری رعنائی میں دیکھنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتا۔ ایسا ہی انسان آخرکار اس کی حاکمیت کو خطرے میں ڈال دیتا ہے، یہی اس کا دشمن ہے۔ اور اسی کو ختم کرنے کے لیے آمر اپنی پوری طاقت جمع کرتا ہے۔

آمریت لوگوں کے ساتھ حقارت سے بھی پیش آتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ خود کو اُن سے تسلیم کرانے کے لیے بھی پورا زور لگاتی ہے۔ قانونی طور ناجائز ہونے کے باوجود -- یا شاید اسی کے باعث -- وہ قانونی طور پر جائز ہونے کا ڈھونگ رچاتی ہے۔ اس معاملے میں وہ مریضانہ حد تک حسّاس ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اسے اپنے کمتر ہونے کا بھی مسلسل احساس رہتا ہے (خواہ یہ احساس کتنی ہی گہرائی میں چھپا ہوا کیوں نہ ہو)۔ اس لیے وہ خود کو اور دوسروں کو یہ دکھانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی کہ اسے عوامی مقبولیت حاصل ہے۔ خواہ یہ مقبولیت محض تصنّع ہی کیوں نہ ہو، بڑی تسکین بخش ہوتی ہے۔ اگر یہ صرف ڈھونگ ہے تب بھی کیا حرج ہے؟ آمریّت کی دنیا میں اکثر چیزیں ڈھونگ ہی تو ہوتی ہیں۔

شاہ کو بھی خود کو تسلیم کرانے کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ اس لیے جب تبریز کے قتلِ عام میں مارے جانے والوں کو دفنایا جا چکا، تو اُسی شہر میں شاہی کے حق میں ایک مظاہرہ کرانے کا بندوبست کیا گیا۔ شاہ کی پارٹی رستاخیز کے کارکنوں کو شہر کے عوامی مقامات پر جمع کیا گیا۔ انھوں نے اپنے رہنما کی بڑی بڑی تصویریں اٹھا رکھی تھیں جن میں اس کے شاہانہ سر کے اوپر سورج کے نقش بنائے گئے تھے۔ تماشائیوں کے اسٹینڈ پر پوری حکومت کھڑی ہوئی تھی۔ وزیرِاعظم جمشید آموزگار نے جلسے سے خطاب کیا۔ مجلس (اسمبلی) کے اسپیکر نے حیرت کا اظہار کیا کہ چند شر پسند اور انتشار پسند لوگ قوم کے اتحاد اور اس کے سکون کو کیوں کر تباہ کر سکتے ہیں۔ "یہ لوگ تعداد میں اتنے کم ہیں کہ انھیں ایک گروہ بھی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہ محض مٹھی بھر لوگ ہیں۔" خوش قسمتی کی بات یہ ہے، اس نے کہا، کہ ملک بھر سے ان لوگوں کی مذمّت میں آوازیں بلند ہو رہی ہیں جو ہمارے گھروں اور ہماری

خوش حالی کو خاک میں ملانا چاہتے ہیں۔ اس کے بعد شاہ کی حمایت میں ایک قرارداد منظور کی گئی۔ مظاہرہ ختم ہوتے ہی اس میں شریک لوگ چپکے سے گھروں کو روانہ ہو گئے۔ زیادہ تر لوگوں کو بسوں میں سوار کرا کے قریب کے اُن قصبوں میں پہنچایا گیا جہاں سے انھیں اس موقعے کے لیے در آمد کیا گیا تھا۔

اس مظاہرے کے بعد شاہ کی کیفیت کچھ بہتر ہوئی۔ اسے اپنے قدم زمین پر جمتے محسوس ہوے۔ اب تک وہ جن پتّوں سے کھیل رہا تھا وہ خون آلود تھے۔ اب اس نے صاف پتّوں سے کھیلنے کا ارادہ کیا۔ عوامی ہمدردی حاصل کرنے کی غرض سے اُن یونٹوں کے کچھ افسروں کو برطرف کر دیا جنھوں نے تبریز کے باشندوں پر گولی چلائی تھی۔ اس اقدام پر جنرلوں میں بےاطمینانی کی بھنبھناہٹ پیدا ہوئی۔ جنرلوں کو اطمینان دلانے کی غرض سے شاہ نے اصفہان کے شہریوں پر فائرنگ کرنے کا حکم دیا۔ اس پر لوگوں کی جانب سے طیش اور نفرت کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ لوگوں کو راضی کرنے کے لیے اُس نے ساواک کے سربراہ کو برطرف کر دیا۔ اس پر ساواک ناراض ہوئی۔ ساواک کو منانے کے لیے شاہ نے اسے اجازت دے دی کہ جس کسی کو چاہے گرفتار کر سکتی ہے۔ اس طرح متواتر متضاد اقدامات کے ذریعے وہ قدم بہ قدم اپنے انجام سے قریب ہوتا گیا۔

شاہ کو عزم سے محروم ہونے کا طعنہ دیا جاتا ہے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ سیاست دانوں کو پُرعزم ہونا چاہیے۔ لیکن کس بات کے لیے پُرعزم؟ شاہ اپنے تخت کو بچانے کے لیے پُرعزم تھا اور اس مقصد کے لیے اس نے ہر امکانی راستا اختیار کیا۔ اس نے گولیاں بھی چلوائیں اور جمہوری اصلاحات بھی کیں، اس نے لوگوں کو قید میں بھی ڈالا اور انھیں رہا بھی کیا، اس نے کچھ اہلکاروں کو برطرف کیا اور کچھ کو ترقیاں دیں، اس نے دھمکایا اور پھر منتیں کیں۔ سب کچھ بےسود ثابت ہوا۔ لوگ اب کسی شاہ کو برداشت کرنا ہی نہیں چاہتے تھے؛ وہ اس قسم کی حاکمیت کو قبول کرنے کو تیار ہی نہیں تھے۔

o o o

شاہ اپنے تکبّر کا شکار ہوا۔ وہ خود کو قوم کا باپ سمجھتا تھا لیکن قوم اس کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کا اسے شدید احساس اور سخت ملال ہوا۔ وہ کسی بھی قیمت پر (بد قسمتی سے

خون کی قیمت پر بھی) وہ اُس پہلے والے تصوّر کو بحال کرنا چاہتا تھا جس کی برسوں سے پرورش کی جاتی رہی تھی اور جس کی رو سے مسرور عوام اپنے مہربان بادشاہ کے سامنے شکر گزاری میں جھکے ہوئے تھے۔ لیکن اس نے یہ بات فراموش کر دی کہ ہم ایک ایسے دور میں رہ رہے ہیں جب لوگ مہربانی نہیں، اپنا حق طلب کرتے ہیں۔

اُس کے خاتمے کی ایک وجہ غالباً یہ بھی تھی کہ وہ اپنے بارے میں بہت سنجیدہ تھا، اپنے تصوّر کو لفظی معنوں میں قبول کرتا تھا۔ اسے واقعی یقین تھا کہ لوگ اس کی پرستش کرتے ہیں اور اسے اپنے وجود کا بہترین اور وقیع ترین حصّہ خیال کرتے ہیں، اعلیٰ ترین بھلائی سمجھتے ہیں۔ ان کا یوں باغی ہو جانا اس کے تصوّر سے باہر کی بات تھی، یہ صدمہ اس کے اعصاب کی مضبوطی کی نسبت بہت بڑا تھا۔ اس نے سوچا کہ اسے اس بات پر فوری رد عمل کرنا چاہیے۔ یہی اس کے متشدّد، اضطراری اور دیوانگی کے فیصلوں کا سبب ہوا۔ وہ کلبیت کی ایک مخصوص مقدار سے محروم تھا۔ وہ یہ بھی کہہ سکتا تھا: ''اچھا، تو یہ لوگ مظاہرے کر رہے ہیں؟ ٹھیک ہے، انھیں مظاہرے کرنے دو۔ چھ مہینے؟ ایک سال؟ میں ان مظاہروں کے ختم ہونے کا انتظار کر سکتا ہوں۔ بہرحال، میں اس محل سے تو رخصت ہونے سے رہا۔'' اور لوگ آخر کار مایوس اور دل شکستہ ہو کر، چاروناچار گھر لوٹ گئے ہوتے، کیوں کہ ظاہر ہے وہ اپنی پوری زندگی تو سڑکوں پر مظاہرے کرنے میں نہیں گزار سکتے۔ لیکن شاہ انتظار کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔ اور سیاست داں کے لیے انتظار کرنے کا ہنر سیکھنا لازمی ہے۔

وہ اس لیے بھی ختم ہو گیا کہ اپنے ملک سے ناواقف تھا۔ اس کی تمام زندگی محل میں گزری تھی۔ اس کا کبھی کبھار محل سے باہر نکلنا ایسا ہی تھا جیسے کوئی شخص گرم کمرے سے، جما دینے والی سردی میں لمحے بھر کو سر باہر نکال کر دیکھے اور پھر اندر کر لے۔ مگر تمام محلوں کی زندگی تباہ کن اور مسخ شدہ قوانین کے ایک ہی نظام کی پابند ہوتی ہے۔ ہمیشہ ایسا ہی ہوا ہے، ایسا ہی ہوتا ہے اور ایسا ہی ہوتا رہے گا۔ آپ چاہیں تو دس نئے محل بنا لیں؛ جوں ہی وہ بن کر تیار ہوں گے اُنھیں قوانین کی پابندی شروع کر دیں گے جن کی پابندی پانچ ہزار سال پہلے بنے ہوئے محل کیا کرتے تھے۔ اس کا واحد حل یہ ہے کہ محل کو ایک عارضی قیام گاہ خیال کیا جائے، بلکہ بس یا کوئی اَور سواری سمجھا جائے۔ آپ اس میں سوار ہوتے ہیں، کچھ فاصلہ

طے کرتے ہیں اور اتر جاتے ہیں۔ اور یہ خیال رکھنا بہت ضروری ہے کہ درست بس اسٹاپ کہیں نکل نہ جائے، آپ کہیں آگے نہ پہنچ جائیں۔

محل میں رہتے ہوئے سب سے دشوار کام کسی اَور طرح کی زندگی کا تصوّر کرنا ہے —مثلاً آپ کی اپنی زندگی، مگر محل سے باہر، اور محل کے بغیر۔ آخر آخر میں بادشاہ کو ایسے لوگ بھی دستیاب ہو جاتے ہیں جو اس کام میں اس کی مدد کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ ایسے موقعوں پر بہت سے لوگوں کی جان ضائع ہو سکتی ہے۔ سیاست میں وقار کا مسئلہ۔ مثال کے طور ڈیگال کو لیجیے، جو ایک باوقار آدمی تھا۔ اسے ایک ریفرنڈم میں شکست ہوئی، اس نے اپنی میز صاف کی، اور ہمیشہ کے لیے محل سے باہر نکل گیا۔ وہ صرف اس شرط پر حکمرانی کرنے کو تیار تھا کہ لوگوں کی اکثریت اسے قبول کرے۔ جس لمحے اکثریت نے اسے اپنے اعتبار سے محروم کیا، اُسی لمحے اس نے اقتدار چھوڑ دیا۔ مگر ایسے لوگوں کی تعداد کتنی ہے؟ دوسرے لوگ چیختے چلاتے رہیں گے لیکن اپنی جگہ سے جنبش نہیں کریں گے؛ قوم کو اذیت میں مبتلا رکھیں گے مگر ٹس سے مس نہیں ہوں گے۔ ایک دروازے سے باہر پھینک دیے جانے پر وہ دوسرے دروازے سے واپس گھس آئیں گے؛ سیڑھیوں سے لات کھا کر نیچے لڑھک جانے کے بعد وہ دوبارہ گھسٹتے ہوئے اوپر چڑھنے لگیں گے۔ وہ معافیاں مانگیں گے، جھکیں گے، گڑگڑائیں گے، جھوٹ بولیں گے، کھسیانی ہنسی ہنسیں گے تاکہ انھیں محل میں رہنے دیا جائے، یا واپس آنے دیا جائے۔ وہ اپنے ہاتھ پھیلا کر دکھائیں گے: دیکھو، ان پر خون کا کوئی دھبا نہیں ہے۔ لیکن یہی بات کہ انھیں اپنے ہاتھ معائنے کے لیے پھیلانے پڑ رہے ہیں، انھیں شرم سے پانی پانی کر دینے کو کافی ہے۔ وہ اپنی جیبیں اُلٹائیں گے: دیکھو، ان میں کچھ زیادہ دولت نہیں ہے۔ مگر ان کا اپنی جیبیں الٹا کر دکھانے پر مجبور ہونا ہی کس قدر ذلت کی بات ہے۔ شاہ جس وقت محل سے رخصت ہوا تو رو رہا تھا۔ ایرپورٹ پر پہنچ کر وہ پھر رونے لگا۔ بعد میں ایک انٹرویو میں اس نے بتایا کہ اس کے پاس کتنی دولت ہے، اور یہ کہ یہ دولت اس سے بہت کم ہے جتنی لوگ سمجھتے ہیں۔

o o o

میں تمام دن تہران میں بے مقصد گھومنے پھرنے میں گزارتا تھا۔ میں اپنے کمرے کے خالی پن سے بھاگ رہا تھا، اور اُس زور آور اور بدزبان عورت سے جو میرے کمرے کی صفائی کرنے آتی تھی۔ وہ ہمیشہ مجھ سے پیسے مانگا کرتی تھی۔ وہ میری دُھلی ہوئی، استری کی ہوئی قمیصیں لے جا کر پانی میں ڈال دیتی، انہیں نچوڑ کر پھیلا دیتی اور مجھ سے پیسے مانگتی۔ کس بات کے پیسے؟ میری قمیصیں غارت کرنے کے؟ اس کا سوکھا ہوا جبڑا اس کی چادر میں سے مسلسل جھانکتا رہتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اس کے پاس پیسے نہیں ہیں۔ لیکن پیسے میرے پاس بھی نہیں تھے۔ یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ باہر سے آنے والا شخص لازماً مالدار ہوتا ہے۔ ہوٹل کی مالکہ اپنے کندھے اُچکا دیا کرتی۔ ''میں کچھ نہیں کر سکتی، آقا! انقلاب کے بعد اقتدار اس عورت کے پاس آ گیا ہے۔'' ہوٹل کی مالکہ مجھے اپنا فطری حلیف اور انقلاب مخالف خیال کرتی تھی۔ اس نے فرض کر رکھا تھا کہ میں لبرل خیال کا ہوں؛ اور لبرل لوگ، اعتدال پسندوں کی طرح، سخت ترین حملوں کی زد میں تھے۔ انتخاب صرف خدا اور شیطان کے درمیان تھا۔ سرکاری پروپیگنڈا ہر شخص سے واضح اعلان کا مطالبہ کرتا تھا؛ صفائی کا عمل، یا اُن لوگوں کے لفظوں میں ''ایک دوسرے کے ہاتھوں کا معائنہ کرنے کا عمل'' شروع ہو چکا تھا۔

دسمبر کا پورا مہینا میں نے تہران شہر میں آوارہ گردی کرتے ہوئے گزارا۔ نئے سال، ۱۹۷۹، کی آمد قریب تھی۔ ایک دوست نے فون کر کے خبر سنائی کہ وہ اس موقعے پر ایک پارٹی، خفیہ طور پر برپا کی ہوئی ایک سچ مچ کی مزے دار شام، کا اہتمام کر رہا ہے، اور اس نے مجھے اس پارٹی میں شامل ہونے کی دعوت دی۔ میں نے انکار کر دیا، کہہ دیا کہ میں کہیں اَور مصروف ہوں گا۔ کہیں اَور؟ کیا مصروفیت ہے؟ وہ حیران تھا، کیوں کہ واقعی آپ نئے سال کی رات کو تہران میں کس طرح صَرف کر سکتے تھے؟ میری مصروفیات عجیب وغریب ہوں گی، میں نے جواب دیا، اور یہ سچائی سے قریب ترین جواب تھا جو میں اسے دے سکتا تھا۔ میں نے نئے سال کی رات کو امریکی سفارت خانے جانے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ عمارت جس کا دنیا بھر میں چرچا ہو رہا ہے، اُس رات کو کیسی لگتی ہے۔ میں اپنے ہوٹل سے رات گیارہ بجے روانہ ہوا۔ مجھے زیادہ دور نہیں جانا تھا، ہوٹل سے اُس جگہ کا فاصلہ شاید صرف ڈیڑھ میل تھا، اور ڈھلواں راستے کی وجہ سے پیدل چل کر جانا مشکل نہیں تھا۔ سردی ہڈیوں میں اتری جا رہی تھی اور ہوا خشک اور برفانی تھی۔ غالباً پہاڑوں میں برف کا طوفان آ رہا

ہو گا۔ میں سڑکوں پر چلتا گیا جو راہگیروں سے بالکل خالی تھیں، سوا ایک مونگ پھلی والے کے جو میدانِ ولی عصر میں اپنا خوانچہ لگائے بیٹھا تھا۔ سردی کا مقابلہ کرنے کے لیے اس نے اپنا سر اور جسم گرم کپڑوں اور مفلروں میں بالکل اُسی طرح لپیٹ رکھا تھا جیسے وارسا کی پولنا اسٹریٹ میں خزاں کے موسم میں سودا بیچنے والے لپیٹ کر نکلتے ہیں۔ میں نے مونگ پھلی کا ایک پیکٹ خریدا اور مٹھی بھر ریال اُسے تھما دیے جو مونگ پھلی کی قیمت سے بہت زیادہ تھے: یہ میری طرف سے کرسمس کا تحفہ تھا۔ وہ یہ بات نہیں سمجھا۔ اس نے پیسے گنے اور مونگ پھلی کی قیمت رکھ کر باقی پیسے مجھے لوٹا دیے۔ اس کے چہرے پر سنجیدہ، پُروقار تاثر تھا۔ سو میرا یہ عمل رد ہو گیا جس سے میں نے اس سرد، منجمد شہر میں اپنے واحد ساتھی سے لمحاتی قربت پیدا کرنے کی امید کی تھی۔ میں دکانوں کی شکستہ ہوتی ہوئی کھڑکیوں پر نظر ڈالتا آگے چلنے لگا، تختِ جمشید پر پہنچ کر مڑا، ایک جلے ہوئے بینک، ایک جھلسے ہوئے سنیما، ایک خالی ہوٹل اور ایرلائن کے ایک تاریک دفتر کے پاس سے گزرا۔ آخر میں سفارت خانے کی عمارت کے سامنے پہنچ گیا۔ دن کے وقت یہ جگہ ایک بڑی سی مارکیٹ معلوم ہوتی ہے، ایک بڑا سا کیمپ، ایک پُرشور سیاسی تفریح گاہ جہاں آپ چیخ چلا کر اپنے دل کی بھڑاس نکال سکتے ہیں۔ آپ یہاں آ سکتے ہیں، دنیا کی بڑی طاقتوں کو گالیاں دے سکتے ہیں، اور اس کے نتیجے میں آپ کو کچھ نہیں ہوتا۔ اس کام کے لیے رضاکاروں کی کبھی کمی نہیں ہوتی؛ یہاں ہمیشہ بھیڑ لگی رہتی ہے۔ لیکن اِس وقت، نصف شب کے قریب، یہاں کوئی نہیں تھا۔ میں نے اس عمارت کے گرد ایک چکّر لگایا جو یوں معلوم ہوتی تھی جیسے کوئی اسٹیج جس سے آخری کردار بھی رخصت ہو چکا ہو۔ صرف منظر میں استعمال کی جانے والی چیزیں اور اسٹیج پر بھوتوں کے شہر کا سا ہیبت ناک ماحول باقی رہ گیا تھا۔ ہوا عمارت سے لٹکے ہوئے بینروں کی دھجیوں کو اڑا رہی تھی اور ایک بڑی سی تصویر میں لہریں پیدا کر رہی تھی جس میں شیطانوں کے ایک ٹولے کو دوزخ کی آگ سے ہاتھ تاپتے دکھایا گیا تھا۔ اس سے آگے کارٹر، سر پر ستاروں والا ہیٹ پہنے، سونے کے سکّوں سے بھرا ہوا تھیلا ہلا رہا تھا، اور ایک دینی بزرگ شہادت کی تیاریوں میں مشغول تھا۔ پلیٹ فارم پر ایک لاؤڈ سپیکر اور بہت سارے مائیکروفون ابھی تک لگے ہوئے تھے جن سے پُرجوش مقرّر ہجوم میں ولولہ اور طیش ابھارا کرتے تھے۔ ان خاموش لاؤڈ سپیکروں کو دیکھ کر منظر کے بےروح اور خالی ہونے کا تاثر اَور بھی گہرا ہو جاتا تھا۔ میں عمارت کے صدر دروازے کے پاس پہنچا۔ وہاں حسبِ معمول زنجیر میں بندھا ہوا تالا لگا تھا،

کیوں کہ ہجوم کے حملے سے ٹوٹے ہوئے تالے کی کسی نے مرمت نہیں کی تھی۔ پھاٹک کے پاس، اینٹوں کی اونچی دیوار سے ٹیک لگائے، دو نوجوان پاسدار سردی میں ٹھٹھر رہے تھے؛ ان کی آٹومیٹک رائفلیں ان کے کندھوں پر پڑی تھیں -- وہ امام کے شاگرد تھے۔ مجھے گمان ہوا کہ وہ اونگھ رہے ہیں۔ پس منظر میں، درختوں سے گھری ہوئی وہ روشن عمارت ایستادہ تھی جہاں یرغمالیوں کو رکھا گیا تھا۔ لیکن کھڑکیوں کو بہت غور سے دیکھنے پر بھی مجھے کوئی آدمی یا ہیولا دکھائی نہیں دیا۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ ٹھیک بارہ بجے کا وقت تھا، کم سے کم تہران میں، اور نیا سال شروع ہو رہا تھا۔ دنیا میں کسی جگہ کلاکوں کے گھنٹے بج رہے تھے؛ شمپین کے فوارے اُبل رہے تھے؛ روشن، جگمگاتے ہوئے ہالوں میں شاندار اور پرمسرّت ضیافتیں ہو رہی تھیں۔ لیکن یہاں سے، جہاں کسی آواز کی ہلکی سی رمق، کسی روشنی کی خفیف ترین جھلملاہٹ تک نہیں تھی، یہ سب کسی دوسرے سیارے پر ہونے والی باتیں معلوم ہوتی تھیں۔ وہاں کھڑے ہوئے، سردی سے کپکپاتے ہوئے، مجھے اچانک خیال آیا کہ میں اُس دوسرے سیارے کو چھوڑ کر یہاں، اس انتہائی ویران اور بے حد افسردہ کرنے والی جگہ کیوں چلا آیا۔ مجھے معلوم نہیں۔ بس یوں ہی میں نے سوچا کہ مجھے یہاں ہونا چاہیے۔ یہ بچپن امریکی اور دو ایرانی، میں ان میں سے کسی کو نہیں جانتا، اور ان سے بات بھی نہیں کر سکتا۔ شاید میں نے سوچا تھا کہ یہاں کچھ ہو گا۔ لیکن کچھ نہیں ہوا۔

شاہ کی روانگی اور شاہی کے خاتمے کی سالگرہ قریب آ رہی تھی۔ اس موقعے کی مناسبت سے ٹیلی وژن پر انقلاب کے بارے میں درجنوں فلمیں دکھائی گئیں۔ وہ کئی اعتبار سے ایک جیسی تھیں۔ وہی تصویریں، وہی واقعات بار بار دکھائے جاتے تھے۔ پہلا ایکٹ ہمیشہ بہت بڑے جلوس کے مناظر پر مشتمل ہوتا تھا۔ ایسے کسی جلوس کا حدود اربعہ بیان کرنا مشکل ہے۔ یہ ایک وسیع اور ٹھاٹھیں مارتا ہوا انسانی دریا ہے جو صبح سے شام تک شہر کی بڑی سڑک سے گزرتا رہتا ہے۔ یہ ایک دہشت ناک سیلاب ہے جو ایک لمحے میں ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے کر غرق کر دے گا۔ یہ ہوا میں بلند، غضب میں لہراتی ہوئی مٹھیوں کا ایک ہولناک جنگل ہے۔ گونجتی ہوئی آوازوں کا ایک ہجوم ہے جو نعرے لگا رہی ہیں: مرگ بر شاہ! چہروں کے کلوز اَپ بہت کم دکھائے جاتے ہیں۔ کیمرا مین اس ابلتے ہوئے لاوے کے نظارے سے مسحور ہیں؛ جو کچھ وہ دیکھ رہے ہیں اس کے طول و عرض نے انھیں ہلا کر رکھ دیا ہے، جیسے وہ

ایورسٹ کی چوٹی کو بالکل اس کے نیچے کھڑے ہو کر دیکھ رہے ہوں۔ انقلاب کے آخری چند مہینوں میں لاکھوں لوگوں کے ایسے جلوس ہر شہر کی سڑکوں پر نکل آئے تھے۔ ان کے پاس ہتھیار نہیں تھے؛ ان کی قوت ان کی تعداد اور ثابت قدمی میں تھی۔

دوسرا ایکٹ نہایت ڈرامائی ہوتا ہے۔ کیمرا مین عمارتوں کی چھتوں پر کھڑے ہو کر اوپر سے اس منظر کو فلما رہے ہیں۔ پہلے وہ ہمیں سڑک کا منظر دکھاتے ہیں جہاں دو ٹینک اور دو بکتر بند گاڑیاں کھڑی ہیں۔ ہیلمٹ اور بُلٹ پروف جیکٹیں پہنے ہوئے سپاہی سڑک اور فٹ پاتھ پر گولی چلانے کی پوزیشن لے چکے ہیں۔ وہ منتظر ہیں۔ پھر کیمرا آتے ہوئے جلوس کا منظر دکھاتا ہے۔ پہلے وہ سڑک پر دور سے آتا ہوا دکھایا جاتا ہے، مگر بہت جلد ہم اسے قریب سے دیکھتے ہیں۔ یہ جلوس کا سامنے کا حصّہ ہے؛ مرد، اور عورتیں اور بچے بھی، آگے آگے مارچ کرتے آ رہے ہیں۔ انھوں نے سفید لباس پہن رکھا ہے، جو اس بات کی علامت ہے کہ وہ مرنے کے لیے تیار ہیں۔ کیمرا مین ہمیں ان کے چہرے دکھاتا ہے، ابھی تک زندہ۔ ان کی آنکھیں۔ بچے، تھکے ہوئے مگر پُرسکون، دیکھنا چاہتے ہیں کہ اب کیا ہوتا ہے۔ جلوس سیدھا ٹینکوں کی طرف بڑھا چلا آ رہا ہے، رکے یا اپنی رفتار کم کیے بغیر -- یہ کیا ہے؟ ہِپناٹزم؟ نظربندی؟ ماہ زدگی؟ -- مارچ کرتا آ رہا ہے جیسے اسے اپنے سامنے کچھ نظر نہ آ رہا ہو، جیسے وہ ویران، غیر آباد علاقے میں داخل ہو رہا ہو، یہ ہجوم ٹھیک اس لمحے گویا جنّت میں داخل ہو رہا ہے۔ اب تصویر ذرا سا ہلتی ہے، کیوں کہ کیمرا مین کے ہاتھ کپکپا رہے ہیں۔ ایک زوردار آواز، پھر فائرنگ، گولیاں چلنے کی مسلسل آواز، ٹیلی وژن سے نکلتی ہوئی چیخیں۔ بندوقوں کے میگزین بدلتے ہوئے سپاہیوں کے کلوزاَپ۔ ایک ٹینک کا کلوزاَپ جس کی نال بائیں سے دائیں کو گھوم رہی ہے۔ پھر ایک فوجی افسر کا کلوزاَپ -- کومک رِلیف -- جس کے ہیلمٹ نے گر کر اس کی آنکھوں کو ڈھانپ لیا ہے۔ فٹ پاتھ کا کلوزاَپ، اور پھر تصویر تیزی سے سڑک کے اُس پار کے مکان کی دیوار پر چڑھتی چلی جاتی ہے اور چھت اور چمنی سے اوپر خالی آسمان کو دکھانے لگتی ہے جس میں صرف ایک بادل کا کنارہ دکھائی دے رہا ہے۔ پھر ایک خالی فریم اور اندھیرا۔ اسکرین پر دکھائی جانے والی تحریر بتاتی ہے کہ یہ اُس کیمرا مین کا فلمایا ہوا آخری ٹکڑا تھا، لیکن دوسرے لوگوں نے، جو زندہ رہ گئے، اس شہادت کو محفوظ کر لیا۔

آخری ایکٹ موت کے بعد کا منظر ہے۔ مرے ہوئے لوگ اِدھر اُدھر پڑے ہیں، ایک زخمی خود کو گھسیٹتا ہوا ایک پھاٹک کی طرف لے جا رہا ہے، ایمبولینس گاڑیاں تیزی سے گزرتی ہیں، لوگ بھاگ رہے ہیں، دونوں ہاتھ پھیلا کر روتی ہوئی ایک عورت، ایک تگڑا آدمی کسی کی لاش کو زمین سے اٹھاتے ہوئے پسینے پسینے ہو رہا ہے۔ ہجوم پسپا ہو چکا ہے، بکھر گیا ہے، آس پاس کی گلیوں میں منتشر ہو گیا ہے۔ ایک ہیلی کوپٹر نیچی پرواز کرتا ہوا چھتوں کے کچھ اوپر سے گزرتا ہے۔ کچھ بلاک دور ٹریفک دوبارہ شروع ہو گیا ہے، شہر کی زندگی معمول پر آ گئی ہے۔

ایک ایسا ہی منظر مجھے بھی یاد ہے: مظاہرین مارچ کر رہے ہیں۔ اسپتال کے پاس سے گزرتے ہوئے وہ خاموش ہو جاتے ہیں؛ وہ بیماروں کے سکون میں خلل نہیں ڈالنا چاہتے۔ یا ایک اَور منظر: جلوس کے پیچھے چلتے ہوئے چھوٹے چھوٹے لڑکے کوڑا کرکٹ اٹھا اٹھا کر کوڑے دانوں میں ڈالتے جا رہے ہیں۔ جس راستے سے جلوس گزرا ہے اُسے بالکل صاف ہونا چاہیے۔ کسی فلم کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا: اسکول سے لوٹتے ہوئے بچے فائرنگ کی آواز سن کر اُس جگہ کی طرف دوڑتے ہیں جہاں سپاہی لوگوں پر گولیاں چلا رہے ہیں۔ وہ اپنی کاپیوں سے ورق پھاڑ کر سڑک کے کنارے پڑے ہوئے خون میں تر کر لیتے ہیں اور انھیں ہاتھوں میں بلند کیے ہوئے، گلیوں میں دوڑتے ہیں تاکہ راہ گیروں کو پتا چل جائے ۔۔ خبردار! اُدھر گولیاں چل رہی ہیں! اصفہان والی فلم کئی بار دکھائی گئی۔ ایک جلوس، انسانی سروں کا ایک سمندر، کسی بڑے چوک سے گزر رہا ہے۔ اچانک فوج چاروں طرف سے فائرنگ شروع کر دیتی ہے۔ ہجوم گھبرا کر جان بچانے کے لیے دوڑتا ہے، چیخنے چلانے کی آوازیں، بھگدڑ، بے تحاشا اِدھر اُدھر بھاگتے ہوئے لوگ، اور پھر خالی چوک۔ زندہ بچ جانے والے آخری شخص کے ہٹتے ہی وسیع چوک کا خالی پن دکھائی دیتا ہے، جس کے ٹھیک وسط میں ہم ایک اپاہج آدمی کو وِیل چیئر پر بیٹھا دیکھتے ہیں۔ وہ بھی جان بچانے کے لیے بھاگنا چاہتا ہے مگر وِیل چیئر کا ایک پہیا پھنس گیا ہے (فلم سے یہ پتا نہیں چلتا کہ کیوں)۔ وہ ہر سمت میں چلتی گولیوں سے بچنے کے لیے بے اختیار ہاتھوں کی پناہ کر رہا ہے۔ پھر گھبرا کر وِیل چیئر کے پہیوں کو چلانے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ آگے بڑھنے کے بجائے اپنی جگہ دائرے میں گھومنے لگتی ہے۔ یہ ایسا دل ہلا دینے والا منظر ہے کہ ایک لمحے کو سپاہی گولیاں چلانا بھول جاتے ہیں، جیسے کسی خصوصی حکم

کے منتظر ہوں۔ خاموشی۔ اب ہم چوک کو بہت دور سے دیکھتے ہیں جس کے بیچ میں اپاہج آدمی اذیت کی زد میں آئے ہوئے، مرتے ہوئے کسی کیڑے کی طرح نظر آتا ہے: اکیلے آدمی کا مڑا تڑا جسم خود کو بچانے کی جدوجہد کر رہا ہے، اور جال تنگ ہوتے ہوتے آخر بالکل بند ہو جاتا ہے۔ گولی پھر چلتی ہے، اس بار اس واحد ہدف کا نشانہ لے کر۔ اب، ہمیشہ کے لیے ساکت ہو کر، (فلم کا راوی بتاتا ہے)، یہ اپاہج آدمی ایک یا دو گھنٹے تک عوامی یادگار کی طرح وہیں، چوک کے وسط میں، پڑا رہ جاتا ہے۔

تفصیلیں
کیمرا مین لانگ شاٹ بہت زیادہ استعمال کرتے ہیں، جس کی وجہ سے تفصیلیں نظروں سے اوجھل رہتی ہیں۔ اور تفصیلوں کے بغیر سب کچھ نہیں دکھایا جا سکتا۔ قطرے میں دجلہ۔ مجھے جلوس میں چلتے ہوئے لوگوں کے چہرے قریب سے دیکھنے کی حسرت رہتی ہے۔ بات چیت کے ٹکڑے سنائی نہیں دیتے۔ جلوس کے ساتھ مارچ کرتا ہوا آدمی، وہ امیدوں سے کیسا پُر ہے! وہ جلوس میں چل رہا ہے کیوں کہ کچھ توقع رکھتا ہے۔ وہ جلوس میں چل رہا ہے کیوں کہ خود کو کچھ کر پانے کے قابل سمجھتا ہے۔ اسے یقین ہے کہ اُس کے دن پھر جائیں گے۔ جلوس میں مارچ کرتے ہوئے وہ سوچ رہا ہے: اگر ہم جیت گئے تو کوئی مجھ سے کتوں کا سا سلوک نہیں کر سکے گا۔ وہ جوتوں کے بارے میں سوچ رہا ہے۔ وہ سب گھر والوں کے لیے عمدہ جوتے خریدے گا۔ وہ ایک گھر کے بارے میں سوچ رہا ہے۔ اگر ہم جیت گئے تو انسانوں کی طرح رہنا ممکن ہو جائے گا۔ ایک نئی دنیا ہو گی: وہ، ایک عام آدمی، وزیروں سے ذاتی طور پر واقف ہو گا اور سب کام کرا لیا کرے گا۔ لیکن وزیر کیوں؟ ہم سب مل کر ایک کمیٹی بنائیں گے جو سارا انتظام چلائے گی۔ اور بہت سے خیال، اور بہت سے منصوبے؛ وضاحت اور صراحت سے محروم، لیکن سب کے سب خوشگوار، دل کو مسرّت سے بھر دینے والے، کیوں کہ ان میں ایک نادر خصوصیت موجود ہے: ان پر عمل کیا جائے گا! وہ خود کو سر بلند پاتا ہے، اسے اپنے اندر قوّت اُبلتی ہوئی محسوس ہوتی ہے، کیوں کہ جلوس میں چلنے کا مطلب واقعات میں حصّہ لینا ہے، اپنی تقدیر کے فیصلے میں شرکت کرنا ہے، یہ پہلی بار ہوا ہے، وہ پہلی بار کسی فیصلے میں شریک ہو رہا ہے -- وہ موجود ہے!

ooo

ایک بار میں نے ایک جلوس کو خود بخود شروع ہوتے دیکھا۔ ایک آدمی ایرپورٹ

جانے والی سڑک پر اکیلا چلا جا رہا تھا؛ وہ چلتے ہوئے گنگنا رہا تھا۔ گیت کا موضوع خدا تھا: اللہ اکبر! اس کی آواز اچھی تھی، اپنے ساتھ بہا لے جانے والی، اور گیت کی دُھن مترنم اور شان دار تھی۔ وہ اپنے آپ میں مست تھا اور چلتے ہوئے کسی چیز یا کسی شخص کی طرف توجہ نہیں دے رہا تھا۔ میں اس کا گیت سنتے رہنا چاہتا تھا اس لیے اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ چند لمحوں میں گلی میں کھیلتے ہوئے بچّے اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگے اور اس کے گیت میں شامل ہو گئے۔ پھر کچھ مرد، اور شرما کر کونوں سے نکلتی ہوئی کچھ عورتیں۔ ہوتے ہوتے جب تعداد سو کے قریب پہنچ گئی تو جلوس اَور تیزی سے بڑا ہونے لگا۔ ہجوم ہجوم کو اپنی طرف کھینچتا ہے، جیسا کہ ایلیاس کانیتّی کا کہنا ہے۔ یہاں کے لوگ اجتماع کا حصّہ ہونے کو پسند کرتے ہیں، اُنھیں اس سے قوّت اور اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ وہ اجتماع کے ذریعے اپنا اظہار کرتے ہیں، اجتماع کی تلاش میں رہتے ہیں جس میں شامل ہو کر اپنے اندر کی اُس شے سے نجات پا سکیں جو تنہائی میں ان کے ساتھ ساتھ رہتی ہے اور انھیں ناگوار احساس میں مبتلا کرتی ہے۔

اسی سڑک پر (جس کا نام پہلے خیابانِ رضا شاہ تھا اور جسے اب خیابانِ انقلاب کہا جاتا ہے) ایک بوڑھا آرمینی خشک میوے اور مسالے بیچا کرتا تھا۔ اس کی دکان کا اندرونی حصّہ بےترتیب اور بُری طرح بھرا ہوا تھا، اس لیے وہ اپنا مال باہر فٹ پاتھ پر تھیلوں، ٹوکریوں اور مرتبانوں میں سجا کر رکھتا تھا: بادام، کھجوریں، پستے، زیتون، ادرک، اناردانہ، آلوچے، سیاہ اور سرخ مرچیں، باجرا، اور درجنوں دوسری چیزیں جن کے نام اور استعمال میرے لیے اجنبی ہیں۔ دور سے دیکھنے پر، اکھڑتے ہوئے بھورے پلستر کے پس منظر کے ساتھ یہ سب رنگ برنگی نعمتیں کسی آراستہ اور باذوق ترتیب کی روغنی تصویر جیسی لگتی تھیں۔ دکان دار ان چیزوں کی ترتیب ہر روز بدل دیتا تھا: آج کتھئی کھجوریں سبز پستوں اور زیتونوں کے درمیان رکھی ہیں، اور کل ان کھجوروں کی جگہ سفید باداموں نے لے لی ہے، اور جہاں سنہری باجرے کا مرتبان رکھا تھا وہاں اب دہکتی ہوئی سرخ مرچوں کا ڈھیر پڑا ہے۔ میں بار بار اس رنگارنگ ترتیب کو دیکھنے جاتا ہوں، مگر اس کی وجہ صرف لذّت اندوزی نہیں ہے۔ روز ایک نئی ترتیب کی نمائش دیکھنے سے مجھے یہ بھی جاننے کا موقع ملتا ہے کہ سیاست کے میدان میں کیا ہونے والا ہے — کیوں کہ یہ خیابان مظاہروں کا مقام بھی ہے۔ اگر صبح کے وقت فٹ پاتھ پر کوئی مظاہرہ نہ ہو رہا ہو تو بوڑھا آرمینی ایک گرم دن کے لیے تیار ہونے لگتا ہے

کیوں کہ شام کے وقت ضرور کوئی جلوس نکلے گا۔ وہ اپنے میوے اندر دکان میں لے جانے لگتا ہے تاکہ وہ جلوس کے پیروں تلے روندے نہ جائیں۔ اس کا مطلب ہوتا ہے کہ مجھے بھی سرگرم ہو جانا چاہیے اور دریافت کرنا چاہیے کہ جلوس کون نکال رہا ہے اور کس لیے۔ لیکن اگر خیابان میں چلتے ہوئے دور سے مجھے بوڑھے آرمینی کی نعمتیں فٹ پاتھ پر سجی ہوئی دکھائی دے جائیں تو میں جان جاتا ہوں کہ آج کا دن عام، پُرسکون اور واقعات سے خالی انداز میں گزرے گا اور یہ کہ میں صاف ضمیر کے ساتھ لیونز کے ہاں جا کر وِسکی کا ایک جام پی سکتا ہوں۔

اسی خیابان پر آگے چل کر ایک نانبائی کی دکان ہے جہاں تازہ، گرم روٹی بکتی ہے۔ ایرانی نان پتلی اور بہت پھیلی ہوئی ہوتی ہے۔ اسے زمین میں دس فٹ کی گہرائی تک اترے ہوئے تنور میں پکایا جاتا ہے۔ تنور کی اندرونی دیواروں پر مٹی کی موٹی تہہ ہوتی ہے۔ نیچے آگ جلتی رہتی ہے۔ اگر کوئی عورت اپنے شوہر سے بےوفائی کرے تو اسے ایسے ہی جلتے ہوئے تنور میں پھینک دیا جاتا ہے۔ بارہ سال عمر کا ایک لڑکا رزاق نادری اس دکان پر کام کرتا ہے۔ کسی کو رزاق کے بارے میں ایک فلم بنانی چاہیے۔ وہ نو برس کی عمر میں اپنی ماں، دو چھوٹی بہنوں اور تین چھوٹے بھائیوں کو، دارالحکومت سے چھ سو میل کے فاصلے پر، زنجان کے پاس واقع اپنے گاؤں میں چھوڑ کر تہران آ گیا تھا۔ تب سے وہ اپنے کنبے کی پرورش کر رہا ہے۔ وہ صبح چار بجے اٹھ کر تنور کے پاس گھٹنوں کے بل آ بیٹھتا ہے۔ آگ بھڑک رہی ہے اور تنور سے سخت تپش نکل رہی ہے۔ ایک لمبی سی سلاخ کی مدد سے وہ روٹیاں تنور میں لگاتا اور باہر نکالتا ہے۔ وہ یہ کام رات نو بجے تک مسلسل کرتا رہتا ہے۔ اسے جتنے پیسے ملتے ہیں وہ اپنی ماں کو بھیج دیتا ہے۔ اس کی کل متاع ایک ٹرنک اور ایک کمبل ہے جو وہ رات کو سوتے وقت اوڑھتا ہے۔ رزاق بار بار کام تبدیل کرتا رہتا ہے اور اکثر بےروزگار ہو جاتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس میں خود اسی کا قصور ہے۔ ہر تین چار مہینے بعد اسے ماں کی یاد ستانے لگتی ہے۔ کچھ دن تک وہ اس جذبے کو دبانے کی کوشش کرتا رہتا ہے، مگر ایک دن بےاختیار بس پر سوار ہو کر اپنے گاؤں چلا جاتا ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ عرصے تک اپنی ماں کے پاس رہنا چاہتا ہے مگر جانتا ہے کہ یہ ممکن نہیں ہے ۔۔ وہی کنبے کا واحد سہارا ہے اور اسے کام کرنا ہی ہو گا۔ تہران واپس پہنچ کر اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی جگہ کسی اَور کو رکھ لیا گیا ہے۔ اس لیے رزاق میدانِ گُمرک پہنچ جاتا ہے جہاں بےروزگار لوگ جمع ہوتے ہیں۔ یہ

سستے مزدوروں کا بازار ہے، اور یہاں جمع ہونے والے لوگ بہت کم داموں پر اپنی خدمات پیش کرنے کو تیار رہتے ہیں۔ اس کے باوجود رزاق کو کام حاصل کرنے کے لیے ایک آدھ ہفتے انتظار کرنا پڑتا ہے۔ وہ دن دن بھر وہاں خالی پیٹ کھڑا سردی میں ٹھٹھرتا یا دھوپ میں جلتا رہتا ہے۔ آخر کوئی شخص اس کے پاس آتا ہے۔ رزاق خوش ہے: اسے پھر سے کام مل گیا ہے۔ لیکن یہ خوشی زیادہ دن برقرار نہیں رہتی، ماں سے ملنے کی خواہش پھر سر ابھارتی ہے، وہ پھر گاؤں چلا جاتا ہے، اور لوٹ کر پھر میدانِ گمرک میں آکھڑا ہوتا ہے۔ رزاق کے بالکل پاس شاہ، انقلاب، خمینی اور یرغمالیوں کی دنیا ہے۔ ہر شخص اسی دنیا کے بارے میں باتیں کررہا ہے۔ مگر رزاق کی دنیا اس سے بڑی ہے۔ اتنی بڑی کہ رزاق اس میں بھٹکتا رہتا ہے اور اسے باہر نکلنے کا راستا نہیں ملتا۔

۱۹۷۸ کے سرما اور خزاں کا میدانِ انقلاب۔۔ بے شمار جلوسوں کی گزرگاہ۔ ہر بڑے شہر میں یہی ہورہا ہے۔ ملک بھر میں بغاوت پھیل گئی ہے۔ ہڑتالیں شروع ہو گئی ہیں۔ ہر شخص ہڑتال میں شریک ہو جاتا ہے: کارخانے اور گاڑیاں رک جاتی ہیں۔ ہزاروں لوگوں کے مارے جانے کے باوجود دباو بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ مگر شاہ بدستور تخت پر قائم ہے، اور محل کی دیواریں ابھی سلامت ہیں۔

ہر انقلاب میں کوئی تحریک کسی عمارت سے برسرِپیکار ہوتی ہے۔ تحریک عمارت پر حملہ کرکے اسے گرانے کی کوشش کرتی ہے، جبکہ عمارت قائم رہنے اور تحریک کو ختم کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ دونوں قوتیں، ایک جیسی طاقت ور ہیں مگر مختلف خصوصیات رکھتی ہیں۔ تحریک کی خصوصیات میں بےساختگی، تموّج اور بڑھتا ہوا پھیلاو۔۔ اور ایک مختصر عرصہ حیات۔۔ شامل ہیں۔ عمارت کی خصوصیت جمود، مزاحمت اور قائم رہنے کی حیران کن، تقریباً جبلّی صلاحیت ہے۔ عمارت کو تعمیر کرنا نسبتاً آسان اور اسے تباہ کرنا بےحد دشوار ہے۔ وہ اپنی تعمیر کے جواز کے ختم ہونے کے بھی بہت بعد تک قائم رہ جاتی ہے۔ بہت سی کم زور، بلکہ فرضی ریاستیں وجود میں آجاتی ہیں۔ مگر ریاستیں بھی تو آخر عمارتیں ہی ہیں، اور وہ نقشے پر سے آسانی کے ساتھ محو نہیں ہوتیں۔ دنیا بہت سی عمارتوں سے مل کر بنی ہے جو ایک دوسرے کو سہارا دیے کھڑی ہیں۔ ان میں کسی ایک کو بھی خطرہ ہو تو دوسری

عمارتیں اس کو کمک پہنچاتی ہیں۔ عمارت کی ایک خاصیت لچک بھی ہے، جو قائم رہنے میں اس کی مدد کرتی ہے۔ حملے کے سامنے وہ ایک کونے میں، گویا اپنے آپ میں، سمٹ جاتی ہے، سکڑ کر اُس وقت کا انتظار کرنے لگتی ہے جب وہ دوبارہ پھیل کر اپنی اصل صورت پر واپس آجائے گی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ عمارت کا یہ دوبارہ پھیلاو ٹھیک اسی جگہ سے ہوتا ہے جہاں سے وہ سمٹ گئی تھی۔ عمارتیں دوبارہ تحریک سے پہلے کی صورتِ حال پر واپس آنے کی کوشش کرتی ہیں، جو اُن کے نزدیک بہترین، آئیڈیل صورتِ حال ہے۔ عمارتوں کی اس خصوصیت ہی سے ان کے جمود کا پتا چلتا ہے۔ عمارت صرف اُس پہلے پروگرام کے مطابق عمل کرنے کی پابند ہے جو اس میں فیڈ کیا گیا تھا۔ نیا پروگرام فیڈ کیا جائے تو اس پر کچھ اثر نہیں ہوتا۔ وہ پہلے والے پروگرام کے دوبارہ چلنے کی منتظر رہتی ہیں۔ عمارتیں دبنے اور اچھلنے والے کھلونے کی طرح بھی عمل کرتی ہیں: جس وقت محسوس ہوتا ہے کہ وہ دب کر تباہ ہو گئیں، ٹھیک اُسی وقت وہ اُچھل کر دوبارہ اپنی اصل صورت پر واپس آجاتی ہیں۔ تحریکیں، عمارتوں کی اس خصوصیت سے بے خبر ہوتی ہیں کہ وہ بہت لمبے عرصے تک مزاحمت کرنے کے بعد رفتہ رفتہ کمزور پڑتی ہیں اور بالکل آخر میں ہار مانتی ہیں۔

شاہ کا تھیئٹر: شاہ ایک آمر تھا جو بلند ترین، عالمی سطح کا ایک تھیئٹر قائم کرنا چاہتا تھا۔ وہ تماشائیوں کا شوقین تھا، ان کا دل لُبھانا چاہتا تھا۔ مگر اُسے آرٹ کی اصل فطرت کا کبھی علم نہ ہو سکا، وہ اُس تخیل اور دانائی سے محروم تھا جو ہدایت کار کو درکار ہوتی ہے۔ اس نے سمجھا کہ دولت اور ایک شان دار عنوان تھیئٹر کے لیے کافی ہے۔ اس نے ایک عظیم، وسیع اسٹیج تیار کیا جس پر کئی مقامات پر بیک وقت ایکشن دکھایا جا سکتا تھا۔ اس اسٹیج پر اس نے "عظیم تہذیب" کے عنوان سے ایک ڈراما کھیلنا چاہا۔ اس نے خطیر رقمیں خرچ کر کے باہر ملک سے سینریاں منگوائیں۔ ہر طرح کے آلات، مشینیں، اوزار فراہم ہو گئے: کنکریٹ، کیبلوں اور پلاسٹک کے انبار لگ گئے۔ اسٹیج کا بہت سا سامان اصل ہتھیاروں پر مشتمل تھا: ٹینک، طیارے، راکٹ۔ شاہ مفتخر اور مسرور، اسٹیج پر اِترا اِترا کر چلنے لگا اور چاروں طرف لگے لاؤڈسپیکروں سے آتی ہوئی تعریفی تقریروں اور قصیدوں کی آوازوں میں کھو گیا۔ اسپاٹ لائٹیں پس منظر میں لگی ہوئی سینریوں پر گردش کرتے کرتے، شاہ پر آ کر مرکوز ہو گئیں۔ وہ ان کی شعاعوں کی روشنی میں چلنے اور رکنے لگا۔ یہ کھیل واحد کردار پر مشتمل تھا اور

اس کا اداکار اور ہدایت کار بھی ایک ہی شخص تھا۔ باقی سب لوگ محض ایکسٹرا تھے۔ جنرل، وزیر، ممتاز خواتین، خدام -- دربار کے سب لوگ -- اسٹیج کی بالائی منزل پر حرکت کرتے تھے۔ ان کے بعد درمیانہ اور نچلی منزلوں پر حقیر ترین ایکسٹرا اداکار تھے۔ یہی تعداد میں سب سے زیادہ تھے۔ بڑی بڑی تنخواہوں کے لالچ میں -- شاہ نے انھیں سونے کے پہاڑ دینے کا وعدہ کیا تھا -- وہ جوق در جوق افلاس کے مارے گاؤوں سے شہروں کو چلے آئے تھے۔ شاہ مستقل اسٹیج پر رہتا تھا اور ایکسٹرا اداکاروں کو ہدایات دیا کرتا تھا۔ وہ ایک اشارہ کرتا تو جنرل اٹنشن کھڑے ہو جاتے، وزیر دست بوسی کو جھک جاتے، اور خواتین کورنش بجا لاتیں۔ جب وہ اسٹیج کی کسی درمیانی منزل پر اتر کر سر کو جنبش دیتا تو اہلکار انعام اور ترقی کے لالچ میں اس کے پاس دوڑے آتے۔ اسٹیج کی زمینی منزل پر وہ شاذونادر ہی قدم رکھتا تھا۔ اس منزل کے ایکسٹرا جذبے سے عاری انداز میں برتاو کیا کرتے تھے۔ وہ اعتماد سے محروم اور کھوئے ہوئے تھے، شہر نے انھیں دھوکا دے کر لوٹ لیا تھا اور کچل کر رکھ دیا تھا۔ وہ اس غیر دوستانہ دنیا میں گھرے ہوئے، اس نامانوس سینری کے سامنے اجنبی سے لگتے تھے۔ اس انجانی دنیا میں ان کی پہچان میں آنے والی واحد چیز مسجد تھی، کیوں کہ مسجد گاؤں میں بھی تھی۔ سو وہ مسجد میں چلے گئے۔

کھیل کئی سطحوں پر ایک ساتھ وقوع پذیر ہوتا ہے: اسٹیج پر بہت سی باتیں پیش آ رہی ہیں۔ سینری روشن ہو کر حرکت میں آ گئی ہے، پہیے گھومنے لگے ہیں، چمنیوں میں سے دھواں نکلنے لگا ہے، ٹینک آگے پیچھے حرکت کرتے ہیں، وزیر شاہ کو بوسہ دیتے ہیں، اہلکار انعامات کے پیچھے دوڑ رہے ہیں، پولیس والے ماتھے پر بل ڈال رہے ہیں، ملّا مسلسل بول رہے ہیں، ایکسٹرا خاموشی سے اپنے اپنے کام میں مصروف ہیں۔ چہل پہل بڑھتی جا رہی ہے۔ شاہ، ہمیشہ اسپاٹ لائٹ کے دائرے میں، کبھی ایک طرف اشارہ کرتا ہے کبھی دوسری طرف۔ پھر اچانک اسٹیج پر افراتفری پھیل جاتی ہے، جیسے سب لوگ اپنا اپنا پارٹ بھول گئے ہوں۔ ہاں، انھوں نے اسکرپٹ کو ایک طرف پھینک کر اپنی مرضی سے قطاریں بنانی شروع کر دی ہیں۔ تھیئٹر میں بغاوت ہو گئی ہے! پُرسکون، ہموار منظر اب پُرتشدد، زلزلہ خیز منظر میں بدل گیا ہے۔ بہت دیر سے دکھ سہتے ہوئے، قلیل تنخواہ پر کام کرتے ہوئے، نفرت کا ہدف بنتے ہوئے زمینی منزل کے ایکسٹرا اوپر کی منزلوں پر چڑھائی کر رہے

ہیں۔ درمیانی منزلوں کے لوگ بھی ٹوٹ ٹوٹ کر اُن سے ملنے لگتے ہیں۔ اسٹیج پر سیاہ عَلم چھا جاتے ہیں اور لاؤڈ سپیکروں سے رجز پڑھنے کی آوازیں آنے لگتی ہیں۔ اللہ اکبر! ٹینک آگے پیچھے حرکت کرتے ہیں، پولیس گولیاں چلانے لگتی ہے۔ مینار پر سے موذن کی طویل اذان سنائی دے رہی ہے۔ سب سے اوپر کی منزل میں ایسی افراتفری ہے کہ پہلے کبھی نہ ہوئی تھی۔ وزیر تھیلوں میں نوٹ بھر بھر کر فرار ہو رہے ہیں، خواتین زیوروں کے ڈبے اٹھا اٹھا کر غائب ہوتی جا رہی ہیں، بٹلر حواس باختہ گھوم رہے ہیں۔ سبز جیکٹیں پہنے فدائین اور مجاہدین اسلحے سے لیس نمودار ہوتے ہیں۔ انھوں نے اسلحہ خانے پر قبضہ کر لیا ہے۔ سپاہی جو ہجوموں پر گولیاں چلاتے تھے، اب ان سے آملتے ہیں اور اپنی بندوقوں کی نالوں میں سرخ کارنیشن کے پھول لگا لیتے ہیں۔ اسٹیج پر مٹھائیاں بکھر جاتی ہیں؛ ہمہ گیر خوشی کے عالم میں دکان دار ٹوکریاں بھر بھر کر مٹھائیاں ہجوم کی طرف اُچھال رہے ہیں۔ اگرچہ دوپہر کا وقت ہے، لیکن تمام گاڑیوں کی ہیڈلائٹس روشن ہیں۔ قبرستان میں بہت بڑا اجتماع ہو رہا ہے۔ وہاں موجود ہر شخص مرنے والوں کی یاد میں گریہ کر رہا ہے۔ ایک ماں کہتی ہے کہ اُس کے سپاہی بیٹے نے جلوس میں شامل اپنے بھائیوں پر گولی چلانے پر خودکشی کرنے کو ترجیح دی۔ سفید بالوں والے آیت اللہ طالیقانی کی تقریر ہوتی ہے۔ اسپاٹ لائٹس ایک ایک کر کے بجھنے لگتی ہیں۔ آخری منظر میں ہیروں جڑا تخت طاؤس -- شاہ کا تخت -- سب سے اوپر کی منزل سے رنگوں کی جگمگاہٹ کے درمیان زمینی منزل پر آ گرتا ہے۔ تخت پر شاہی شان و شوکت کا ایک غیر معمولی طور پر قد آور مجسمہ بیٹھا ہے جس میں سے تیز روشنی کی شعاعیں نکل رہی ہیں۔ اس کے ہاتھ پیر، سر اور بدن تاروں اور کیبلوں سے جڑے ہوئے ہیں۔ اس مجسمے کو دیکھ کر ہم سناٹے میں آ جاتے ہیں، دہشت زدہ ہو جاتے ہیں، گھٹنوں کے بل جھکنے کے بارے میں سوچنے لگتے ہیں۔ مگر الیکٹریشینوں کی ایک ٹولی اسٹیج پر آ کر کیبلوں کو الگ کرنے اور تاروں کو کاٹنے لگتی ہے۔ روشنی رفتہ رفتہ مدّھم پڑتی جاتی ہے اور مجسمہ خود بھی پست اور عامیانہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ آخر الیکٹریشین سامنے سے ہٹتے ہیں اور ہمیں ایک معمّر، دبلا پتلا آدمی دکھائی دیتا ہے، بالکل ایسا کہ اس سے ہماری ملاقات کسی سنیما، کسی کیفے یا کسی قطار میں بھی ہو سکتی تھی۔ وہ تخت سے لڑکھڑاتا ہوا کھڑا ہوتا ہے، اپنا سوٹ جھاڑتا ہے، ٹائی کی گرہ درست کرتا ہے اور اسٹیج سے باہر، ایرپورٹ کی طرف چل دیتا ہے۔

o o o

یہ تصویر کسی اخبار سے ایسی بے احتیاطی سے پھاڑی گئی ہے کہ اس کا عنوان غائب ہے۔ یہ گھوڑے پر سوار کسی شخص کا یادگاری مجسمہ ہے جو پتھر کے ایک اونچے چبوترے پر نصب ہے۔ ہرکولیس کی سی جسامت والا شہسوار بڑے پُرسکون انداز میں بیٹھا بائیں ہاتھ سے باگ تھامے ہوئے، داہنے ہاتھ کی شہادت کی انگلی سے دور سامنے (غالباً مستقبل کی طرف) اشارہ کررہا ہے۔ شہسوار کی گردن میں ایک رسّی پڑی ہے، اور ایسی ہی ایک اَور رسّی اس کے گھوڑے کی گردن میں بھی ہے۔ یادگاری چبوترے کے نیچے لوگوں کی ٹولیاں ان دونوں رسیوں کو پکڑکر زور لگا رہی ہیں۔ یہ سب کچھ ایک پُرہجوم چوک میں پیش آرہا ہے اور تماشائی کھڑے، رسیاں کھینچتے ہوئے لوگوں کو کانسی کے اس دیوہیکل مجسّمے کی مضبوطی کے باعث ہانپتا دیکھ رہے ہیں۔ یہ تصویر عین اُس لمحے لی گئی جب دونوں رسیاں پیانو کے تاروں کی طرح کھنچی ہوئی ہیں اور گھوڑا اور اس کا سوار ایک طرف کو جھکنے لگے ہیں۔۔ یعنی ان کے زمین پر آگرنے سے بس لمحہ بھر پہلے۔ اسے دیکھ کر ہم یہ سوچے بغیر نہیں رہ سکتے کہ یہ لوگ جو اتنا زور لگا کر مجسّمے کو گرا رہے ہیں، اگلے لمحے اُچھل کر اس کی زد سے باہر آنے میں کامیاب ہوں گے یا نہیں، خصوصاً اس لیے بھی کہ تماشائیوں کے ہجوم نے ان کے ہٹنے کے لیے زیادہ جگہ نہیں چھوڑی ہے۔ اس تصویر میں تہران یا کسی اَور شہر میں لگے ہوئے بادشاہ (محمد رضا یا رضا شاہ) کے مجسّمے کے گرائے جانے کا منظر دکھایا گیا ہے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ تصویر کس سال کھینچی گئی ہوگی، کیوں کہ پہلوی باپ اور بیٹے کے مجسّمے کئی بار گرائے گئے، جب بھی لوگوں کو موقع ملا۔

تہران کے روزنامہ ''کیہان'' کے رپورٹر نے ایک شخص کا انٹرویو کیا جو شاہ کے مجسّمے گرایا کرتا ہے:

*آپ کو اپنے علاقے میں اس بنا پر خاصی شہرت حاصل ہوگئی ہے کہ آپ مجسّمے گراتے ہیں۔ بلکہ آپ کو اس میدان میں ایک طرح کے ماہر کا درجہ دیا جانے لگا ہے۔

*درست۔ پہلے پہل میں نے شاہ کے باپ رضا شاہ کے دور میں مجسّمے گرائے تھے، ۱۹۴۱ میں یعنی جب وہ تخت سے دست بردار ہوا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ جب شاہ کے تخت چھوڑنے کی خبر پھیلی تو کیسا مسرّت کا سماں تھا۔ ہر شخص گھر سے نکل کر اُس کے مجسّمے توڑنے کے لیے دوڑ پڑا۔ میں اُس وقت چھوٹا سا لڑکا تھا، لیکن میں نے اُن مجسموں کو گرانے

میں اپنے باپ اور محلّے کے دوسرے لوگوں کا ہاتھ بٹایا تھا جو شاہ نے ہمارے محلّے میں نصب کرائے تھے۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ یہی میرا آتشیں بپتسمہ تھا۔

*کیا آپ کو اس سلسلے میں کسی سزا کا بھی سامنا کرنا پڑا؟

*نہیں، اُس موقعے پر نہیں۔

*آپ کو سن ترپین یاد ہے؟

*بے شک یاد ہے۔ وہی تو اہم ترین سال تھا جب جمہوریت ختم ہوئی اور رژیم کا آغاز ہوا۔ بہرحال، مجھے ریڈیو پر یہ اعلان سننا یاد ہے کہ شاہ یوروپ فرار ہو گیا ہے۔ جوں ہی لوگوں نے یہ خبر سنی وہ گلیوں میں نکل آئے اور مجسمے گرانے لگے۔ اور چوں کہ شاہ نے پہلے ہی دن سے اپنے اور اپنے باپ کے مجسمے لگوانے شروع کر دیے تھے، تو سال بہ سال بہت سے مجسمے جمع ہو گئے تھے جنھیں گرایا جانا تھا۔ میرے باپ کا انتقال ہو چکا تھا، لیکن میں بڑا ہو گیا تھا اور پہلی بار میں نے خود اپنے بل پر مجسمے گرانے کا کام کیا۔

*تو کیا آپ نے اس کے تمام مجسمے تباہ کر دیے؟

*بالکل، ایک نہیں چھوڑا۔ جب شاہ واپس آیا ہے تو اس کا ایک بھی مجسمہ باقی نہیں بچا تھا۔ لیکن اس نے آتے ہی اپنا کام پھر شروع کر دیا، اپنے اور اپنے باپ کے مجسمے پھر لگوانے لگا۔

*یعنی آپ گراتے تھے، وہ پھر نصب کراتا تھا، اور آپ اس کے نصب کیے ہوے مجسمے دوبارہ گراتے تھے، اور یہی ہوتا رہتا تھا؟

*بالکل! کئی بار تو ہم ہار ماننے کے قریب پہنچ گئے۔ ہم ایک مجسمہ گراتے تھے، وہ تین نصب کرا دیتا تھا۔ ہم تین گراتے تھے، وہ دس لگوا دیتا تھا۔ کوئی حد تو اس کی تھی نہیں!

*سن ترپین کے بعد آپ کو کب مجسمے گرانے کا دوبارہ موقع ملا؟

*ہم نے سن ترسٹھ میں اپنا کام دوبارہ شروع کرنے کا ارادہ کیا جب شاہ نے خمینی کو قید کر دیا تھا اور ہنگامے شروع ہو گئے تھے۔ مگر شاہ نے ایسا قتلِ عام شروع کیا کہ مجسمے گرانا تو کجا، ہمیں اپنی طنابیں تک چھپانی پڑیں۔

*کیا آپ اس کام کے لیے خاص قسم کی طنابیں استعمال کرتے ہیں؟

*درست۔ ہم نے اپنی سیسل کی طنابیں بازار میں ایک رسّی والے کی دکان میں چھپائی تھیں۔ یہ کوئی مذاق نہیں تھا۔ اگر پولیس کو ہماری بھنک بھی پڑ جاتی تو ہمیں دیوار

کے ساتھ کھڑا کر کے اڑا دیا جاتا۔ ہم نے مناسب موقعے کے انتظار میں سب کچھ تیار کر رکھا تھا، منصوبہ بالکل مکمل تھا اور مشق بھی کر لی گئی تھی۔ پچھلے انقلاب میں، یعنی سن اُناسی میں، اس قدر حادثے اسی وجہ سے ہوئے کہ مجسمے گرانے کا کام اناڑیوں کے ہاتھ میں آ گیا تھا اور وہ مجسموں کو اپنے سر پر گرا لیتے تھے۔ مجسمے گرانا کوئی کھیل نہیں ہے۔ اس میں تجربے اور مہارت کی ضرورت پڑتی ہے۔ سب سے پہلے تو آپ کو یہ جاننا چاہیے کہ مجسمہ بنا ہوا کس چیز کا ہے، پھر یہ کہ اس کا وزن کتنا ہے، اونچائی کتنی ہے، اسے ویلڈنگ سے جوڑا گیا ہے یا سیمنٹ میں دھنسایا گیا ہے، اور یہ کہ گرانے کے بعد اسے کس طرح توڑا جائے گا۔ دراصل ہم اپنا کام اُسی وقت شروع کر دیتے تھے جب مجسمہ بنایا جا رہا ہوتا تھا۔ وہی اس کی تعمیر کو غور سے دیکھنے کا بہترین موقع ہوتا تھا، یعنی یہ کہ وہ اندر سے ٹھوس ہے یا کھوکھلا، اور سب سے اہم بات یہ کہ اسے چبوترے پر کس طرح نصب کیا جا رہا ہے اور اس کی سہار کس قسم کی ہے۔

*اس کام میں تو آپ کو خاصا وقت دینا پڑتا ہوگا؟

*درست! پچھلے چند برسوں میں تو بے تحاشا مجسمے لگائے جا رہے تھے۔ ہر جگہ — چوکوں پر، گلیوں میں، اسٹیشنوں پر، سڑکوں کے کنارے۔ اور پھر حکومت کے علاوہ دوسرے لوگ بھی یہ کام کرنے لگے تھے۔ جس کسی کو ٹھیکا حاصل کرنا ہو، فوراً مجسمہ نصب کرنے دوڑتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مجسمے بہت سستے بنوائے جاتے تھے، اور جب وقت آیا تو انھیں آسانی سے گرا لیا گیا۔ لیکن مجھے اعتراف ہے کہ بعض مجسموں کو گرانے میں ایسا بھی موقع آیا کہ ہم سوچنے لگے کہ اسے گرایا بھی جا سکے گا یا نہیں۔ سینکڑوں تھے۔ لیکن ہمیں کام زیادہ ہونے کی پروا نہیں تھی۔ میرے ہاتھوں میں تو رسّیوں سے رگڑ کھا کھا کر آبلے پڑ گئے تھے۔

*تو آپ کا کام خاصا دلچسپ تھا!

*کام نہیں تھا، یہ تو فرض تھا۔ مجھے انتہائی فخر ہے کہ میں نے شاہ کے مجسمے گرائے۔ میرا خیال ہے جس کسی نے بھی اس کام میں حصّہ لیا اُسے اس پر فخر ہوگا۔ ہم نے جو کام کیا سب کے سامنے ہے۔ سارے یادگاری چبوترے خالی ہو گئے ہیں اور شاہوں کے مجسمے یا تو ریزہ ریزہ ہو چکے ہیں یا پھر کہیں کونے کھدروں میں پڑے ہوں گے۔

شاہ نے ایسا نظام تخلیق کیا جو صرف اپنی حفاظت کرنے پر قادر تھا لیکن لوگوں کو مطمئن نہیں کر سکتا تھا۔ یہی اس نظام کی سب سے بڑی کمزوری اور اس کی حتمی شکست کی وجہ تھی۔ اس قسم کے نظام کی بنیاد حکمراں کی اپنی رعایا کی بابت تحقیر پر استوار ہوتی ہے اور اس کے اس یقین پر کہ جاہل قوم کو ہمیشہ وعدوں سے بہلایا جا سکتا ہے۔ لیکن ایک ایرانی کہاوت ہے کہ وعدوں کی اہمیت اُنھیں کے لیے ہوتی ہے جو وعدوں پر یقین کرتے ہوں۔

خمینی نے جلاوطنی سے لوٹنے پر قُم جانے سے پہلے تہران میں مختصر قیام کیا۔ ہر شخص اس کو دیکھنا چاہتا تھا، لاکھوں لوگ اس سے ہاتھ ملانے کی تمنا رکھتے تھے۔ جس اسکول کی عمارت میں اس کا قیام تھا اسے بےپناہ ہجوم نے گھیر لیا۔ ہر شخص آیت اللہ سے ملنے کو اپنا حق سمجھتا تھا۔ آخر اُن سب نے اس کی واپسی کے لیے جنگ لڑی تھی۔ انھوں نے اپنا خون بہایا تھا۔ ہوا میں ہر طرف جوش و خروش اور مسرّت تھی۔ لوگ چلتے ہوئے ایک دوسرے کی پیٹھ پر ہاتھ مارتے تھے، جیسے کہہ رہے ہوں: دیکھا، ہم سب کچھ کر سکتے ہیں!

کسی قوم کی زندگی میں ایسے لمحے شاذونادر ہی آتے ہیں! مگر ایسے لمحوں میں فتح کا احساس بالکل فطری اور معقول لگتا ہے۔ شاہ کی عظیم تہذیب ملبے کی صورت میں پڑی تھی۔ دراصل وہ کیا تھی؟ باہر سے لا کر لگایا ہوا ایک پودا جسے زمین نے مسترد کر دیا۔ یہ زندگی گزارنے کے ایک خاص ماڈل کو ایسی قوم پر نافذ کرنے کی کوشش تھی جو بالکل مختلف روایتیں اور قدریں رکھتی تھی۔ یہ جبر تھا۔ یہ اعضا کی پیوندکاری کا ایک ایسا آپریشن تھا جس میں جراحی کے کمال کی حیثیت زیادہ تھی، اس بات کی پروا کم تھی کہ مریض زندہ بھی رہ سکے گا یا -- زیادہ اہم بات یہ کہ -- اپنا آپ بھی رہ سکے گا یا نہیں۔

اجنبی پیوند کا استرداد ایک بار شروع ہو جائے تو پھر پیچھے نہیں لوٹ سکتا۔ اس عمل کے شروع ہونے کے لیے معاشرے کا اس بات پر یقین کرنا کافی ہوتا ہے کہ نافذ کی ہوئی شے کے نقصانات زیادہ ہیں اور فائدے کم۔ بہت جلد بےاطمینانی ظاہر ہونے لگتی ہے، پہلے پہل ڈھکے چھپے اور انفعالی انداز میں، اور پھر برسرِعام اور زیادہ زور کے ساتھ۔ سکون اُس وقت تک نہیں مل سکتا جب تک یہ اجنبی وجود جسم سے خارج نہ ہو جائے۔ جسم تلقین اور

دلیل کا اثر قبول نہیں کرتا؛ مضطرب اور سوچنے کی صلاحیت سے عاری رہتا ہے۔ عظیم تہذیب نیک ارادوں اور اونچے آدرشوں سے تہی نہیں تھی۔ مگر لوگوں نے ان ارادوں اور آدرشوں کو مضحکہ خیز کیری کیچروں ہی کے روپ میں دیکھا، یعنی ٹھیک اُس صورت میں جو آدرش کے عمل میں آنے سے پیدا ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں اعلیٰ آدرش بھی تشکیک کا ہدف بن جاتے ہیں۔

o o o

اور اس کے بعد؟ اس کے بعد کیا ہوا؟ میں زمانۂ حال کے بارے میں کیا لکھوں؟ اس صورتِ حال کے بارے میں جب ایک عظیم تجربہ اپنے اختتام کو پہنچ رہا ہو؟ یہ ایک اداس کر دینے والا موضوع ہے، کیوں کہ بغاوت ایک عظیم تجربہ ہے، دل کی ایک دشوار مہم ہے۔ ان لوگوں پر نظر ڈالیے جو کسی بغاوت میں حصّہ لے رہے ہوں۔ وہ ایک جذبے اور جوش کے عالم میں ہوتے ہیں، قربانیاں دینے کو تیار۔ اُس لمحے وہ ایک ایسی دنیا میں رہ رہے ہوتے ہیں جس پر صرف ایک خیال مسلّط ہوتا ہے: وہ مقصد حاصل کیا جائے جس کے لیے بغاوت کی گئی ہے۔ اس مقصد کے مقابلے میں ہر چیز کی اہمیت ثانوی ہو جاتی ہے: ہر تکلیف قابلِ برداشت ہوتی ہے؛ ہر قربانی معمولی ہوتی ہے۔ بغاوت ہمیں ہماری انا سے رہا کر دیتی ہے، ہماری روزمرّہ کی انا سے جو ہمیں ایک چھوٹی سی، بے حقیقت اور اجنبی شے محسوس ہونے لگتی ہے۔ ہم حیرت کے عالم میں خود میں انجانی توانائیاں دریافت کرتے ہیں اور خود ایسا طرزِ عمل اختیار کرنے کے اہل ہو جاتے ہیں کہ خود اسے تحسین کی نگاہ سے دیکھنے لگتے ہیں۔ اور اتنا بلند ہو جانے پر ہم کس قدر فخر محسوس کرتے ہیں! اپنی ذات کا اتنا بڑا حصّہ قربان کر دینے پر ہمیں کیسا اطمینان ہوتا ہے! لیکن پھر یہ کیفیت اترنے لگتی ہے اور رفتہ رفتہ سب کچھ ختم ہو جاتا ہے۔ ہم اضطراری طور پر، رسماً وہی سب الفاظ اور حرکات جاری رکھتے ہیں اور ہر چیز کو ویسا ہی چاہتے ہیں جیسی وہ کل تک تھی۔ مگر ہمیں معلوم ہو چکا ہے -- اور یہ معلوم کر کے ہم سناٹے میں آ جاتے ہیں -- کہ وہ گزرا ہوا کل اب کبھی واپس نہیں آئے گا۔ ہم اپنے ارد گرد دیکھتے ہیں تو ہم پر ایک اور انکشاف ہوتا ہے: جو لوگ ہمارے ساتھ تھے وہ بھی اب بدل چکے ہیں -- اُن میں بھی کوئی چیز ختم ہو گئی ہے، کوئی چیز بُجھ گئی ہے۔ ہمارا ساتھ اچانک بکھرنے لگا ہے اور ہر شخص اپنی روزمرّہ کی انا پر لوٹ آیا ہے جو تنگ جوتوں کی طرح کاٹنے لگتی ہے -- مگر ہم جانتے ہیں کہ یہ ہمارے ہی جوتے ہیں، اور یہ کہ ہمیں دوسرے

جوتے نہیں ملیں گے۔ ہم ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بے چین ہو جاتے ہیں، بات کرنے سے کترانے لگتے ہیں، ایک دوسرے کے لیے بے مصرف ہو جاتے ہیں۔

o o o

پارے کا یہ اُتار، موسم کی یہ تبدیلی، انتہائی بے قرار اور ملول کر دینے والا تجربہ ہے۔ ایک دن شروع ہوتا ہے جس میں کچھ ہونا چاہیے۔ مگر کچھ نہیں ہوتا۔ کوئی ہمیں بلانے نہیں آتا، کوئی ہمارا انتظار نہیں کرتا، ہم فالتو ہو جاتے ہیں۔ سخت تکان ہمیں آلیتی ہے: ہم بے حسی کی کیفیت میں اترتے چلے جاتے ہیں۔ ہم خود کو بتاتے ہیں: مجھے تھوڑا سا آرام کرنا چاہیے، اپنی حالت درست کرنی چاہیے، توانائی بحال کرنی چاہیے۔ ہمیں تازہ ہوا کی ضرورت محسوس ہونے لگتی ہے۔ ہمیں چھوٹے چھوٹے معمولی کام کرنے کی طلب ستانے لگتی ہے: فلیٹ کی جھاڑپونچھ کرنی ہے، کھڑکی کی مرمّت کرنی ہے۔ یہ سب دفاعی عمل دراصل اترتی ہوئی اداسی کو فریب دینے کی کوششیں ہیں۔ سو ہم کسی نہ کسی طرح خود کو کھڑکی کی مرمّت پر آمادہ کر لیتے ہیں۔ مگر سب کچھ ٹھیک نہیں ہے، ہم خوش نہیں ہیں، کیوں کہ ہمارے اندر پھنسی ہوئی کنکری ہمیں مسلسل چُبھ رہی ہے۔

میں بھی اِس احساس میں شریک تھا جو ہم پر اُس وقت غالب آجاتا ہے جب ہم مرتی ہوئی آگ کے سامنے بیٹھے ہوتے ہیں۔ میں تہران میں پیدل گھومتا تھا جہاں سے گزرے ہوئے کل کے نقوش مٹتے جا رہے تھے۔ یہ نقوش بہت تیزی سے مٹ رہے تھے اور آپ کو یہ گمان ہو سکتا تھا کہ یہاں کچھ بھی نہیں ہوا ہے۔ چند جلے ہوئے سنیما گھر، کچھ مسمار کیے ہوئے بینک -- خارجی اثرات کی علامتیں۔ انقلاب علامتوں کو بہت اہمیت دیتا ہے، کچھ یادگاروں کو مسمار کرتا ہے اور اُن کی جگہ کچھ اور یادگاریں اس امید پر قائم کرتا ہے کہ خود کو ان استعاروں میں زندہ رکھ سکے۔ اور لوگوں کا کیا بنا؟ وہ ایک بار پھر راہگیر شہری بن گئے تھے جو کہیں آ جا رہے تھے، گلیوں کے کونوں پر کھڑے ہاتھ تاپ رہے تھے، ایک مٹیالے شہر کے دھندلے منظر کا حصّہ بن چکے تھے۔ ایک بار پھر ہر شخص تنہا تھا، اپنے آپ میں گم، بند اور خاموش۔ کیا وہ اب بھی کسی چیز کے، کسی غیر معمولی بات کے ہونے کے منتظر ہیں؟ میں نہیں جانتا، میں نہیں کہہ سکتا۔

○ ○ ○

ہر وہ چیز جو انقلاب کو خارجی، مرئی شکل دیتی ہے، بہت جلد غائب ہو جاتی ہے۔ کسی شخص، کسی فردِ واحد کے پاس اپنے احساس اور خیال کو دوسروں تک پہنچانے کے ہزاروں طریقے ہوتے ہیں۔ وہ ختم نہ ہونے والا خزانہ ہے، ایک پوری دنیا ہے جس میں ہم ہمیشہ نت نئی چیزیں دریافت کر سکتے ہیں۔ اس کے برعکس ہجوم کسی شخص کی انفرادیت کو بہت کم کر دیتا ہے؛ ہجوم میں شامل آدمی خود کو اظہار کی چند، اور بہت سادہ، ابتدائی، ہیئتوں تک محدود کر لیتا ہے۔ وہ ہیئتیں جن کے ذریعے ہجوم اپنے احساسات کا اظہار کر سکے، بہت تھوڑی ہیں اور خود کو مسلسل دُہراتی رہتی ہیں: جلوس، ہڑتال، جلسہ، سڑکوں پر رکاوٹیں۔ یہی وجہ ہے کہ آدمی کے بارے میں ناول لکھا جا سکتا ہے، ہجوم کے بارے میں نہیں -- ہرگز نہیں۔ جب ہجوم منتشر ہو جائے، لوگ اپنے اپنے گھروں کو لوٹ جائیں، دوبارہ جمع نہ ہونے کے لیے، تو ہم کہتے ہیں کہ انقلاب پورا ہو گیا۔

تب میں انقلابی کمیٹی کے ہیڈ کوارٹر میں گیا۔ کمیتہ -- یہ نئے اقتدار کے اعضا کا نام ہے۔ بے ترتیب کمروں میں میزوں کے گرد لوگ بیٹھے تھے جن کی شیو بڑھی ہوئی تھی۔ میں نے اُن کے چہروں کو پہلی بار دیکھا۔ یہاں آتے ہوئے، راستے بھر، مَیں اپنے حافظے کو اُن لوگوں کے ناموں سے بھرتا ہوا آیا تھا جنھوں نے شاہ کی عملی مخالفت کی تھی یا جو باغیوں کی درپردہ مدد کرتے رہے تھے۔ میں نے منطقی طور پر فرض کیا تھا کہ وہی لوگ اب انتظام چلا رہے ہوں گے۔ میں پوچھتا پھرا تھا کہ اُن لوگوں سے کہاں ملاقات ہو سکتی ہے۔ کمیٹی کے ارکان نہیں جانتے تھے۔ بہرحال وہ لوگ یہاں نہیں تھے۔ وہ پورا مستحکم نظام، جس میں ایک شخص اقتدار پر قابض تھا، ایک اَور شخص اس کی مخالفت کرتا تھا، ایک تیسرا شخص پیسے بناتا تھا، اور ایک چوتھا شخص تنقید کرتا تھا، وہ پورا پیچیدہ نظام جو برسوں سے قائم تھا، تاش کے پتّوں سے بنے ہوئے محل کی طرح بکھر کر زمیں بوس ہو گیا۔ میں جو نام لے رہا تھا وہ اِن داڑھی والے، بمشکل خواندہ، سبک مغز لوگوں کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتے تھے۔ انھیں اس بات کی کیا پروا کہ چند سال پہلے حافظ فرمان نے شاہ پر نکتہ چینی کی اور اپنے اس عمل کی قیمت روزگار سے محروم ہو کر چکائی، جبکہ اُسی زمانے میں کلثوم کتاب مقتدر لوگوں کے جوتے چاٹ چاٹ کر اپنی زندگی بنا رہا تھا! یہ سب ماضی کی باتیں ہیں۔ وہ دنیا اب نہیں رہی۔ انقلاب نے

اقتدار بالکل نئے، گمنام لوگوں کو سونپ دیا ہے جن کا نام تک کل کسی کو معلوم نہیں تھا۔ اب داڑھی والے دن بھر بیٹھ کر غور کیا کرتے ہیں۔ کس بات پر؟ اس پر کہ اب کیا کیا جائے۔ ہاں، کیوں کہ کمیٹی کو کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے۔ وہ باری باری اظہارِ خیال کرتے ہیں۔ ہر شخص اپنی بات کہنا چاہتا ہے، تقریر کرنا چاہتا ہے۔ انھیں دیکھتے ہوئے آپ کو محسوس ہو گا کہ ان کے نزدیک یہ بہت ضروری ہے، بہت اہم ہے۔ اس کے بعد ہر شخص اپنے اپنے گھر واپس چلا جائے گا اور ہمسایوں سے کہے گا: میں نے تقریر کی۔ ممکن ہے لوگ ایک دوسرے سے دریافت کریں: تم نے سنا، اس نے تقریر کی۔ سڑک پر چلتے ہوئے لوگ اسے روک روک کر تعظیمی لہجے میں کہیں گے: آپ نے بڑی دلچسپ تقریر کی! ایک غیر رسمی حفظِ مراتب رفتہ رفتہ بننے لگتا ہے: سب سے اوپر، ظاہر ہے، وہ لوگ ہیں جو مجمعے کے سامنے متاثر کن انداز میں آتے ہیں، اور سب سے نیچے وہ جو شرمیلے ہیں، اپنے آپ میں سمٹے رہتے ہیں، جن کی زبان لڑکھڑانے لگتی ہے، بے شمار ایسے لوگ جو اسٹیج پر آنے کی دہشت پر قابو نہیں پاسکتے، اور پھر وہ لوگ جو اس متواتر تقریر بازی میں کوئی فائدہ نہیں دیکھتے۔ اگلے دن تقریر کرنے والے نئے سرے سے آغاز کریں گے، جیسے کل کچھ بھی نہ ہوا ہو، جیسے انھیں بات بالکل شروع سے اٹھانی ہو۔

ایران -- یہ ستائیسواں انقلاب تھا جو میں نے تیسری دنیا میں دیکھا۔ دھویں اور شوروغوغا کے درمیان حکمراں تبدیل ہوتے ہیں، حکومتیں معزول ہوتی ہیں، نئے لوگ ان کی جگہ لیتے ہیں۔ مگر ایک چیز ہے جو تبدیل نہیں ہو پاتی، جو تباہ نہیں ہو پاتی، جو -- مجھے یہ کہتے ہوئے دہشت محسوس ہوتی ہے -- ابدی ہے: بے بسی۔ ایرانی کمیٹیوں کے یہ دفتر مجھے وہی کچھ یاد دلاتے ہیں جو میں بولیویا میں، موزمبیک میں، سوڈان میں دیکھ چکا ہوں۔ ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ تم جانتے ہو کہ کیا کیا جائے؟ کون، مَیں؟ نہیں۔ شاید تمھیں معلوم ہو۔ کیا تم مجھ سے کہہ رہے ہو؟ میں تو سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔ مگر کیسے؟ سب کچھ کیسے کیا جائے؟ ہاں، یہ تو ہے، یہی تو مسئلہ ہے۔ ہر شخص اس پر اتفاق کرتا ہے: واقعی یہ ایسا مسئلہ ہے جس پر بات ہونی چاہیے۔ بند کمروں میں سگریٹ کا دھواں بھرنے لگتا ہے۔ کچھ اچھی تقریریں ہوتی ہیں، کچھ اتنی اچھی نہیں ہوتیں، دو ایک بے حد شاندار ہوتی ہیں۔ ایک عمدہ تقریر کے بعد ہر شخص اطمینان محسوس کرتا ہے: ان سب نے ایک ایسے کام میں حصہ لیا جو واقعی بہت کامیاب رہا۔

کمیٹی کے ماحول نے مجھ میں تجسّس بیدار کر دیا تھا، اس لیے میں (کسی ایسے شخص کے انتظار کا بہانہ بنا کر جو وہاں موجود نہیں تھا) کمیٹی کے ایک ہیڈ کوارٹر میں بیٹھ گیا اور دیکھنے لگا کہ یہ لوگ کسی سادہ سے مسئلے کو کیوں کر نمٹاتے ہیں۔ آخر تو زندگی مسئلوں کو نمٹانے کا، عمدگی سے اور عام اطمینان کے مطابق نمٹاتے چلے جانے کا نام ہے۔ کچھ دیر بعد ایک عورت اندر آئی: اسے ایک سرٹیفکیٹ درکار تھا۔ جو شخص یہ سرٹیفکیٹ جاری کرنے کا اختیار رکھتا تھا، اس وقت کسی گفتگو میں الجھا ہوا تھا۔ عورت انتظار کرنے لگی۔ یہاں کے لوگوں میں انتظار کرنے کی بے پناہ صلاحیت ہے -- وہ پتھر کے ہو کر ساری زندگی انتظار کرنے پر قادر ہیں۔ آخر وہ شخص آیا اور اس عورت سے بات کرنے لگا۔ عورت کچھ بولی، اُس شخص نے کوئی سوال کیا، عورت نے کچھ پوچھا، اس نے جواب میں کچھ کہا۔ کچھ دیر کی ردوکد کے بعد ان کا کسی بات پر اتفاق ہو گیا۔ اب کاغذ تلاش کیا جانے لگا۔ میز پر کئی طرح کے کاغذ پڑے ہوئے تھے، مگر ان میں سے کوئی بھی مناسب معلوم نہیں ہوتا تھا۔ وہ شخص کمرے سے چلا گیا -- وہ ضرور کاغذ لینے گیا ہو گا، مگر یہ بھی ممکن ہے کہ وہ سڑک کے اُس پار چائے پینے چلا گیا ہو (دن خاصا گرم تھا)۔ عورت خاموشی سے انتظار کرتی رہی۔ وہ شخص تسکین کے عالم میں اپنا منھ پونچھتا ہوا لوٹا (تو وہ واقعی چائے پینے گیا تھا!)، لیکن اس کے ہاتھ میں کاغذ بھی تھا۔ اب قصّے کا سب سے ڈرامائی حصّہ شروع ہوا -- پنسل کی تلاش۔ پنسل وہاں کہیں بھی نہیں تھی، نہ میز پر، نہ دراز میں اور نہ فرش پر۔ میں نے اسے اپنا قلم پیش کیا۔ وہ مسکرایا اور عورت نے سکون کا سانس لیا۔ تب وہ لکھنے بیٹھا۔ لکھنا شروع کرتے ہوئے اسے خیال آیا کہ وہ جس بات کا سرٹیفکیٹ دے رہا ہے اسے یقینی طور پر معلوم نہیں ہے۔ دونوں پھر بات کرنے لگے، اور پھر اس شخص نے سر ہلایا۔ آخر کار دستاویز تیار ہو گئی۔ اب اس پر کسی اونچے عہدے والے کے دستخط ہونے تھے۔ لیکن وہ اونچے عہدے والا موجود نہیں تھا۔ وہ کسی اور کمیٹی میں بحث میں مشغول تھا، اور اس سے رابطہ پیدا کرنے کا کوئی طریقہ نہیں تھا کیوں کہ دوسری طرف کوئی فون نہیں اٹھا رہا تھا۔ انتظار۔ عورت پتھر کی ہو گئی، وہ شخص کہیں چلا گیا، اور میں چائے پینے کے لیے اٹھ آیا۔

آگے چل کر یہ شخص سرٹیفکیٹ لکھنا سیکھ لے گا، اور بہت سے اور کام کرنا بھی سیکھ

لے گا۔ مگر چند سال بعد پھر کوئی ہلچل ہو گی، جس آدمی سے ہم اس وقت تک مانوس ہو چکے ہوں گے، وہ چلا جائے گا، اور اس کی جگہ کسی ایسے آدمی کو مل جائے گی جو نئے سرے سے کاغذ اور پنسل ڈھونڈنے لگے گا۔ وہی عورت، یا کوئی اَور عورت، پتّھر کی ہو جائے گی اور انتظار کرنے لگے گی۔ کوئی شخص اپنا قلم پیش کرے گا۔ اونچے عہدے والا شخص بحث میں مشغول ہو گا۔ یہ سب لوگ اپنے پیش رووں کی طرح، بے بسی کے افسوں زدہ دائرے میں چکر کاٹنے لگیں گے۔ یہ دائرہ کس کی تخلیق ہے؟ ایران میں اس کا خالق شاہ تھا۔ شاہ نے سوچا کہ شہری اور صنعتی ثقافت کا قیام ترقی کی کلید ہے، مگر یہ غلط خیال تھا۔ ترقی کی کلید گاؤں ہے۔ شاہ کے ذہن کو ایٹمی بجلی گھروں، کمپیوٹرائزڈ پروڈکشن لائنوں اور پیٹرو کیمیکل کے دیوہیکل کارخانوں کے خواب نے تسخیر کر لیا۔ لیکن کسی غیر ترقی یافتہ ملک میں یہ سب ترقی کے محض سراب ہوتے ہیں۔ اس قسم کے ملک میں لوگوں کی اکثریت افلاس زدہ دیہات میں رہتی ہے جہاں سے بھاگ بھاگ کر وہ شہر آتے ہیں۔ یہ آنے والے جوان، پُرقوت محنت کش ہوتے ہیں جو بہت کم جانتے ہیں (وہ اکثر ناخواندہ ہوتے ہیں) مگر ان میں آگے بڑھنے کی شدید لگن ہوتی ہے اور وہ ہر چیز کے لیے جدوجہد کرنے کو تیار ہوتے ہیں۔ شہر آ کر وہ مضبوط بنیادوں والے ایک ناقابلِ تسخیر نظام کو دریافت کرتے ہیں جس کا رشتہ وقت کے حکمرانوں سے بہت گہرا ہوتا ہے۔ وہ ابتدائی چیزیں سیکھتے ہیں، اپنے قدم جمانے کی کوشش کرتے ہیں اور پھر حملے کا آغاز کر دیتے ہیں۔ وہ اس جدوجہد میں وہی نظریہ استعمال کرتے ہیں جو گاؤں سے ساتھ لائے ہوں ۔۔ عموماً یہ نظریہ مذہب کا ہوتا ہے۔ چوں کہ یہی وہ لوگ ہیں جن میں آگے بڑھنے کا سچا عزم موجود ہوتا ہے، اس لیے اکثر انھیں کی فتح ہوتی ہے۔ پھر حاکمیت ان کے ہاتھوں میں آ جاتی ہے۔ لیکن اب وہ اس کا کیا کریں؟ وہ اس پر بحث شروع کر دیتے ہیں اور بے بسی کے ایک افسوں زدہ دائرے میں داخل ہو جاتے ہیں۔ قوم بہر حال جوں توں زندگی گزارتی رہتی ہے، جبکہ ان لوگوں کی زندگی بہتر سے بہتر ہوتی چلی جاتی ہے۔ کچھ عرصے تک یہ لوگ اطمینان کی زندگی گزارتے رہتے ہیں۔ ان کے بعد آنے والے ابھی وسیع میدانوں میں گھوم رہے ہیں، اونٹ چَرا رہے ہیں، بھیڑیں پال رہے ہیں، لیکن وہ بھی جوان ہو جائیں گے، شہر آئیں گے اور جدوجہد شروع کریں گے۔ اس مسلسل عمل کی بنیاد کس اصول پر ہے؟ اس اصول پر کہ شہر آنے والوں کے پاس عزم زیادہ مگر ہنر کم ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ ہر ہلچل کے بعد ملک ایک بار پھر ابتدا کے نقطے پر لوٹ جاتا ہے، کیوں کہ فاتح نئی نسل

کو وہی سب کچھ نئے سرے سے سیکھنا پڑتا ہے جسے سیکھنے میں پچھلی نسل کو اتنی مشقت کرنی پڑی تھی۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ شکست کھانے والوں میں زیادہ مہارت اور دانش موجود تھی؟ ہرگز نہیں ۔۔ پچھلی نسل بھی اُنھیں جڑوں سے پیدا ہوئی تھی جن سے یہ نئے آنے والے پیدا ہوے۔ بے بسی کے اِس افسوں زدہ دائرے کو کس طرح توڑا جا سکتا ہے؟ صرف دیہات کو ترقی دے کر۔ جب تک گاؤں پس ماندہ ہیں، ملک پس ماندہ رہے گا ۔۔ خواہ اس میں کارخانوں کی تعداد پانچ ہزار ہی کیوں نہ ہو۔ جب تک شہر منتقل ہونے والا بیٹا ہر کچھ سال بعد اپنے آبائی گاؤں کا یوں دورہ کرتا رہے گا جیسے وہ کوئی دور اُفتادہ اجنبی مقام ہو، اس وقت تک اس کی قوم جدید نہیں ہو سکے گی۔

o o o

جس وقت کمیٹیوں میں یہ بحث چل رہی تھی کہ اب کیا کیا جائے، تو ایک نکتے پر سب لوگوں کا اتفاق تھا: سب سے پہلے انتقام۔ سو موت کی سزاؤں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس عمل سے اُنھیں ایک طرح کی تسکین ملتی تھی۔ اخباروں کے پہلے صفحوں پر ان لوگوں کی تصویریں چھپتی تھیں جن کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوتی تھی اور ان نوجوان لڑکوں کی جن کی بندوقوں کا نشانہ ان لوگوں کی طرف ہوتا تھا۔ اخبار ان واقعات کو تفصیل سے بیان کرتے تھے۔ مارے جانے والے نے مرنے سے پہلے کیا کہا، کیسا طرزِ عمل اختیار کیا، اپنے آخری خط میں کیا لکھا۔ موت کی ان سزاؤں سے یورپ میں شدید ردِ عمل پیدا ہوا، لیکن یہاں کے اکثر لوگ یورپ والوں کے اعتراض کو سمجھنے سے قاصر تھے۔ ان کے لیے انتقام کا اصول تاریخ سے بھی قدیم تھا۔ ایک شاہ نے حکمرانی کی اور پھر اس کا سر قلم کیا گیا؛ دوسرا آیا اور ایک دن اُس کا بھی سر قلم کیا گیا۔ کسی شاہ سے نجات پانے کا اس کے سوا کیا طریقہ ہے؟ وہ استعفیٰ دے کر اپنے تخت سے دست بردار تو ہونے سے رہا۔ اسے اور اس کے حامیوں کو زندہ چھوڑ دیا جائے؟ وہ ہمارے سنبھلنے سے پہلے ایک فوج جمع کر لے گا اور واپس آ جائے گا۔ انھیں قید میں ڈال دیا جائے؟ وہ پہرے داروں کو رشوت دے کر نکل آئیں گے اور قتلِ عام شروع کر دیں گے۔ ایسی صورتِ حال میں سزاے موت خود مدافعتی کا ایک بے اختیار عمل ہے۔ یہ ایک ایسی دنیا ہے جہاں قانون کو انسان کے تحفظ کا آلہ نہیں بلکہ دشمن کو ختم کرنے کا ہتھیار سمجھا جاتا ہے۔ ہاں، یہ سننے میں بہت ظالمانہ بات معلوم ہوتی ہے؛ اس میں ایک ہولناک، تسکین سے عاری سفاکی موجود ہے۔ آیت اللہ خلخالی نے ہمیں، صحافیوں کے

ایک گروپ کو، بتایا کہ سابق وزیراعظم ہویدا کو سزائے موت سنانے کے بعد اسے اچانک سزا پر عمل درآمد کرنے والے فائرنگ اسکواڈ کی جانب سے شک نے گھیر لیا۔ اسے ڈر ہوا کہ وہ لوگ ہویدا کو چھوڑ دیں گے۔ اس لیے اس نے ہویدا کو اپنی گاڑی میں بٹھا لیا۔ رات کا وقت تھا اور، خلخالی کے کہنے کے مطابق، وہ گاڑی میں باتیں کرتے ہوئے گئے۔ کیا باتیں؟ یہ اس نے نہیں بتایا۔ کیا اسے اس بات کا خوف نہیں تھا کہ مجرم فرار ہو جائے گا؟ نہیں، یہ خیال اس کے ذہن میں نہیں آیا۔ وقت گزر رہا تھا۔ خلخالی ذہن پر زور دے کر کسی ایسے شخص کا نام سوچ رہا تھا جو رات بھر کے لیے ہویدا کو پہرے میں رکھ سکے۔ آخر اسے ایک کمیٹی کے کچھ ارکان کا خیال آیا جو بازار کے قریب رہتے تھے۔ وہ ہویدا کو ان کے گھر لے گیا اور رات بھر کے لیے وہیں چھوڑ آیا۔

میں ان لوگوں کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں، لیکن بار بار ایک تاریک خطّے میں داخل ہو کر بھٹک جاتا ہوں۔ یہ لوگ زندگی اور موت کے بارے میں ہم سے مختلف رویّہ رکھتے ہیں۔ خون کو دیکھ کر ان کا ردِ عمل ہم سے مختلف ہوتا ہے۔ خون پر نظر پڑتے ہی یہ شدید تناو اور سحرزدگی کی سی کیفیت میں آ جاتے ہیں، ایک صوفیانہ بے خودی ان پر طاری ہو جاتی ہے؛ میں ان کی پُرجوش حرکات دیکھ سکتا ہوں، ان کی اونچی آوازیں سن سکتا ہوں۔ ایک قریبی ریستوراں کا مالک نئی کار خرید کر میرے ہوٹل کے سامنے پہنچا۔ یہ ایک بالکل نئی پونٹیاک تھی، سنہری رنگ کی، اور سیدھی کاروں کی دکان سے لائی گئی تھی۔ غالباً کوئی رسم ادا کی جا رہی تھی اور مجھے نیچے احاطے میں مرغیاں ذبح کرنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ لوگوں نے ذبح کی ہوئی مرغیوں کا خون پہلے اپنے اوپر چھڑکا، اور پھر کار پر اس کی بوچھار کرنے لگے۔ کار کا رنگ لمحے بھر میں سرخ ہو گیا اور اس پر سے خون ٹپکنے لگا۔ یہ اس کار کی افتتاحی رسم تھی۔ جہاں کہیں خون پڑا ہوتا ہے، لوگ اس کے گرد بھیڑ لگا کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور اپنے ہاتھ تر کرنے لگتے ہیں۔ وہ مجھے سمجھا نہیں سکے کہ ایسا کرنا کیوں ضروری ہے۔

ہفتے میں ایک بار، کچھ گھنٹوں کے لیے ان میں بے پناہ نظم و ضبط پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ جمعے کے دن ہوتا ہے جب اجتماعی نماز ادا کی جاتی ہے۔ اُس روز کسی خالی میدان میں سب سے پہلا، پُرجوش مسلمان داخل ہوتا ہے اور ایک کونے میں اپنی جائے نماز بچھا کر بیٹھ جاتا

ہے۔ پھر ایک اَور شخص آ کر پہلے شخص کے برابر میں اپنی جاے نماز بچھا لیتا ہے، حالاں کہ پورا میدان خالی پڑا ہے۔ ایک ایک کر کے اَور لوگ آنے لگتے ہیں اور اپنی اپنی جاے نماز بچھا کر بیٹھتے جاتے ہیں۔ ہزاروں، اور پھر لاکھوں لوگ سیدھی، باضابطہ صفیں بنا کر خاموشی سے بیٹھ جاتے ہیں۔ ان کا رخ مکّے کی سمت ہوتا ہے۔ دوپہر کے وقت پیش امام نماز شروع کرتا ہے۔ وہ سب کھڑے ہو جاتے ہیں، رکوع، قیام اور سجدہ کرتے ہیں، بار بار جھکتے، کھڑے ہوتے اور سجدے میں جاتے ہیں۔ لاکھوں انسانوں کے جسموں کی یہ ہموار اور متواتر حرکات ایسا منظر پیش کرتی ہیں جسے بیان کرنا دشوار ہے، اور میرے لیے یہ منظر ہولناک، پیش گویانہ تاثر رکھتا ہے۔ البتہ نماز ختم ہونے پر صفیں بکھر جاتی ہیں، ہر شخص بولنے لگتا ہے اور ایک خوشگوار، سہل بے ترتیبی اُس تناو کو توڑ دیتی ہے۔

انقلابی کیمپ میں جلد ہی اختلافات پھوٹ پڑے۔ ہر ایک نے شاہ کی مخالفت کی تھی اور اسے ہٹا دینا چاہا تھا، لیکن ہر ایک نے مستقبل کا تصوّر جدا جدا طریقے سے کیا تھا۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ ان کے ملک میں ویسی ہی جمہوریت قائم ہو گی جیسی انھوں نے فرانس اور سوئٹزرلینڈ میں قیام کے دوران دیکھی تھی۔ لیکن شاہ کے جانے کے بعد انھیں لوگوں کو سب سے پہلے شکست کا منھ دیکھنا پڑا۔ یہ ذہین، بلکہ دانش مند، لوگ تھے مگر کم زور تھے۔ انھوں نے خود کو ایک پیراڈوکس کی سی صورتِ حال میں پایا۔ جمہوریت کو بزور نافذ نہیں کیا جا سکتا، اس کے لیے اکثریت کی رضامندی ضروری ہے، لیکن اکثریت خمینی کی ہم خیال تھی اور اسلامی جمہوریہ چاہتی تھی۔ لِبرل لوگوں کے منظر سے ہٹنے کے بعد اسلامی جمہوریہ کے حامی باقی رہ گئے۔ مگر پھر وہ بھی آپس میں لڑنے لگے۔ اس لڑائی میں رفتہ رفتہ قدامت پرستوں اور شدّت پسندوں کو روشن خیال اور معتدل لوگوں پر غلبہ حاصل ہوتا گیا۔ میں ان دونوں کیمپوں کے لوگوں کو جانتا تھا، اور جب بھی ان لوگوں کا تصوّر کرنے کی کوشش کرتا جن سے مجھے ہمدردی تھی تو مجھ پر مایوسی طاری ہو جاتی۔ روشن خیال لوگوں کا رہنما بنی صدر تھا۔ دبلا پتلا، قدرے آگے کو جھکا ہوا، ہمیشہ پولو شرٹ میں ملبوس، بنی صدر ادھراُدھر جاتا دکھائی دیتا، لوگوں کو قائل کرنے کی کوشش کرتا، گفتگو میں شامل ہو جاتا۔ اس کے ذہن میں ہزاروں خیالات تھے، وہ بہت باتیں کرتا تھا -- بہت زیادہ -- اور ہمیشہ نئے نئے حل سوچتا رہتا تھا۔ وہ کتابیں بھی لکھتا تھا جو پیچیدہ اور مبہم اسلوب میں ہوا کرتی تھیں۔ اِن ملکوں میں دانشور لوگ سیاست میں ہمیشہ

اجنبی رہتے ہیں۔ دانشوروں کے پاس ضرورت سے زیادہ تخیّل ہوتا ہے، وہ تذبذب کا شکار رہتے ہیں، تمام سمتوں میں ایک ساتھ چل پڑنے پر آمادہ ہوتے ہیں۔ ایسا رہنما کس کام کا جسے خود یہ یقین نہ ہو کہ کون سا راستا درست ہے؟ دوسری طرف شدّت پسند بہشتی کبھی ایسا طرزِ عمل اختیار نہیں کرتا تھا۔ وہ اپنے عملے کو طلب کرتا اور ہدایات جاری کرتا، اور وہ سب اس کے ممنون ہوتے کیوں کہ اس سے انھیں معلوم ہو جاتا کہ کیا کرنا ہے اور کیسے کرنا ہے۔ بہشتی کے ہاتھ میں شیعہ قیادت کی کمان تھی، بنی صدر کے ساتھ اس کے دوست اور پیروکار تھے۔ بنی صدر کی طاقت کی جڑیں دانشوروں، طالب علموں اور مجاہدوں میں تھیں۔ بہشتی کی طاقت اُس ہجوم میں تھی جو ملّاؤں کے حکم کا منتظر تھا۔ بنی صدر کی شکست صاف دکھائی دے رہی تھی۔ لیکن خود بہشتی کو بھی جلد ہی رحم دل اور خداترس قیادت کے سامنے ڈھیر ہو جانا تھا۔

چھاپامار دستے گلیوں میں نکل آئے۔ یہ نوجوان، مضبوط لوگ تھے جن کی پچھلی جیبوں میں سے چاقو جھانک رہے ہوتے تھے۔ وہ طالب علموں پر حملے کرنے لگے اور ایمبولینس گاڑیاں زخمی لڑکیوں کو یونیورسٹی سے اسپتال لے جانے لگیں۔ مظاہرے شروع ہو گئے، لوگوں کے ہجوم اپنی مٹھیاں ہوا میں بلند کر کے لہرانے لگے۔ مگر اب کس کے خلاف؟ اُسی شخص کے خلاف جو مشکل اور مبہم اسلوب میں کتابیں لکھتا تھا۔ لاکھوں لوگ بے روزگار تھے، گاؤں والے اب بھی کچے مکانوں اور جھونپڑیوں میں رہنے پر مجبور تھے، لیکن اس سے کیا فرق پڑتا تھا؟ بہشتی کے لوگ کہیں اَور مصروفِ کار تھے -- وہ انقلاب دشمنوں سے لڑ رہے تھے۔ ہاں، اب آخرکار انھیں معلوم ہو گیا تھا کہ کیا کرنا اور کیا کہنا چاہیے۔ تمھارے پاس کھانے کو روٹی نہیں ہے؟ رہنے کو گھر نہیں ہے؟ ہم بتاتے ہیں کہ یہ کس کا قصور ہے۔ یہ سب اسی انقلاب دشمن کا قصور ہے۔ اسے ختم کر دو تو تم لوگ انسانوں کی طرح رہ سکو گے۔ مگر یہ شخص کیوں کر انقلاب دشمن ہو گیا؟ کیا ابھی کل تک وہ اور ہم ساتھ ساتھ شاہ کے خلاف نہیں لڑ رہے تھے؟ وہ کل کی بات تھی، آج وہ تمھارا دشمن ہے۔ یہ سنتے ہی جوشیلے ہجوم نے حملہ شروع کر دیا، ایک لمحے کو یہ سوچے بغیر کہ کیا یہ دشمن واقعی ان کا دشمن ہے۔ مگر ہجوم میں شامل لوگوں کو قصوروار نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ انھیں ایک بہتر زندگی کی تمنا ہے، اور ان کی یہ تمنا بہت قدیم ہے، اور وہ نہیں جانتے، ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ مسلسل جدوجہد، قربانی اور

بے لوثی کے باوجود یہ بہتر زندگی ہمیشہ ان کی دسترس سے باہر کیوں نکل جاتی ہے۔

میرے دوستوں پر دل گرفتگی کا غلبہ تھا۔ وہ کسی بڑی آفت کو آتا دیکھ رہے تھے۔ ہمیشہ کی طرح، دشوار دنوں کے آتے ہی، ان ذہین لوگوں کا حوصلہ اور یقین ان کا ساتھ چھوڑتا جا رہا تھا۔ وہ خوف اور مایوسی کے نرغے میں تھے۔ یہ لوگ، جو کبھی کسی قیمت پر جلوس میں شرکت سے باز نہ رہتے تھے، ہجوموں سے خوف کھانے لگے تھے۔ ان سے باتیں کرتے ہوئے مجھے شاہ کا خیال آیا۔ شاہ دنیا بھر میں بھٹکتا پھر رہا تھا اور کچھ کچھ دن بعد اس کا چہرہ اخباروں میں دکھائی دیتا تھا، ہر بار پہلے سے زیادہ خستہ حال۔ وہ آخر تک سوچتا رہا کہ اپنے ملک واپس جائے گا۔ وہ کبھی نہ لوٹ سکا، لیکن اس کا کیا دھرا اس کے ملک میں باقی رہا۔ آمر چلا جاتا ہے، لیکن اس کے جانے سے آمریت ختم نہیں ہو جاتی۔ آمریت کی بنیاد لوگوں کی جہالت پر استوار ہوتی ہے؛ یہی وجہ ہے کہ تمام آمر اس جہالت کو قائم رکھنے کی اتنی سخت کوشش کرتے ہیں۔ اس حالت کے بدلنے، روشنی کی کرن کے اندر آنے کے لیے کئی نسلوں کا وقت درکار ہوتا ہے۔ جب تک ایسا نہ ہو، اس وقت تک آمر کو معزول کرنے والے اکثر، اپنے ارادوں کے برعکس، اُس کے وارثوں کی طرح عمل کرتے رہتے ہیں، اُسی دور کے مخصوص رویّوں اور نمونوں کو قائم رکھتے ہیں جسے ختم کرنے کے لیے انھوں نے خود جدوجہد کی تھی۔ یہ عمل اس قدر غیر ارادی طور پر اور شعور میں آئے بغیر پیش آتا ہے کہ اگر کوئی شخص اس کی طرف اشارہ کر دے تو ان کے غم و غصّے کا ہدف بن جاتا ہے۔ لیکن کیا ان سب باتوں کا قصوروار شاہ کو قرار دیا جا سکتا ہے؟ شاہ کو ورثے میں ایک روایت ملی تھی، اس نے رسم و رواج کی اُنھیں حدوں میں رہ کر عمل کیا جو صدیوں سے چلے آ رہے تھے۔ ان حدوں کو توڑنا، اپنے ماضی کو تبدیل کرنا دنیا کے دشوار ترین کاموں میں سے ہے۔

o o o

جب کبھی مجھے اپنا دل بہلانے کی خواہش ہوتی ہے، میں خیابانِ فردوسی پر چلا جاتا ہوں جہاں آقائے فردوسی کی قالینوں کی دکان ہے۔ آقائے فردوسی جس کی تمام زندگی ہنر اور حسن کی اسی مانوس سرگرمی میں گزری ہے، اپنے اردگرد کی حقیقت کو یوں دیکھتا ہے گویا یہ کسی سستے، غلیظ سنیما میں دکھائی جانے والی کوئی گھٹیا فلم ہے۔ یہ سب ذوق کا معاملہ ہے، وہ مجھ سے کہتا ہے: آقا، اصل بات ہے باذوق ہونا۔ اگر کچھ زیادہ انسانوں کا ذوق کچھ زیادہ ترقی یافتہ

ہوتا تو یہ دنیا اَور طرح کی ہوتی۔ جھوٹ، فریب، چوری، مخبری، ان سب ہولناکیوں میں (وہ ان سب کے لیے یہی لفظ استعمال کرتا ہے) اسے ایک ہی چیز مشترک دکھائی دیتی ہے -- یہ سب کام وہ لوگ کرتے ہیں جو ذوق سے محروم ہوں۔ اسے یقین ہے کہ اس کی قوم ہر چیز کو سہار لے گی اور یہ کہ حسن کو ختم نہیں کیا جا سکے گا۔ یاد رکھیے، وہ ایک اَور قالین کھولتے ہوے مجھ سے کہتا ہے (اسے معلوم ہے کہ میں قالین نہیں خریدوں گا لیکن وہ چاہتا ہے کہ میں کم سے کم اسے دیکھ کر لطف اندوز ہو سکوں)، کہ جس چیز نے فارس کے لوگوں کو پچھلے ڈھائی ہزار سال سے اپنے رنگ پر قائم رکھا ہے، جس چیز کی بدولت، تمام جنگوں، بیرونی حملہ آوروں اور فاتحوں کے باوجود ہم اپنا آپ رہ سکے ہیں، وہ ہماری مادّی نہیں بلکہ روحانی قوّت ہے -- ہماری شاعری، نہ کہ ٹیکنولوجی؛ ہمارا مذہب نہ کہ کارخانے۔ ہم نے دنیا کو کیا دیا ہے؟ شاعری، بیناتُور اور قالین۔ آپ دیکھ سکتے ہیں کہ یہ سب پیداواری نقطۂ نظر سے بے مصرف چیزیں ہیں۔ لیکن ایسی ہی چیزوں کے ذریعے سے ہم اپنے اصل وجود کا اظہار کرتے ہیں۔ ہم نے دنیا کو یہ تحیّر خیز، منفرد بے مصرفیت دی ہے۔ ہم نے دنیا کو جو کچھ دیا اس سے زندگی کم دشوار نہیں ہو گئی، بس تھوڑی سی آراستہ ہو گئی ہے -- اگر اس فرق کے کچھ معنی نکلتے ہوں۔ ہمارے لیے، مثال کے طور پر، قالین بنیادی ضرورت کی چیز ہے۔ ہم قالین کو کسی صحرائی، تپتی ہوئی زمین پر بچھا کر اس پر لیٹ جاتے ہیں، ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ہم کسی سبزہ زار پر لیٹے ہوے ہیں۔ ہاں، ہمارے قالین ہمیں پھولوں سے بھرے سبزہ زاروں کی یاد دلاتے ہیں۔ اپنی آنکھوں کے سامنے آپ کو باغ، تالاب، اور فوارہ دکھائی دینے لگتا ہے۔ جھاڑیوں کے درمیان مور چل پھر رہے ہیں۔ اور پھر قالین ایک پائیدار چیز ہے -- کسی عمدہ قالین کے رنگ صدیوں تک پھیکے نہیں پڑتے۔ اس طرح، ایک ویران، تھکا دینے والے ریگستان میں رہتے ہوے، ہم خود کو ایک ایسے ابدی گلستان میں پاتے ہیں جہاں سے رنگ اور تازگی کبھی رخصت نہیں ہوتی۔ پھر باغ کی خوشبو، چشمے کی مدھم آواز اور پرندوں کے گیت ہمارے تصوّر میں باقی رہتے ہیں۔ تب ہم خود کو مکمّل پاتے ہیں، ممتاز محسوس کرتے ہیں، جنّت کے آس پاس دیکھتے ہیں، اور شاعر ہو جاتے ہیں۔

آج

سرما ۱۹۹۴

منتخب فارسی کہانیوں پر مشتمل خصوصی شمارہ ہو گا

ضمیر نیازی

کی معروف اور اہم تصنیف

The Press in Chains

کا اردو ترجمہ

صحافت پابند سلاسل

دسمبر ۱۹۹۳ میں شائع ہو رہا ہے

محمد عمر میمن

گم شُدہ خطوط

اور دیگر تراجم

میلان کنڈیرا، سولژے نِتسِن،
امین مالوف، لیلیٰ بعلبکّی،
جولین بارنز
اور دیگر منفرد ادیبوں کی افسانوی تحریروں کے ترجمے

جنوری ۱۹۹۴

آج کی کتابیں

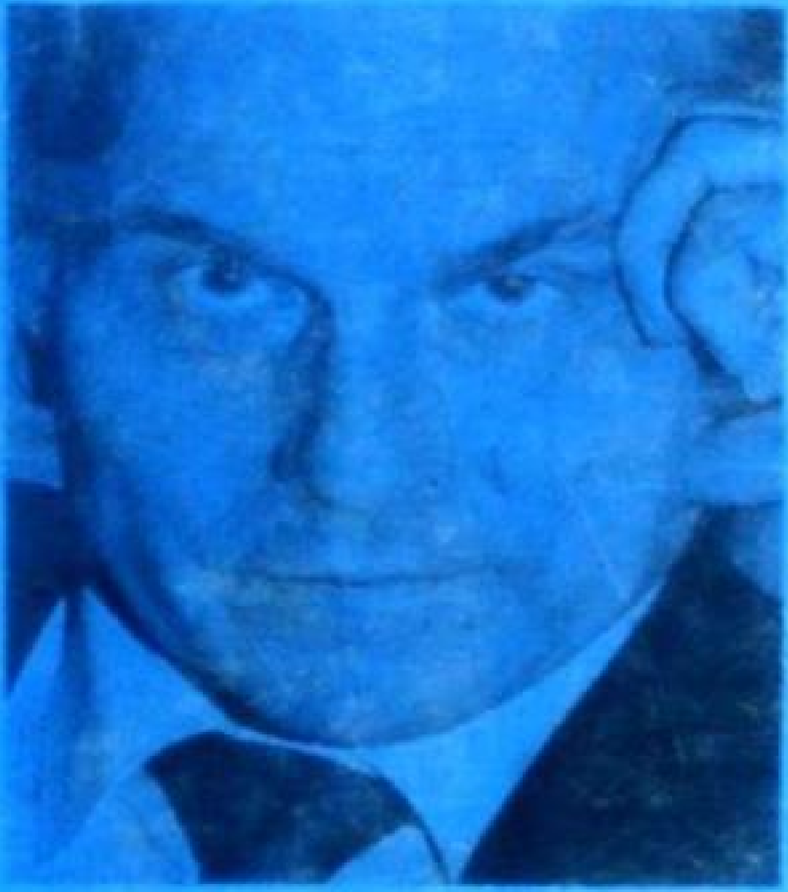

ریشارد کاپوشنکی

قیمت : پچھتر روپے

سالانہ خری
چار شماروں کی قیمت : دو سو

تقسیم کار
مکتبۂ دانیال صدر کراچی
ٹامس اینڈ ٹامس بک سیلرز صدر کراچی
کلاسیک شاہراہِ قائداعظم لاہور
پاکستان بکس اینڈ لٹریری ساؤنڈز لوئر مال لاہور